تذکرہ شاہ ولی اللہ

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

یونائٹیڈ ویلیفر ایسوسی ایشن استھانواں نالندہ

تذکرہ شاہ ولی اللہ

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

ناشر

یونائیٹڈ ویلفیر ایسوسی ایشن

استھانواں، نالندہ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

۱۴۳۶ھ مطابق ۲۰۱۵ء

نام کتاب	:	تذکرہ شاہ ولی اللہ
مصنف	:	حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
تعدادِ اشاعت	:	۱۰۰۰
کمپوزنگ	:	محمد قطب الدین 9795373975
باہتمام	:	محمد ضیاء الحق شرفی
صفحات	:	
ناشر	:	یونائیٹڈ ویلفیر ایسوسی ایشن استھانواں، نالندہ
قیمت	:	۱۵۰

[redacted]

۱۔ مکتبہ الدارین (لکھنؤ)

۲۔ کتب خانہ رحیمیہ (دیوبند)

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	عرض ناشر	۹
۲	مقدمہ	۱۶
۳	تقریب	۲۹
۴	ہر چڑھاؤ کے بعد اتار	۳۴
۵	الف ثانیؒ کے تجدیدی کارنامے کی انتہا	۳۵
۶	فتاویٰ عالمگیری کی تدوین وتالیف میں عالمگیرؒ کی شرکت	۳۶
۷	عالمگیری کارناموں میں مجددی اشارات کا دخل	۳۸
۸	عروج کے بعد نزول	۳۹
۹	شاہ عبدالعزیزؒ کے خونی آنسو یا نالہ ہائے نیم شبی	۴۰
۱۰	دلّی کے خونی فتنے اور شاہ ولی اللہؒ کی استقامت	۴۲
۱۱	عالمگیرؒ کے بعد فتنوں کا آغاز	۴۶
۱۲	سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک	۴۶
۱۳	پنجاب کی جدید تحریک خاکسار اور قدیم سکھ تحریک میں وجوہ مماثلت	۴۹
۱۵	سکھ تحریک کی سیاسی کروٹ اور اس کے فروغ کے اسباب	۵۰
۱۶	گرو گوبند کے زیر قیادت سکھوں کی چیرہ دستیاں اور لرزہ خیز مظالم	۵۱

۱۷	ایک ہندو مصنف کی شہادت	۵۲
۱۸	زندہ جانوروں کے ہولے	۵۲
۱۹	انسانوں کے ہولے	۵۳
۲۰	سکھوں کا جذبۂ قربانی	۵۳
۲۱	باطل کے لئے مرجانے اور حق پر جان دینے کا فرق	۵۴
۲۲	سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک کا ایک خاص فرق	۵۷
۲۳	ہندوؤں کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں کا رخ اور ان کا مقصد	۵۹
۲۴	کیا ہندوستان کی تقسیم سے ہمارے مرض کا علاج ہوسکتا ہے	۶۰
۲۵	مرہٹہ گردی	۶۱
۲۶	دلی پر مرہٹوں کی تاخت اور دوسری اسلامی بستیوں کی بربادی	۶۱
۲۷	عید قربان کے دن مسلمانوں کی قربانیاں	۶۲
۲۸	حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک تاریخی خواب	۶۲
	شاہ صاحب کے اس خواب کی تعبیر، پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ	۶۵
	خواب اور بیداری کے واقعات کا انطباق	۶۵
	لال قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ	۶۶
	تنگ ظرف مرہٹوں کی لوٹ مار کی ذلیل نوعیت	۶۸
	شاہ صاحب کے خواب کا دوسرا جز اور ہندوستان پر غازی احمد شاہ ابدالی کا حملہ اور مرہٹہ کی شکست	۷۱
	شاہ ابدالی کا بے نظیر ایثار اور اس کا راز	۷۷
	نقمت اور نعمت کے بعد بھی مسلمانوں کی غفلت اور خدا فراموشی	۷۸
	شاہ ولی اللہ کی چیخ و پکار اور خطرہ کا مسلسل الارم	۷۹
	مسلمانوں کے مختلف طبقات کو شاہ صاحب کا پیغام اور مفصل پروگرام	۷۹
	سلاطین اسلام سے خطاب	۸۰
	امراء وارکان دولت سے خطاب	۸۱

	فوجی سپاہیوں سے خطاب	۸۱
	اہل صنعت وحرفت سے خطاب	۸۲
	مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب	۸۳
	طلبہ علم سے خطاب	۸۴
	دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظوں اور کنج نشین زاہدوں سے خطاب	۸۵
	عام امت مسلمہ سے جامع خطاب امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز	۸۶
	ہندی مسلمانوں کا جمود یا مرنے کا تہیہ	۸۹
	قدرتی قانون کے مطابق اس خواب غفلت کی سزا اور انگریزی اقتدار کا آغاز	۹۰
	سراج الدولہ کی فوج پر کارتوسی بندوقوں کے ساتھ لارڈ کلایو کا پہلا شبخون حملہ	۹۰
	سراج الدولہ کے لشکر میں ابتری اور قیامت کا نمونہ	۹۰
	میر جعفر کی غداری اور جنگ پلاسی میں انگریزوں کی فتح	۹۱
	سراج الدولہ کا لرزہ خیز قتل	۹۱
	اپنے پایہ تخت مرشد آباد کے بازاروں میں سراج الدولہ کی لاش	۹۲
	بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی، کمپنی بہادر کے نام	۹۲
	فرنگی ٹھیکہ داروں کی نزاکت دماغی، شاہی نقارہ کی آواز سے سر میں درد	۹۳
	آخر میں شاہ ولی اللہ کی دردناک وصیت	۹۴
	شاہ صاحبؒ نے ہندوستان کو بالکل خیر باد کہہ کر حجاز میں اقامت کیوں نہیں کرلی	۹۶
	شاہ صاحبؒ کی ایک محیر العقول توقع	۹۷
	شاہ صاحبؒ اور نظریۂ وطنیت	۹۸
	حجازی تہذیب اور مسلمان	۹۹
	اہل عجم کے فیشن اختیار کرنے والوں سے شاہ صاحبؒ کی بیزاری	۱۰۱
	پھر شاہ صاحب نے ہندوستان کو کیوں نہیں چھوڑا؟	۱۰۲
	درحقیقت کشمکشِ حیات سے کسی طرح پیچھا چھوٹ نہیں سکتا	۱۰۲

	ہندوستان میں قیام اور مستقبل کا کام	۱۰۴
	شاہ صاحبؒ کے زمانہ کے علماء ومشائخ کی کمزوریاں	۱۰۶
	فقیہوں کے بے راہ روی اور بے بصری	۱۰۷
	صوفیوں کی افسوسناک حالت	۱۰۹
	''نمود وانمود'' کا فتنہ	۱۱۰
	نجوم کے شعبدے اور کہانت کے کرشمے	۱۱۴
	ام الفتن یعنی خانہ جنگی	۱۱۷
	سادات بارہ کا فتنہ	۱۲۰
	اس فتنہ کی اصل جڑ شیعہ سنی اختلاف تھا	۱۲۰
	ہندوستان میں شیعیت کے قدم	۱۲۱
	اسلامی عقائد کے متعلق ایک عام غلط فہمی	۱۲۲
	شہزادہ فرخ سیر کا بیدردانہ قتل	۱۲۴
	شاہ عبدالرحیمؒ کا ایک عجیب خواب	۱۲۴
	رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کی تخت نشینی اور ان کے بعد محمد شاہ کا دور دورہ	۱۲۶
	محمد شاہ نے شاہ ولی اللہ کے درس حدیث کے لئے عالی شان مکان دیا	۱۲۹
	ولی اللّٰہی دار العلوم کی عمارت غدر میں بربادی ہوئی	۱۳۰
	حافظ رحمت خاں والی بریلی اور نجیب الدولہ کی خدمتِ علم دین	۱۳۲
	شاہ صاحب کے اصل کام کا آغاز اور دلّی پر خونی نادر کی یلغار	۱۳۳
	سیاسی شکست کا لازمہ دماغی غلامی	۱۳۴
	نادری حملہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی مرعوبیت کا حال شاہ صاحب کی زبانی	۱۳۵
	ہندوستان کے علماء پر منطق وفلسفہ کے تسلط کی تاریخ	۱۳۶
	میر باقر داماد کا کچھ تعارف	۱۳۶
	میر باقر کے ایک شاگرد ''صدر شیرازی''	۱۴۰

میرزاہد ہروی اور علم فقہ میں ان کی کمزوری	۱۴۰
معقولات میں مرزا صاحب کا غلو	۱۴۰
نادری حملے کے بعد یہاں کے علماء پر ایرانی علوم ونظریات سے بری طرح متاثر ہوئے	۱۴۱
نادر شاہ کا بے پناہ رعب	۱۴۲
شاہجہاں کی پوتی، نادر شاہ کے لڑکے کے نکاح میں	۱۴۲
نادر شاہ کے طفیل میں ہندوستان میں روہیلہ پٹھانوں کا سیلاب	۱۴۳
یہاں تک کے تاریخی مباحث کا مقصد اور حاصل	۱۵۷
فتنوں کے اس دور میں شاہ ولی اللہؒ کی آمد	۱۵۸
شاہ صاحبؒ کے والد شاہ عبدالرحیم کی شخصیت	۱۶۰
شاہ ولی اللہ کی ولادت سے پہلے شاہ عبدالرحیم کو ان کے کمالات کی بشارت	۱۶۵
کل ۶۱ رسال کی عمر میں شاہ صاحب کا محیر العقول کام	۱۶۶
شاہ صاحب کے دادا کی تاریخی شجاعت	۱۶۸
خلافتِ ظاہرہ اور خلافتِ باطنہ	۱۷۱
سیاست اور اسلام کا واقعی تعلق، شاہ صاحب کی نظر میں	۱۷۶
اس باب کی ایک اور غلطی پر انتباہ	۱۷۸
شاہ صاحبؒ کی جامعیت	۱۷۹
شاہ عبدالرحیم کی جامعیت	۱۸۰
شاہ عبدالعزیزؒ کی جامعیت	۱۸۰
شاہ صاحبؒ کی امتیازی شان اور آپ کے خاص کارنامے	۱۸۲
فقہی اختلاف میں نقطۂ عدل	۱۸۳
صوفیائے عصر اور تصوف کی اصلاح	۱۸۷
شیعہ سنی نزاع کے متعلق شاہ صاحب کا کام	۱۸۸
یونانی فلسفہ کے بجائے ایمانی فلسفہ	۱۸۹

مغربی الحاد کے زہر کا تریاق اور امروزہ شبہات کا پیشگی جواب	۱۸۹
قرآن وحدیث کے تراجم کی بنیاد	۱۹۱
شاہ صاحبؒ کے اس شش جہتی کارناموں پر اجمالی نظر	۱۹۵
شاہ صاحبؒ کے طرز انشاء میں زبان نبوت کی جھلک	۱۹۷
شاہ صاحبؒ کے سارے کام کی کل مدت	۱۹۸
شاہ صاحبؒ کی عمر کے بارے میں اختلاف	۲۰۰
شاہ صاحبؒ کی ان محیر العقول خدمات کا اصل راز	۲۰۴
شاہ صاحب کے اس خواب کی تشریح اور تعبیر	۲۰۵
شاہ صاحب کی زندگی پر حضرات حسنینؓ کی زندگیوں کا انطباق	۲۰۶
شاہ صاحبؒ کے خاندان پر کربلائی مصائب	۲۰۸
شاہ صاحبؒ کے تجدیدی کارناموں میں فیض روح القدس کا دخل	۲۱۱
سفر حجاز کے بعد شاہ صاحب کی زندگی کا خاص دور	۲۱۳
ولی اللٰہی فیوض کی وسعت اور نوعیت	۲۱۵
ایک یمنی محدث کی شہادت، علامہ رشید رضا مصری کا بیان	۲۱۵
متن قرآن کے درس کے متعلق شاہ صاحب کی ہدایت	۲۱۹
شاہ صاحبؒ کے باقیات صالحات	۲۲۱
وفات سے پہلے چاروں صاحبزادوں کی خلافت	۲۲۱
چاروں صاحبزادوں کے باہمی تعلقات	۲۲۲
چاروں صاحبزادوں کی وفات میں عکسی ترتیب	۲۲۳
شاہ ولی اللہ کے مدرسہ کا حال اور غدر میں اس کی بربادی	۲۲۴
ولی اللٰہی دار العلوم پر مدرسہ رائے بہادر لالہ کشن داس کا تختہ	۲۲۶
شاہ عبدالقادر کی سکونت گاہ اکبری مسجد	۲۲۶
کتابیات مصنف	۲۲۸

عرض ناشر

تذکرہ شاہ ولی اللہ کی جدید اشاعت قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے، جس میں کتاب کی تصحیح کے ساتھ اسے کتابت وطباعت کے موجودہ مذاق ومعیار سے پوری طرح آراستہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے مدیر ماہنامہ الفرقان لکھنؤ حضرت مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی درخواست پر رسالۂ مذکور کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لئے ایک مبسوط مقالہ تحریر فرمایا تھا، جو اس خصوصی شمارہ میں:

"آغوش موج کا ایک درتابندہ یا اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا ایک وفادار بندہ"

کے عنوان سے شائع ہوا اور نگاہ شوق سے پڑھا گیا، اس کی اہمیت کی بنا پر ادارہ الفرقان نے بعد میں اس کے نسخے شائع کئے، اس کے بعد چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری صاحب مالک نفیس اکیڈمی حیدرآباد کی درخواست پر ان کی اکیڈمی سے مصنف کی جزوی ترمیم وتصحیح، مقدمہ اور بعض عناوین کے اضافہ کے بعد کتابی شکل میں "تذکرہ شاہ ولی اللہ" کے نام سے شائع ہوا، تقسیم ملک کے بعد جب نفیس اکیڈمی حیدرآباد سے کراچی منتقل ہوئی تو وہاں بھی اس کی (غالباً عکسی) اشاعت منظر عام پر آئی۔

جہاں تک کتاب کے مشمولات کا تعلق ہے اس کے متعلق چند الفاظ ناکافی ہیں۔ حضرت مصنف نے مقدمہ اور تقریب میں اس کے متعلق کچھ معلومات فراہم کی ہیں۔ یہاں اس کتاب کے متعلق دو اہل علم کے تبصروں کا نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کے ذریعہ

قارئین کسی قدر اس کی اہمیت کا اندازہ کرسکیں گے۔

مدیر الفرقان مولانا منظور نعمانیؒ نے اپنے ادارتی مضمون میں مقالہ کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرمایا تھا: "دوسرا مقالہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ کا ہے، ناظرین الفرقان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بالخصوص مقبولین بارگاہ الٰہی کی سیرت نگاری میں مولانا ممدوح ایک نرالے طرز نگارش کے مالک بلکہ موجد ہیں، خود مولانا ہی کی اصطلاح میں اگر یہ کہا جائے کہ اس خاص موضوع پر جب وہ لکھتے ہیں تو دماغ سے نہیں دل سے لکھتے ہیں، اور صفحۂ قرطاس پر اپنے دماغی افکار کو نہیں بلکہ قلبی کیفیات وواردات کو ثبت کرتے چلے جاتے ہیں، تو یہ تعبیر ان شاء اللہ حقیقت سے بہت قریب ہوگی، یہ مقالہ بھی مولانا کا اسی قبیل کا ہے، اس میں آپ نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی ماحول اور اس عہد کے انقلابی وقائع کو کافی تفصیل سے لکھنے کے بعد آپ کے کام کو عصر حاضر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے تاکہ وہ عمل کے انتخاب اور پھر عملی سرگرمیوں میں اس سے روشنی حاصل کرسکیں گے"۔

مصنف کے خورد وہم وطن نامور صاحب قلم جناب سید صباح الدین عبد الرحمنؒ صاحب نے اپنی تصنیف "بزم رفتگاں" میں مولانا گیلانی کے تذکرہ میں اس کتاب کے متعلق حسب ذیل سطریں تحریر کی ہیں: "کچھ عرصہ کے بعد ان کا طویل مضون حضرت شاہ ولی اللہ پر "الفرقان" کے ولی اللہ نمبر میں شائع ہوا، اس کو پڑھ کر ایک بار پھر تاریخ ہند پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوا، اس میں انہوں نے مؤرخانہ بصیرت کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد میں کس طرح اسلام پر تاریک بادل چھایا ہوا تھا، ہندوستان کے شمالی علاقہ میں سکھوں کی قوت ابھر رہی تھی، جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت کا سیلاب بڑھتا جارہا تھا، خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے یوروپین ممالک کی طاقتیں ہندوستان پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہی تھیں، اور خود مسلمانوں کے اندر ایرانیوں، تورانیوں اور روہیلوں کے باہمی تصادم سے اسلامی حکومت کی قبا تار تار ہورہی تھی، بعض صوفیہ کے غلط تصوف اور فقہاء کے غلط تفقہ سے امت کے شیرازہ

میں انتشار پھیلا ہوا تھا، خود ہندوستانی علماء کا طبقہ قرآن وحدیث کی اصل تعلیم، اصول فقہ اور عقائد وکلام سے ہٹ کر لا طائل ذہنی اور لفظی مباحث میں الجھا ہوا تھا، اس تجزیہ میں بھی مولانا کی غیر معمولی مؤرخانہ ذہانت وذکاوت کا رنگ نمایاں تھا، اور بعض موقعوں پر اس لئے بھی حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسے اہل قلم کی نگاہ جس کی تعلیم صرف عربی مدارس تک محدود رہی کیسے ان باریک گوشوں تک پہونچی''۔

حضرت مصنف نے اس میں اپنی دیگر تصانیف کی طرح اپنے دور کے افکار ونظریات پر جابجا تنقید بھی فرمائی ہے، اور حضرت شاہ صاحب کے اقوال وکردار کی روشنی میں صحیح راہِ عمل کی توضیح بھی، اور یہی ان کی تصانیف کا امتیاز ہے، ان کے بقول ''سلف کے حالات سننے یا سنانے کا مقصد صرف سننا یا سنانا نہ ہونا چاہئے، ماضی سے مستقبل کی زندگی میں اگر کوئی مدد مل سکتی ہے تو پھر یہ کام کی بات ہے، ورنہ بجز ایک دلچسپ داستان کے وہ اور کیا ہے''۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد حضرت شاہ صاحب پر قلم اٹھانے والوں نے اسے اپنے پیش نظر رکھا ہے، اور اگر چہ بعد میں حضرت شاہ صاحب کے افکار ونظریات پر بہت سی کتابیں آئیں، لیکن اب بھی اس وسیع ذخیرہ میں اس کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مصنف علیہ الرحمہ حضرت شاہ صاحب کے سیاسی نظریات نیز ان کے اہم کارناموں پر مزید تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ دست اجل نے انہیں اس کی مہلت نہ دی، مصنف علیہ الرحمہ نے بربنائے قیاس اپنی جن آراء کا اظہار کیا تھا حضرت شاہ صاحب کے خطوط اور دیگر تحریروں کی اشاعت کے بعد اب وہ اظہر من الشمس ہوچکی ہیں، خصوصاً ''حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' مرتبہ خلیق احمد نظامی سے ان کی حرف بہ حرف تصدیق ہوتی ہے، البتہ امیر الروایات کے حوالہ سے مصنف نے شاہ صاحب اور ان کے خاندان پر نجف خاں کے جن کربلائی مصائب کا ذکر کیا ہے اگر چہ وہ پوری طرح قابل اعتبار نہیں لیکن تاریخ مآخذ میں ان کے متعلق کچھ اشارات ضرور ملتے ہیں اس لئے ان کا قطعی انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس کتاب میں دہلی کے واقعات کے ذکر میں مصنف کا سب سے بڑا ماخذ غلام حسین طباطبائی کی تاریخ کی مشہور کتاب سیر المتاخرین ہے، غلام حسین کا تعلق مصنف کے وطن کے قریب ہی شیعوں کی ایک قدیم بستی حسین آباد ضلع شیخوپورہ سے تھا، اس کے بعد علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی متعدد تاریخی تصانیف ان کے پیش نظر رہی ہیں، حضرت شاہ صاحب کے حالات وواقعات خود ان کی کتابوں اور حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے ملفوظات کے علاوہ محسن بن یحییٰ ترہٹی کی مشہور عربی کتاب الیانع الجنی سے اخذ کئے ہیں۔

اب پیش نظر اشاعت کے متعلق چند باتیں قارئین کے عرض خدمت ہیں۔

چند سال قبل ایک مکتبہ سے نئی کتابت کے ساتھ یہ کتاب شائع ہوئی تھی جس میں کثرت اغلاط نے اس کی صورت وحقیقت دونوں مسخ کردی تھی، خصوصاً عربی اور فارسی کے طویل اقتباسات کتابت کے اغلاط سے اس قدر مملوء تھے کہ اصل مطلب تک رسائی اور اس کا ادراک نہایت ہی دشوار معلوم ہورہا تھا۔

حضرت مصنف کی تصانیف کی علمی خدمت کے لئے جیسی وسعت نظر کی ضرورت ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں، افسوس کہ اس کی وجہ سے اکثر علمی کتابیں جدید اشاعت میں غلطیوں سے مملوء نظر آتی ہیں۔

کسی علمی تصحیح کا کام بڑا نازک بھی ہے اور اہم بھی، جو اہل علم کی نظر میں کسی کتاب کی تصنیف سے کم اہمیت نہیں رکھتا، اسی لئے بلند پایہ علمی کتابوں کی تصحیح کی خدمت انجام دینے والے کثیر التعداد علماء کرام نے بجائے تصنیفی خدمات کے اسلاف کی قدیم کتابوں کی تصحیح واشاعت پر اپنی پوری توجہ مبذول کی، یہی وجہ ہے کہ ان کی اس خدمت کو تاریخ وتذکرہ میں اہمیت کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

پیش نظر اشاعت میں کتاب کی تصحیح پر پوری توجہ صرف کی گئی ہے، اور اپنی بساط بھر اس میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں ہوئی ہے، خصوصاً عربی اور فارسی اقتباسات اور عبارتوں کی تصحیح میں

بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے، اور پوری کتاب کا الفرقان کی اشاعت سے مقابلہ کیا گیا۔

قدیم کتابوں کی جدید اشاعت میں فارسی سے عمومی عدم واقفیت کی بنا پر کثرت سے اغلاط نظر آتے ہیں، اس لئے حضرت مصنفؒ نے فارسی کے جو لمبے لمبے اقتباسات نقل کئے ہیں اس کی تصحیح بڑے اہتمام سے کی گئی ہے، فارسی عبارت کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت مصنف کے دور میں اس کے عام مذاق کی بنا پر انہوں نے اپنی متعدد کتابوں میں اس کے الفاظ کو اردو الفاظ کے ساتھ بغیر ترجمہ کے ملا کر لکھا ہے، اب جبکہ گردش ایام نے فارسی کی بساط لپیٹ دی ہے اسے یونہی چھوڑ دینا قارئین کے لئے پریشان کن بھی ہوتا اور اس اہم کتاب سے کما حقہ استفادہ میں مانع بھی، اس لئے جہاں متن میں فارسی عبارتوں کا ترجمہ درج نہیں تھا وہاں حاشیہ میں اس کا ترجمہ درج کیا گیا ہے، اور حواشی میں اکثر عبارتیں مصنف نے بغیر ترجمہ کے درج کی تھیں اس لئے ان کے ساتھ ہی واوین کے درمیان ترجمہ بھی تحریر کردیا گیا ہے، البتہ فارسی اشعار کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے، جہاں کہیں اندازہ ہوا کہ مصنف سے کوئی لفظ سہواً چھوٹ گیا ہے اور عبارت نامکمل نظر آئی وہاں اس لفظ کا اضافہ کردیا گیا ہے، نیز بعض مشکل الفاظ کی توضیح بھی کی گئی ہے، کہیں کہیں ضرورت کے پیش نظر بعض حواشی بھی تحریر کئے گئے، اکثر جگہوں پر اپنے اضافوں کو [ ] کی علامت سے نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مدیر الفرقان مولانا منظور نعمانی علیہ الرحمۃ نے الفرقان کی اشاعت میں جابجا اپنے حواشی تحریر کئے تھے، مصنف نے ان میں اکثر کتابی اشاعت میں باقی رکھے، ہم نے ان حواشی کے اخیر میں ''نعمانی غفرلہ'' کی جگہ ''مولانا منظور نعمانی'' لکھ دیا ہے۔

مصنف نے اس کتاب کی اشاعت کے لئے الگ سے ایک مقدمہ تحریر فرمایا تھا، لیکن تقریب کے عنوان سے الفرقان کی اشاعت میں جو تمہید تھی وہ اس میں شامل نہیں کی گئی، جبکہ مقدمہ کے بجائے اسی میں مصنف نے کتاب کے متعلق اپنی توضیحات پیش کی ہیں، اور اس کے متعلق ضروری معلومات درج کی ہیں، اس لئے اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے بھی شامل کتاب

کیا گیا ہے۔

ارادہ تھا کہ اس کتاب کے حوالجات عصری اصولوں کے مطابق مرتب کئے جائیں نیز اس کا ایک جامع اشاریہ تیار کیا جائے لیکن اشاعت میں تاخیر در تاخیر نے اس کی تکمیل کا موقعہ نہ دیا، ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن کو مزید بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی، البتہ اخیر میں مصنف کے ماخذ کی فہرست درج کی جارہی ہے۔

اس کتاب میں عناوین جس کثرت سے نظر آتے ہیں وہ الفرقان کی اشاعت میں چند کے علاوہ موجود نہیں، بعد میں کتاب کی اشاعت کے وقت لگائے گئے ہیں، یہ معلوم نہیں کہ آیا خود مصنف نے کتاب کی اشاعت سے قبل یہ عناوین تحریر فرمائے یا ان کی بعض دوسری تصانیف کی اس کتاب میں بھی یہ خدمت ان کے کسی شاگرد نے انجام دی ہے، مولانا کی تحریروں میں جو تسلسل اور روانی نظر آتی ہے اس کے پیش نظر اس قدر طویل طویل عناوین کی کثرت قارئین کے مطالعہ میں شاید خلل انداز ہوتی ہو، علاوہ ازیں یہ بات عصر حاضر کے تصنیفی ذوق کے خلاف بھی معلوم ہوتی ہے، لیکن مولانا کے یہاں مضامین کے تنوع کے پیش نظر اور ایک سلسلہ گفتگو میں دوسرے ضمنی عناوین کے زیر بحث آجانے کی وجہ سے ہر موضوع کے لئے ایک نیا عنوان ضروری بھی معلوم ہوتا ہے تاکہ ضمنی اور جزوی بحثوں سے بھی قارئین اور محققین فائدہ اٹھا سکیں، اس لئے مولانا کی تصانیف میں عصر حاضر کے جلیل القدر محقق ومحدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کا منہج زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے جو خود اپنی تصانیف میں نیز متقدمین کی تصانیف کی تحقیق کرتے ہوئے فہرست موضوعات میں ہر ہر جزوی بحث کا ذکر کرتے ہیں خواہ وہ حاشیہ ہی میں کیوں نہ آئے، لیکن متن میں عناوین بہت کم درج کرتے ہیں، اسی لئے ان کی تصانیف سے استفادہ بہت آسان ہوتا ہے۔

یہ اشاعت حضرت مصنف کے وطن (ننہال وجائے پیدائش) استھانواں ضلع نالندہ (بہار شریف) کی ایک نوخیز لیکن سرگرم فلاحی وثقافتی تنظیم یونائٹیڈ ویلفیر ایسوسی ایشن کی جانب

سے منظر عام پر آ رہی ہے، یہ تنظیم اس بستی کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کوششوں سے چند سال قبل ہی، جود میں آئی ہے، اور بہت جلد رفاہی فلاحی کاموں کی وجہ سے قرب وجوار میں مقبولیت حاصل کر لی۔

یہاں اس بستی کے شرفاء کی قدیم ثقافتی وادبی انجمن الفلاح اور کتب خانہ الفلاح کا تذکرہ بھی قارئین کے لئے مفید ہوگا، تقریباً ڈیڑھ صدی قبل ۱۸۸۵ء قائم شدہ یہ کتب خانہ تباہی وبربادی کے مختلف مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود آج بھی معتدبہ قدیم آثار ونوادر، قلمی کتب اور نایاب مطبوعات پر مشتمل ہے اور قارئین ومحققین کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔

خدائے تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت مصنف کی دیگر تصانیف ونگارشات کی خدمت کا موقعہ فرمائے اوراس اشاعت کو قبول فرما کر اہل علم کے لئے مفید بنائے اوراس کی اشاعت میں حصہ لینے والوں کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین

طلحہ نعمت ندوی

۲۲ ذی قعدہ ۱۴۳۶ھ

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ مسئلہ بڑی تفصیل وبسط کا طالب ہے کہ یورپ کی موجودہ بے دینی خوداس کے اس دین کی پیداوار ہے جس کی بنیاد عقیدہ ''ولدیت'' پر قائم تھی (۱)۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کی تحریک کو

(۱) سورۂ کہف جس کے متعلق صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ دجالی فتنے سے جو محفوظ رہنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ اس سورہ کی ابتدائی یا آخری آیتوں کی تلاوت کرے، سورہ کی ابتداء میں عیسائیوں کے اس عقیدہ کا کہ خدا کے لئے یہ ولد (بیٹا) ثابت کرتے ہیں اس کا تذکرہ کرنے کے بعد نسل انسانی کے سب سے بڑے بہی خواہ رحمۃ اللعالمین ﷺ کو خطاب کرکے یہ ارشاد ہوا کہ ''جن آثار یعنی نتائج کو چھوڑ کر عقیدۂ ولدیت والے دنیا سے جائیں گے اور تمہاری بات یعنی قرآنی تعلیم نہ مانیں گے اس واقعہ پر کیا تم اپنے آپ کو ہلاک کردو گے'' حاصل یہ ہے ان قرآنی الفاظ کا یعنی ''فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا'' میرے نزدیک آثار جنہیں عقیدۂ ولدیت والے دنیا میں چھوڑنے والے تھے، یہی وہ تماشے ہیں جنہیں یورپ اور یورپ کے زیر اثر ساری دنیا پیش کررہی ہے، ہوا یہ کہ بجائے مخلوق کے حضرت مسیح علیہ السلام کو جب خدا کا بیٹا ٹھہرایا گیا تو قاعدہ ہے کہ انسان کا بیٹا انسان ہی ہوتا ہے، گھوڑے سے گھوڑا پیدا ہوتا ہے، خدا کے بیٹے کو بھی ناگزیر تھا کہ خدا ہی مانا جائے اوراس میں وہ ساری صفات تسلیم کی جائیں جو خدا کی خصوصیات ہیں خدائی صفات کے ساتھ انسانی شکل میں مسیح کا وجود عیسائیوں کے لئے باعث فتنہ بن گیا، خدا سے بھی بنی آدم نے اس دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا، جتنی دلچسپی عیسائیوں کو مسیح علیہ السلام کی ذات سے ہوئی، پھر مسیح کے نام سے پوپ کا عہدہ جب قائم ہوا اور پوپ کی راہ سے کلیسا کا نظام عیسائیوں پر مسلط ہوا، اس نے عیسائیوں کی جان ومال، عزت وآبرو کے ساتھ وہ کھیل کھیلے جس کی دردناک داستان سے یورپ کی تاریخ بھری ہوئی ہے، آخری صدیوں کی مصیبت برداشت کرنے کے بعد پروٹسٹنٹ تحریک کی شکل میں کلیسائی

ابتداء میں صرف کلیسا کے جبر وتسلط کے ردّعمل کی شکل میں ظاہر ہوئی لیکن بتدریج بڑھتے ہوئے یہی تحریک مطلقاً مذہب اور دین کی بنیادوں پر ضرب بن گئی، کلیسا مذہب کی جس تشریح کو واجب التسلیم والتعمیل قرار دیتا تھا، شروع میں تو اس احتجاجی تحریک کو اسی سے اختلاف تھا، اگرچہ یہ اختلاف بھی معمولی اختلاف نہ تھا، بڑی بڑی خوں ریزیاں اس آویزش کی بدولت صدیوں یورپ میں ہوئی ہیں، جو عوام اور کلیسا کے درمیان قائم ہوگئی تھی، وہی زمانہ تھا جب یورپ کی قومیں کھولی گئیں اور دنیا کے مختلف علاقوں میں بحری راستوں سے ان کا داخلہ شروع ہوا، شروع میں گو ان کی حیثیت زیادہ تر سوداگروں اور بحری تاجروں کی تھی، لیکن دوسرے ارادے بھی ان کے سینوں میں پوشیدہ تھے، اسی لئے علاوہ تجارت کے مختلف قسم کے دوسرے کاروبار کا سلسلہ بھی ان ممالک میں جاری کردیتے تھے، جہاں گھس پڑنے کا ان کو موقعہ مل جاتا تھا، کاروبار کے اس دوسرے سلسلہ میں ایک اہم سلسلہ اپنے عقائد اور خیالات کی اشاعت کا بھی ان کے سامنے تھا، اسی سے اندازہ کیجئے کہ مغل دربار کے امیر دانشمند خان جن کی وفات آج سے تقریباً تین سو سال پہلے ۱۰۸۱ ہجری میں ہوئی یہ شاہجہاں اور عالمگیر دونوں بادشاہوں کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز رہے، علاوہ سیاسی مہارت کے علم وفضل میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور دانشمند خاں میں بعض علمی مسائل پر شاہجہاں کے سامنے بادشاہ کے اشارے سے مناظرے بھی ہوئے، بہرحال کہنا یہ ہے کہ ماثر الأمراء میں ان کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''گویند کہ خان مذکور در انجام عمر اہل فرنگ مائل گردید واکثرے از احکام تحریفات

اقتدار کا ردعمل ہوا، ابتداء میں گو مذہب کی کلیسائی شکل کے خلاف یہ ردعمل تھا لیکن بات بڑھتی چلی گئی، اور آخر میں مطلقاً مذہب اور دین کے ردعمل کے قالب میں یہ تحریک ڈھل گئی، مذہب کے انکار کا لازمی نتیجہ تھا کہ انسان، انسان باقی نہ رہے اور ایک ترقی یافتہ حیوان سے زیادہ اس کی وقعت نہ رہے، انسانیت کے متعلق حیوانات کے اسی خیال نے ان امور کی آبیاری کی، جن میں یورپ وامریکہ کے باشندے مبتلا ہیں، میرے خیال میں "علی آثارھم" میں آثار کے لفظ سے ان ہی چیزوں کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے، ان باتوں کی پوری تفصیل میری کتاب سورہ کہف کی تفسیر میں مل سکتی ہے۔

آن جماعت تکرار می نمود''(۱)۔

(کہتے ہیں کہ خان موصوف یعنی دانشمند خاں آخر عمر میں اہل فرنگ کے علم کی طرف مائل ہوگئے تھے اور اہل فرنگ کے تحریفات (یعنی مذہب کے متعلق جو خیالات تھے) ان کو دہراتے رہتے تھے)۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں بادشاہ کے زمانے ہی سے ہندوستان کے باشندوں پر مغربی خیالات وعقائد کا اثر پڑنا شروع ہوگیا تھا، یورپ میں اس وقت کلیسا کے خلاف جو کچھ ہورہا تھا ناممکن تھا کہ اس ملک سے آنے والے لوگ اس کا تذکرہ ان لوگوں سے نہ کرتے، جن سے ان کا ملنا جلنا ہوتا تھا، خافی خاں نے فرنگیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو حضرت مسیح اور مریم کی مورتیاں لکڑی وغیرہ سے بنا کر پوجتے ہیں، خافی خاں کے الفاظ یہ ہیں:

''معبد خانہ آنہا برخلاف ہنود بحسب ظاہر درکمال صفائی کہ شمعہائے کافوری در آنجا می سوزند بنظر آمدہ، صورت حضرت عیسی ومریم را (علی نبینا وعلیہما الصلاۃ والسلام) باعتقاد فاسد خود بہ چندیں صورت از چوب ورنگ وروغن بزینت تمام ساختہ اند، اما در کلیسائے انگریز آنہا نیز نصرانی اند صورت بطریق اصنام نمی باشد''(۲)۔

(ان عیسائیوں کی عبادت گاہ ہندوؤں کی عبادت گاہوں کے برخلاف بڑی صاف ستھری رکھی جاتی ہے اور کافوری شمع دان کو بھی جلتے ہوئے میں نے دیکھا، حضرت عیسی اور مریم کی صورت لکڑی سے بنا کر اور رنگ وروغن کرکے سجا کر انتہائی زینت کے ساتھ رکھتے ہیں، لیکن انگریز کے گرجوں میں مورتیاں اور تصویریں بطور بتوں کے نہیں ہوتیں حالانکہ نصرانی ہی ہیں)(۳)۔

(۱) ج ۲/ص ۳۲

(۲) ج ۲/ص ۴۲۹۔

(۳) اس موقع پر میکنزی نے اپنی مشہور کتاب ''اخلاقیات'' (اتھکس) میں جو یہ لکھا ہے، سننے کے قابل ہے، لکھتا ہے کہ ''خدائے مسیح اور مریم کی تصویریں کیسی ہی اعلی درجہ کی بنا کر ہمارے سامنے کیوں نہ پیش کی جائیں مگر ہمارا سر عبودیت ان کے سامنے نہیں جھک سکتا''۔ (ص ۳۹۰)......

آگے اس کے بھی خافی خاں نے تصریح کی ہے کہ:

''محرر اوراق مکرر دراں مکان و بنا در [کہ کلیسا] دارد گشتہ و با علمائے آنہا صحبت داشتہ مذاکرہا نمود''۔(۱)

(محرر اوراق (یعنی خود مصنف) بسا اوقات ان کی عبادت گاہوں اور ان بندرگاہوں میں جہاں ان کے گرجے ہیں، پہنچا ہے اور ان لوگوں کے علماء سے ملنے جلنے کا موقعہ بھی اس کو ملتا رہا، ان کے علماء سے بحث و مباحثہ بھی کرتا رہا ہے)۔

یہ چند سرسری شہادتیں ہیں جن سے میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ سیاسی اقتدار وتسلط سے پہلے اور بہت پہلے جس وقت اس کا سامان وگمان بھی نہ تھا کہ سوداگروں کا یہ گروہ مشرقی ممالک پر بادشاہی کرنے کے لئے بلایا گیا ہے، یعنی مغل حکومت جب اپنی قوت واقتدار کے عہد شباب میں تھی، اسی زمانے میں یورپ کے عقائد وخیالات کا اثر مشرق کے باشندوں پر پڑنے لگا تھا، خصوصا جہاں بندرگاہیں تھیں یا تجارتی کوٹھیاں یورپ والوں کی قائم تھیں، وہاں جن لوگوں کی آمد ورفت تھی، ان کے نہ متاثر ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہوسکتی تھی، اور بھی لوگ جب اپنے اپنے اوطان واپس ہوتے تھے دوسروں تک بھی ان خیالات کو وہ پہنچاتے تھے۔

ماننے والے اس کو مانیں یا نہ مانیں لیکن ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایران کے شیعوں میں خصوصاً اور عام شیعوں میں عموماً ''اخباریہ'' کے نام سے جس تحریک کا آغاز دسویں صدی ہجری کے اختتام اور گیارہویں کے شروع میں ملا محمد امین کے ہاتھوں ہوا اور صاحب ''نجوم السماء'' نے جن کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں:

''اوست اول کسے کہ دروازۂ طعن بر مجتہدین کشاد، وفرق ناجیہ امامیہ را بدو قسم منقسم ساخت، یکے اخباری و دیگر مجتہدی'' (۲)۔

(ملا محمد امین پہلے آدمی ہیں جنہوں نے مجتہدین پر طعن کا دروازہ کھولا اور فرقہ ناجیہ

...... یہ مشہور فلسفی ہیگل کا قول ہے، لیکن یہ کیفیت یورپ کے بت پرستوں میں کس کی آواز نے پیدا کی؟

(۱) ج ۲ ص ۴۶۹۔

(۲) ص ۴۱۔

امامیہ اثنا عشریہ یعنی شیعوں کو دو حصوں میں منقسم کردیا، ایک اخباری (جو ملا امین کے پیرو تھے) اور دوسرے مجتہدی (مجتہدین کو ماننے والے))۔

ہم اس تحریک کے متعلق نہیں کہہ سکتے کہ کلیسا اور پروٹسٹنٹ فرقہ کی باہمی آویزش سے جو مسائل یورپ میں پیدا ہوئے تھے اور مغربی سوداگروں کی راہ سے مشرقی ممالک میں ان کے چرچے پہنچ رہے تھے، ان سے ایران کی یہ اخباری تحریک کوئی تعلق نہیں رکھتی، اور ایران تو ایران، خود ہندوستان کا مشہور تجارتی شہر برہان پور جو مغلوں کے عہد میں ہندوستان کا گویا لنکاشائر یا مانچسٹر ہونے کی حیثیت، صنعت پارچہ بافی میں رکھتا تھا، اور بکثرت اسی تعلق سے یورپ کے تاجروں کی آمد ورفت کا یہ آماج گاہ بنا ہوا تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ عہد جہانگیری کے ایک عالم قاضی نصیر الدین خلف سراج الدین جن کی وفات ۱۰۸۱ھ میں ہوئی ہے، ان کے متعلق بھی تاریخ نے یادداشت چھوڑی ہے کہ:

''قاضی ہر قسم حدیث را ترجیح می داد وانکار قیاس می نمود'' (۱)

---

(۱) قاضی نصیر الدین اور انکے خسر شیخ علم اللہ میں اسی تقلید وعدم تقلید کے مسئلہ میں بڑے جھگڑے ہوئے، لکھا ہے کہ خان خاناں، قاضی نصیر الدین کا حامی تھا اسی لئے کوئی گزند ان کو نہیں پہنچا، بعد کو جب خان خاناں کی کمان اتر گئی اور جہانگیر نے حکم دیا کہ قاضی نصیر اور شیخ علم اللہ دونوں کو دہلی روانہ کردیا جائے، تب دونوں صاحب برہانپور سے بھاگ گئے، قاضی نصیر مکہ معظّمہ چلے گئے، پانچ سال کے بعد واپس ہندوستان لوٹ رہے تھے کہ ان کے جہاز کو فرنگ کے جہازوں نے پکڑلیا، عجیب بات یہ نقل کی ہے کہ قاضی نصیر کے علم وفضل سے واقف ہونے کے بعد فرنگی قاضی صاحب کو ''نزد بادشاہ خود بردند'' (اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے) واللہ اعلم اس ''بادشاہ'' کے لفظ سے کیا مراد ہے، کیا ان کو یورپ لے گئے، بظاہر یہ فرنگی، پرتگالی معلوم ہوتے ہیں، جنہوں نے بحیرۂ ہند اور بحیرۂ عرب کو اس زمانے میں اپنی تاخت وتاراج کا نشانہ بنا رکھا تھا، آگے اسی کتاب میں ہے کہ قاضی نصیر جب فرنگیوں کے بادشاہ کے پاس پہنچے تو آداب شاہی بجا نہ لائے، پوچھا گیا تو جواب دیا کہ ہم سے یہ باتیں نہیں ہوسکتیں، فرنگی بادشاہ نے ان کو چھوڑ دیا، رہا ہوکر یہ بیجاپور آئے، ابراہیم عادل کا زمانہ تھا، کئی میل آگے بڑھ کر اس نے استقبال کیا، پھر یہ شاہجہاں کے پاس پیش ہوئے جو برہانپور میں صوبیدار ہونے کی حیثیت سے آیا تھا، شاہجہاں نے جہانگیر کے پاس بھیج دیا، جہانگیر نے بھی ان......

(قاضی نصیرالدین ہرقسم کی حدیثوں کو ترجیح دیتے تھے اور قیاس کا انکار کرتے تھے)

ظاہر ہے کہ مجتہدین پر زبان لعن وطعن دراز کرنا اور اخبار یعنی براہ راست حدیثوں سے نتائج نکال کر ان ہی پر عمل کے لئے لوگوں کو آمادہ کرنا، جو شیخ امین ایرانی کی تحریک تھی، یا قاضی نصیر کا قیاس سے منکر ہو جانا اور حدیثوں سے مسائل کے پیدا کرنے کا دعوی کرنا اس میں اور رومن کیتھولک (یعنی کلیسا کے ماننے والے عیسائیوں) میں اور پروٹسٹنٹ فرقہ میں جو جھگڑا تھا، دونوں میں اس کے سوا اور کیا فرق ہے؟ کہ یورپ میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا اور ایرانی ہندوستان میں اس جھگڑے کا تعلق اسلام سے تھا، پروٹسٹنٹ عقیدے کے ماننے والے بھی تو کہتے تھے کہ ہم کلیسا کے ان اجتہادی نتائج کے ماننے پر مجبور نہیں ہیں جو تورات وانجیل سے علماء کلیسا نے پیدا کئے ہیں، بلکہ براہ راست ہر عیسائی کو حق حاصل ہے کہ وہ خود تورات اور انجیل کو سمجھے اور خود آزادانہ نتائج پیدا کرے، الغرض قصہ ایک ہی تھا، قصہ کا تعلق مغرب میں عیسائی مذہب سے تھا، اور مشرق میں اسلام سے تھا۔ اسی بنیاد پر میں تو نہیں سمجھتا کہ عرب کی اس تحریک کے متعلق جو نجدی عالم شیخ محمد بن عبدالوہاب کی طرف منسوب ہو کر وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی ہے، اس کے متعلق طامس پیٹرک نے جو یہ لکھا ہے کہ:

''وہابیت کو بسا اوقات اسلام کا پروٹسٹنٹ فرقہ بتایا جاتا ہے، اگرچہ فرق یہ ہے کہ عیسائی پروٹسٹنٹ مقدس الہامی کتابوں کی اعلی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے روایتی تعلیمات کو مسترد کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہابیت قرآن کے ساتھ ساتھ حدیثوں میں بھی زور دیتی ہے''۔

اس کے انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ ہوسکتی ہے، بلکہ ''اگرچہ'' کے بعد مصنف مذکور نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں وہ ''روایتوں'' اور ''حدیثوں'' کے فرق کو سمجھ نہیں سکا ہے، حدیث کی حیثیت ہمارے ہاں علماء کی روایتوں کی نہیں ہے، بلکہ وہ تو براہِ راست پیغمبر اسلام کے

......کو احترام کے ساتھ رکھا اور چند دن بعد وطن برہانپور واپس کر دیا، وہیں ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی۔ (ص ۱۵۴ تاریخ برہانپور)

ملفوظات، اعمال وافعال وغیرہ کے مجموعہ کا نام ہے۔

(Tradition) کے لفظ سے حدیث کا غلط ترجمہ یورپ میں جو پھیل گیا ہے، یہ مغالطہ اسی غلط ترجمہ کا نتیجہ ہے۔

بہرکیف شیخ عبدالوہاب نجدی کے متعلق جب ہمیں معلوم ہے کہ ایک زمانے تک ان کا قیام مشرق ومغرب کی کڑی ملانے والی مشہور تاریخی بندرگاہ بصرہ (۱) میں رہا ہے اور بقول ان کے ایک عقیدت مند کے:

''بصرہ میں یہ جذبہ (جذبہ وہابیت) اور تیز ہو گیا''۔(۲)

اور اسی تیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بصرہ میں:

''ان کو طرح طرح کی تکلیفیں جھیلنی پڑیں اور آخر بصرہ انہیں چھوڑنا پڑا''۔(۳)

بہرحال کچھ بھی ہو واقعات اس کے شاہد ہیں کہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے سے پہلے اور بہت پہلے مشرق پر بتدریج مغرب اپنا ذہنی تسلط قائم کرتا چلا جا رہا تھا اور مسلمانوں میں مختلف قسم کی مذہبی بے چینیاں پچھلی چند صدیوں میں جو رونما ہوئیں ان میں بہت کچھ دخل اسی ذہنی تسلط کی تدریجی ترقی کو ہے، جیسے جیسے سیاسی اقتدار کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا، اسی نسبت سے ذہنی تسلط کے پنجوں کی گرفت بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جاتی تھی، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ یورپ کی تلوار، یورپ کا قلم اور زبان کے پیچھے پیچھے مشرقی ممالک میں آئی ہے اور کسی نہ کسی حیثیت سے سارے اسلامی ممالک یورپ کے ان ذہنی تغیرات وانقلابات سے متاثر ہوتے چلے جاتے تھے، اس وقت خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر ان مغربی خیالات کی اثر

(۱) بصرہ آج ہی نہیں زمانہ سے اپنے محل وقوع کی خصوصیات کی وجہ سے مختلف مذہبی فرقوں کے خروج کا مرکز بنا رہا ہے، اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عموماً اسلامی فرقے بصرہ ہی میں پیدا ہوئے جس کے اسباب طویل ہیں، کسی دوسری کتاب میں ان اسباب کی تفصیل کی جائے گی۔

(۲) ص: ۲۵ کتاب، محمد بن عبدالوہاب۔

(۳) ص: ۲۵ کتاب، محمد بن عبدالوہاب۔

اندازیوں کی رفتار کا یہی حال رہا تو ایک طرف سلبی نتیجہ تو اس کا یہ ہوگا کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال سے بھی زیادہ زمانہ میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں نے اسلام کو سمجھ کر مختلف پہلوؤں سے اس کی جو تشریح وتعبیر کی ہے، جن سے کتب خانوں کے کتب خانے بھرے ہوئے ہیں، آن واحد میں سب ملیا میٹ ہوکر رہ جائیں گے، ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل اوران بزرگوں کے ماننے والے علماء نے فقہ کی تدوین وترتیب میں جو جانکاہیاں کی ہیں سب کان لم یکن ہوکررہ جائیں گی، اورفقہ ہی کیا مسلمانوں کا تصوف، مسلمانوں کا کلام اوران کے سوا ان ہی علوم کے معاون فنون جنہیں خون جگر پلا پلا کر مسلمانوں کے اہل علم نے پالا تھا ان کی کوئی وقعت باقی نہ رہے گی۔ اور اس سلبی خطرے کے ساتھ دوسرا اثباتی خطرہ اس لازمی فتنے کا تھا، جس کا پھوٹ پڑنا ایسی حالت میں ناگزیر ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اسلامی دین میں دنیا کی قومیں جب ابتدا میں داخل ہوئی تھیں تو ہرقوم اپنے ساتھ موروثی جراثیم لے کر داخل ہوئی، اسلام کی ابتدائی چند صدیاں اس لحاظ سے بڑی نازک تھیں کہ نومسلموں کا یہ گروہ چاہتا تھا کہ اسلامی مسلمات اور اپنے موروثی خیالات میں مصالحت اور مطابقت پیدا کر کے کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ آبائی مالوفات سے بھی بالکلیہ تعلق منقطع نہ ہو اور ہم مسلمان بھی باقی رہیں، اسلام کی ابتدائی صدیوں میں فرقہ بندیوں کی جو بھرمار نظر آتی ہے، منجملہ دوسرے اسباب ووجوہ کے ایک بڑا سبب ان کا یہ بھی تھا، لیکن بتدریج آبائی خیالات ونظریات سے ان کی پچھلی نسلوں کے تعلقات مضمحل ہوتے چلے گئے اور ''اہل سنت والجماعت'' کی شکل میں مسلمانوں کی اکثریت خالص اسلامی مطالبات کے باعث کامیاب ہوگئی، اس کے بعد فرقہ بندیوں کے سارے قصے محض کتابوں کی تاریخی داستان بن کر رہ گئے، نہ فرقے باقی رہے نہ ان کی کتابیں باقی رہیں، یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ابتدائی صدیوں کے فرقوں میں سب سے بڑا منہ زور، صاحب قلم بلکہ بعض اوقات صاحب سیف بھی معتزلہ فرقہ تھا، لیکن معتزلہ کا یہ حال ہے کہ ان کے عقائد وخیالات کی کتاب کیا کتاب کے کسی

ورق کا ملنا بھی دشوار ہے، جو کچھ علم اس فرقے کے متعلق دنیا رکھتی ہے، زیادہ تر وہ اہل سنت کی کتابوں ہی سے ماخوذ ہے، تردید واصلاح کے لئے لوگوں نے ان کے خیالات نقل کئے ہیں، یا عقائد واعمال کے علاوہ کسی دوسرے فن مثلاً تفسیر یا لغت وغیرہ میں ایک دو بچی کھچی کتابیں معتزلہ کی رہ گئی ہیں جن میں چھپا چھپا کر کہیں کہیں اپنے عقائد بھی ان کے مصنفوں نے شریک کردیئے ہیں۔

خیر یہ داستان تو طویل ہے کہنا یہ ہے کہ گھل گھلا کر سارے اسلامی فرقے چوتھی پانچویں صدی سے وحدت کے نقطہ پر جمع ہوگئے، وہی اہل سنت والجماعت کے نام سے آج دنیا میں مشہور ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کے مسلمان جن کی تعداد چالیس پچاس کروڑ سے ستر کروڑ تک بتائی جاتی ہے، اور ایشیاء، افریقہ بلکہ یورپ کے بعض علاقوں میں متفرق طور پر وہ آباد ہیں لیکن اتنی بڑی تعداد جو اتنے دور دراز ممالک میں پھیلی ہوئی ہے بجز ایک اقلیت قلیلہ (گویا ہزار میں شاید ایک ہونے کی نسبت رکھتے ہوں) یعنی شیعہ فرقہ کے دنیا کے یہ سارے مسلمان وہی ایک عقیدہ، ایک مسلک رکھتے ہیں جس کی تعبیر اہل سنت والجماعت کے عقائد ومسلک سے کی جاتی ہے، البتہ فروعی مسائل کے بعض پہلوؤں میں ہلکی قسم کا ایک اختلاف سنیوں میں پایا جاتا ہے، یعنی وہی اختلاف جس کی وجہ سے بعض حنفی، بعض شافعی، مالکی یا حنبلی کہلاتے ہیں، مختلف ممالک واقالیم کے کروڑ ہا کروڑ انسانوں میں چار ہی قسم کے یہ اختلافات بجائے خود کچھ کم محل تعجب نہیں ہیں، اور سچی بات یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے اس اختلاف کو واقعی اختلاف وہی قرار دے سکتا ہے، جس کی نظر حقائق وواقعات پر نہ ہو، آخر جب ان میں ہر ایک دوسرے اماموں کا اسی قدر احترام کرتا ہے جتنا احترام اپنے امام کا دل میں رکھتا ہے، سب ہی کو ''رحمۃ اللہ علیہ'' کی دعا کے ساتھ بلا استثناء ہر ایک یاد کرتا ہے، آخرت میں قرب وثواب کے لحاظ سے قطعاً کسی امام کو دوسرے امام پر ترجیح نہیں دی جاتی، اور ائمہ ہی نہیں ان مختلف ائمہ کے ماننے والے علماء صوفیاء کے ساتھ تقریباً ہر سنی مسلمان وہی تعلق رکھتا ہے جو تعلق اس کا اپنے امام کے

ماننے والے علماء وصوفیا سے ہوتا ہے، غزالی، رازی، شافعی مذہب کے علماء ہیں، لیکن کیا کسی حنفی کے دل میں ان لوگوں کی عزت شافعیوں سے کم ہے، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ حالانکہ حنبلی مسلک رکھتے تھے، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حنفیوں میں عظمت واحترام کا جو مقام ان کو حاصل ہے، حنابلہ میں بھی ان کو تلاش کرنا مشکل ہے؟ میں نے اپنی کتاب تدوین فقہ کے ابتدائی حصہ میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اس وقت ان چند اشاروں پر اکتفا کر کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کرۂ زمین کی اتنی عظیم اکثریت میں وحدت خیال ومسلک کا یہ معجزانہ رنگ اسلام نے جو پیدا کر دیا تھا، اس کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ یہ شیرازہ ٹوٹ جائے گا، اور وہی امت جو اس وقت بمشکل چار اماموں کے اجتہاد واستنباط پر مجتمع ہوگئی ہے، اسی میں ہر فرد امامت کا مقام حاصل کر کے اس ایک دین کو چالیس پچاس دین یا فرقوں میں تقسیم کر دے گا، آخر جب ائمۂ اجتہاد سے بغاوت کا صور پھونکا گیا تھا، اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ ہر شخص کو محض اس لئے کہ وہ مسلمان ہے قرآن وحدیث کے مطالب کے تعین اور نتائج کے استنباط کا اختیار دے دیا جائے، اور جیسا کہ انسانی فطرت کا تجربہ ہے، یعنی ہر شخص کی شکل وصورت الگ الگ ہے اسی طرح آراء وخیالات میں بھی شتر بے مہاری کے اس دور میں لوگوں کا الگ الگ ہوجانا اس کا ایک قدرتی نتیجہ ہوتا، مسلمانوں کو منتشر اور پراگندہ ہونے کے بعد ایک نقطہ پر جمع کرنے میں سالہا سال کی کوششوں کے بعد جو کامیابی ہوئی تھی یہ کامیابی صفر بن کر رہ جاتی۔

میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جب ہندوستان میں ہوش سنبھالا تو ان تک یورپ کے اس مخفی ذہنی تسلط اور آئندہ اس سے پیدا ہونے والے خطرات کا علم کس راہ سے پہنچا لیکن اپنی پوری زندگی جس جدوجہد میں حضرت شاہ صاحب نے صرف کی، اس کے ایک بڑے حصہ کا تعلق، یہ عجیب بات ہے کہ ان ہی پیدا ہونے والے خطرات کے انسداد سے

معلوم ہوتا ہے، شاہ ولی اللہ ایک مسلک وسط کے پالینے میں کامیاب ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی فقہ بھی بچ گئی، تصوف بھی تباہی سے محفوظ رہا، قدیم علم کلام کی بنیاد پر ایک ایسے جدید علم کلام کی بنیاد ان کے ہاتھوں سے قائم ہوگئی جس میں کلام کے ساتھ تصوف اور تصوف کے ساتھ علم کلام کی ایسی معتدل آمیزش ہوئی ہے کہ اس کی بدولت مسلمانوں کا تصوف بھی زندہ ہے اور ان کے کلامی نظریات کی بھی زیادہ واضح شکلوں میں زندہ رہنے کی ضمانت پیدا ہوگئی اور اسی کے ساتھ پچھلے زمانے میں دین کے اصلی سرچشموں سے علماء اسلام کو تھوڑا بہت جو بُعد پیدا ہوگیا تھا اور یہ فطری بات ہے کہ نتائج وثمرات کی مشغولیت عموماً اصول سے دوری کا سبب بن جاتی ہے، لیکن شاہ ولی اللہؒ نے ایک ایسا محتاط متوازن قدم اٹھایا کہ نتائج وثمرات کی مشغولیت میں کسی قسم کی افسردگی بھی پیدا نہیں ہوئی، اور اسلام کے اساسی سرچشموں یعنی قرآن وحدیث کے ساتھ اہل علم کے تعلقات نئے سرے سے تروتازہ ہوگئے، تقلید کا وہ طلسم بھی ٹوٹ گیا جو تقلید کی کہنگی سے عموماً قائم ہوجاتا ہے اور آزادی رائے کے ساتھ تحقیقی تقلید کا ایک ایسا رنگ ان کے اور ان کے تلامذہ کے درس وتالیف نے پیدا کیا کہ ہر چیز اپنے طبعی مقام پر آکر ٹھہر گئی۔

یورپ کے سیاسی اقتدار سے پہلے ہی ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کا یہ کام مکمل ہوچکا تھا اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اپنی سیاسی اقتدار کے ساتھ یورپ مسلمانانِ ہند پر مسلط ہوگیا تو گو شروع میں کچھ ہلچل ضرور پیدا ہوئی، ایک طبقہ اس ملک میں پیدا ہوگیا تھا جو متوقع خطرات کے راستوں کو صاف کرنے لگا، لیکن شاہ ولی اللہ کا مکمل نظام پہلے سے اس ملک میں موجود تھا، مقابلہ کرنے والے اس نظام کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور تیس چالیس سال کی کشمکش کے بعد جو ہلچل پیدا ہوئی تھی وہ دب گئی، البتہ اس کے بعد تعلیم کے اس جدید نظام کے تحت جسے حکومت مسلطہ نے اس ملک میں نافذ کر رکھا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ان کو سب کچھ پڑھا دیا گیا ہے، حالانکہ قطعی طور پر ان بیچاروں کو بالکل یک طرفہ تعلیم دی جارہی ہے، وہ جس حد تک یورپ کے جدید علوم وفنون اور ان کے

مسائل کے عالم بنائے جاتے ہیں، اسی حد تک ان کو اسلام اور اسلامی حقائق و مسلمات سے جاہل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، جدید تعلیم سے استفادہ کر کے ملک میں تعلیم یافتوں کا یہ گروہ جو پھیلا دیا گیا ہے، اس کا حال نہ ان عوام کا ہے جو اپنے جہل کے صحیح علم کے بعد مذہب کے علماء کے سامنے گردن جھکا دینے میں شرم محسوس نہیں کرتے تھے، وہ جانتے تھے کہ نہ جاننے والوں کا فرض ہے کہ جاننے والوں کی باتوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیں اور نہ ان بے چاروں کو مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے تا کہ خود فیصلہ کر سکیں کہ ان کے مذہب کی واقعی صحیح تعلیم کیا ہے؟ وہ مذہب کے علماء سے بدگمان ہیں، ان میں یہ خیال پیدا کر دیا گیا ہے کہ ''ملا'' جو ان کے مذہب کے علماء کی خراسانی اور تاتاری تعبیر ہے، یہ جو کچھ بتاتا ہے یہ اسلام نہیں ہے، مگر اپنے جہل و ناواقفیت کی وجہ سے وہ اس کا بھی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے کہ آخر اسلام کیا بتاتا ہے۔

اس میں کچھ دخل اس بات کو بھی ہے کہ مذہب کی تعلیم اس زمانے میں جس طریقے سے علماء پا رہے ہیں وہ تعلیم کا قدیم طریقہ ہے، ہر زمانہ کے علم کی ایک زبان ہوتی ہے، اس زبان اور اس تعبیر سے ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے خیالات کو وہ زمانہ کی عصری زبان اور تعبیر میں پیش کرنے سے قاصر ہیں، ظاہر ہے کہ یہ دونوں نقائص تعلیم کے دونوں نظاموں کے نقص سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن یہ نقص کوئی بڑا نقص نہیں ہے، ایسی کوتاہی نہیں ہے جس کا ازالہ نہ ہو سکے، تعلیم کے نظام کی دو روئی کو ختم کر کے آج مذہبی تعلیم کا دامن عصری علوم و فنون کے ساتھ اگر جوڑ دیا جائے، جیسے اپنی گزشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمان برابر یہی کرتے چلے آئے تو ساری غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، اور شاہ ولی اللہ کا کام کم از کم ان خطرات کے سدِّ باب کے لئے کافی ہے جو ''عقیدۂ ولدیت'' کے آثار سے یورپ میں پیدا ہوئے ہیں۔

آئندہ اوراق میں آپ کو حضرت شاہ ولی اللہ کی زندگی کا ایک سرسری تذکرہ اور ان کے کارناموں کا اجمالی ذکر ملے گا، ایک شہری [ماہنامہ] مجلّہ کے لئے مختصر سا مقالہ لکھا گیا تھا، باوجود انتہائی اختصار کے لوگوں کا خیال ہے کا کافی پھیل گیا ہے، اس مستقل کتاب کی شکل میں

اسی کو وہ شائع کر رہے ہیں، لیکن میرے نزدیک اس کتاب کی حیثیت شاہ صاحب کی حقیقی سوانح عمری کے مقابلہ میں گویا وہی ہے جو دریا کے مقابلہ میں قطرے کی ہوتی ہے مگر چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری صاحب کو شاہ صاحب کی ذات سے ایسی عقیدت ہے کہ وہ اس ''عجالہ مختصرہ'' کو بھی بہت کچھ سمجھتے ہیں، اشاعت کی اجازت انہوں نے مجھ سے چاہی، کار خیر سے منّاع بننے کی کوئی وجہ مجھے نظر نہ آئی۔

والسلام

مناظر احسن گیلانی

بسم الرحمٰن الرحیم

تقریب

(اصل مضمون کے پڑھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ناظرین یہ دو باتیں پڑھ لیں)

۱۔ چند ہی دن ہوئے کہ حضرت مجدّد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات کے ایک حصہ کی ترتیب سے فارغ ہوا تھا(۱) کہ مولانا نعمانی دام مجدہ العالی نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تیار ہوجانے کا بگل بجادیا، دماغ تھکا ہوا تھا، نیز یہ سوچ کر کہ شاہ صاحب کی کتابیں چونکہ عام طور پر متداول ہیں، ان کے خاص خیالات ونظریات سے لوگ واقف ہیں، بآسانی دوسرے حضرات مقالات لکھ لیں گے، جی چاہا کہ خاموش ہوجاؤں، لیکن مولانا کے بار بار تقاضے سے بالآخر آمادہ ہوا، یہ خیال کرکے کہ اس زمانہ میں ایک بڑا گروہ ہم میں ایسوں کا پیدا ہوگیا ہے جو سمجھتا ہے کہ سیاسی برتری جب تک حاصل نہ ہوجائے، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کسی قسم کی خدمت کا امکان نہیں ہے، ان کے نزدیک محکومیت کی لعنت کا مٹانا، ہر کام اسی پر موقوف ہے، لیکن عراق سے جب تک تریاق آئے کیا مار گزیدہ کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے؟——اسی خیال نے مجھے آمادہ کیا کہ ہندوستان کی تاریخ کا وہ دور جب اس ملک میں مسلمان اپنی سیاسی قوت اگر بالکلیہ کھونہیں چکے تھے، تو سرعت کے ساتھ کھوتے چلے جارہے تھے، نمک جس طرح پانی میں

(۱) اس سے مراد وہ مقالہ ہے جو ''الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر'' میں بعنوان ''ہزارہ دوم کا تجدیدی کارنامہ'' شائع ہوا تھا، اور جس کی دوسری قسط ۱۳۵۸ھ کے کسی شمارہ میں شائع ہوئی ہے۔

پگھلتا چلا جاتا ہے اسی طرح ہندی مسلمانوں کا ملوکانہ اقتدار اس ملک میں گلتا اور پگھلتا جارہا تھا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے چونکہ فتنوں کی ان ہی تاریک اور بھیانک راتوں میں کام کیا، اور اپنے کام میں کامیاب، بہت زیادہ کامیاب رہے، خیال گزرا کہ ''روح اللہ'' سے جن لوگوں میں گونہ ''یاس'' پیدا ہوتا چلا جارہا ہے، شاید اس داستان کے دہرانے سے ان کے دلوں میں قوت پیدا ہو، مطلب یہ ہے کہ کام کرنے والوں کے لئے ہر زمانہ، ہر ملک، اور ہر عہد میں بڑا میدان ہے، بہانہ جو طبائع غیر شعوری طور پر مواقع وعوائق کے پہاڑوں کو اپنے سامنے کھڑا کرکے اپنی ہمت پست کرلیتے ہیں، یا ایسی شرطوں پر اپنی آمادگی کو موقوف ومشروط کرلیتے ہیں جن کا حصول ہی مشکل ہوتا ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ ؎

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ وتفنگ
تو اگر چاہے تو تیرے پاس یہ ساماں بھی ہے

اپنے مجذوبانہ انداز میں جو میری دیوانگی کا اقتضا ہے اس مضمون کو میں نے لکھا ہے، نہ میں ''مورخ'' ہوں اور نہ ''سیاست کار''، بلکہ سچ یہ ہے کہ جن جن علوم وفنون سے حضرت شاہ ولی اللہ نے بحث فرمائی ہے ان میں سے کسی ایک سے بھی مجھے ماہرانہ تعلق نہیں، کچھ ادھر ادھر کی شکستہ وگشتہ باتوں کو میں نے جمع کردیا ہے، اگر کسی ایک دل میں بھی وہ جذبہ پیدا ہوجائے جو اس مقالہ کے لکھنے کا مقصود ہے تو سمجھوں گا کہ محنت ٹھکانے لگی، ورنہ قہر درویش بہ جان درویش۔

میں نے اپنے اس مضمون کے بیچ بیچ میں کہیں ''عصری نظریات'' کا تذکرہ بھی مصلحۃً کیا ہے اور کسی ایک پہلو کی طرف بہ ظاہر میرا رجحان بھی محسوس ہوسکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنی رائے پر میں نے چونکہ خود کبھی اعتماد نہیں کیا، اس لئے صرف رائے کی حیثیت سے اپنا خیال ظاہر کردیا ہے، باقی اعتماد تو ان ہی لوگوں کے مشوروں پر دوسروں کو کیا خود مجھے بھی کرنا چاہیے جن پر اہل فہم اور اہل دین مسلمانوں کی اکثریت اعتماد کرتی ہے ''اتبعوا السواد الأعظم''، پیغمبر

صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، میں نے یہ اس لئے لکھ دیا کہ خواہ مخواہ ان امور کی وجہ سے مجھے کسی خاص پارٹی کا آدمی نہ خیال کیا جائے، بلکہ چند وساوس تھے جن کا اظہار کر دیا گیا چاہیے کہ آدمی ہر پہلو کے سوچنے والوں کی باتوں پر غور کرے ع

گر نوشت ست پند بر دیوار

۲۔ آئندہ مضمون کے پڑھنے اور سمجھنے میں سہولت ہوگی اگر حسب ذیل معلومات کا ایک سرسری خاکہ اپنے سامنے رکھ لیا جائے۔

(الف) حضرت شاہ ولی اللہ کی ولادت ۱۱۱۴ھ اور وفات ۱۱۷۶ھ ہجری میں ہوئی۔

(ب) اس لحاظ سے آپ کی ولادت عہد عالمگیری کے آخری زمانے میں ہوئی، یعنی حضرت اورنگ زیب عالمگیر (انار اللہ برھانہ) کی وفات سے چار سال پہلے شاہ صاحب نے اس عالم ناسوت میں قدم رکھا۔

(ج) شاہ عالم ثانی یعنی جس بادشاہ نے بنگال و بہار کی دیوانی کلایو کے ذریعہ سے کمپنی بہادر کو سپرد کی اسی نابینا بادشاہ کے عہد میں شاہ صاحب اس عالم سے عالم جاودانی کی طرف تشریف لے گئے۔

(د) حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو دس بادشاہوں کے عہد حکومت سے گزرنا پڑا۔

(ر) ان دس بادشاہوں کی ترتیب یہ ہے ۱۔ عالمگیر ۲۔ بہادر شاہ ۳۔ معز الدین جہاندار شاہ ۴۔ فرخ سیر ۵۔ رفیع الدرجات ۶۔ رفیع الدولہ ۷۔ محمد شاہ بادشاہ (المعروف بہ رنگیلا) ۸۔ ابوالنصر احمد شاہ ۹۔ عالمگیر ثانی ۱۰۔ شاہ عالم بادشاہ مکحول ومظلوم ومسلوب۔

(س) ان سلاطین کے عہد میں ہندوستان کو جن مہیب اور خونی واقعات اور شدید تاریخی انقلابات سے گزرنا پڑا، اور مسلسل فتنے جو پیدا ہوئے عموماً لوگ اس سے واقف ہیں، بارہ

کے سادات جو ''کنگس میکر'' (بادشاہ گر بھائیوں) کے نام سے تاریخ میں یاد کئے جاتے ہیں ان کا تسلط، فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں قید میں بصد بیکسی مرنا، پھر دربار کے تورانی امراء کے ہاتھوں ان سادات کا زوال، مرہٹوں کی سرکشی کا انتہائی عروج، سکھوں کا خونی فتنہ، نادر شاہ کا قتل عام، ابدالی کا پانی پت میں ایک فیصلہ کن جنگ کے ذریعہ ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دینا، روہیلوں کا ہندوستان کی سیاست میں شریک ہونا، ایرانی اور تورانی امراء کی باہمی کش مکش، مغربی قوتوں کا بتدریج ملک کی سیاسیات میں دخیل ہوتے چلے جانا، انگریزوں کا اقتدار بنگال اور مدراس کے بعض علاقوں پر قائم ہونا تقریباً یہ سارے واقعات شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں پیش آئے۔

(ش) ظاہر ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سب کی آخری زد دلّی پر پڑ رہی تھی جو شاہ ولی اللہ کا مستقر تھا، سوال یہی ہوتا ہے کہ جس دل و دماغ کے شاہ صاحب قدرتاً مالک تھے، کیا وہ ان واقعات سے متاثر نہیں ہو رہے تھے، اسی سوال کا جواب ایک خاص طرز سے اس مضمون میں دینے کی کوشش کی گئی ہے، اس سلسلہ میں علاوہ دیگر امور کے شاہ صاحب کے دو اہم خوابوں کا تذکرہ کیا جائے گا جن میں سے ایک کا تعلق ہندوستان کی اس فیصلہ کن جنگ سے ہے، جسے مرہٹہ اور ابدالی کی جنگ کہتے ہیں، اور دوسرے خواب کا تعلق شاہ صاحب کی ان علمی خدمات سے ہے جن کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان بحمد اللہ اس وقت تک مسلمان ہیں، اور ایسے مسلمان کہ شاید دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں سے ان کا دینی اور علمی پہلو اگر غالب نہیں تو مغلوب بھی نہیں ہے، مقصود صرف داستان گوئی نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ مشکلات کا حل جہاں دماغی اور جسمانی قوتوں میں تلاش کیا جاتا ہے کیا دل کی طاقتوں میں اس سلسلہ کی روشنی نہیں مل سکتی ہے، اور کیا اسی طرح اسلام کی خدمت تلوار کے ساتھ ساتھ قلم سے بھی ممکن ہے؟ شاہ ولی اللہ کی زندگی چونکہ ان سوالات کا اپنے اندر جواب رکھتی ہے، اسی لیے اس مقالہ

میں ایک خاص طرز سے ان کے خاص حالات مرتب کیے گئے ہیں، قرآن پاک میں طالوت کی بادشاہت و ''ملک'' کی علامت یہ پیش کی گئی ہے، کہ وہ بنی اسرائیل میں اس تابوت کو واپس لے آئیں گے جس میں اسرائیلیوں کی ''سکینت'' اور آل موسی وہارون کا ''بقیہ'' محفوظ ہے، شاہ ولی اللہ اوران کے خاندان والوں نے ہندی مسلمانوں میں قرآن وحدیث کے علم کو واپس لاکر اگر کوئی کام انجام دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو بھی ہندی اسلام کی تاریخ میں کوئی اہم مقام نہ عطا کیا جائے۔

بہرحال یہ اجمالی اشارات ہیں اب اصل مضمون کا مطالعہ کیجئے۔ واللہ يقول الحق وهو يهدي السبيل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و کفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ کل یَومٍ ھُوَ فی شَانَ.

(العزیز الرحیم)

ہر لحظہ جمالِ خود نوع دگر آرائی
شور دگر انگیزی شوق دگر افزائی

(العارف الجامیؒ)

ہر چڑھاؤ کے بعد اتار۔

یہی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، اور کیوں نہ ہو، جب کہ اس پیکرِ رحمت کی زبانِ مبارک سے بھی جو جمال آرائیوں کے ارتقاء کی رفتار کا منتہائے کمال تھا، (صلی اللہ علیہ وسلم)

"إني لأرى الفتن تقع في بيوتكم كوقع المطر" (١) (میں فتنوں کو دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں میں اس طرح برس رہے ہیں جیسے بارش برستی ہے)، کی ''خیر القرون'' کے کان میں آواز آئی تھی، اور جو سنایا گیا تھا، کیا ایمان والوں کو وہی دکھایا نہیں گیا؟ ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے آنگن سے تو اس فتنہ کا صرف بادل اٹھا تھا، لیکن ابوبکرؓ ہوں یا عمرؓ، علیؓ ہوں یا طلحہؓ، زبیرؓ ہوں یا انسانیت کے اس بہترین عہد کی کوئی اور ہستی، (رضوان اللہ علیہم) ان کے گھروں میں ان فتنوں کو مسلسل برستے ہوئے نہیں پایا گیا؟! پھر جب اس دنیا کی ریت یہی ہے کہ:

نہ گل از داغ غمت ست نہ بلبل در باغ
ہمہ رانعرہ زناں جامہ دراں می داری

(الحافظ الشیرازیؒ)

---

(١) صحیح بخاری۔

اور جب اس ابتلائی زندگی کے خیر سے شر کے عنصر کا جدا کرنا ناممکن ہے، تو بجائے

اپنی مرضی کے مطابق دہر کو کیوں کر کروں
مجھ کو بے حد غصہ آتا ہے مگر کس پر کروں
(اکبر)

کی بے معنی تلملاہٹ، رنج اور کڑھن کے .... ''اطمینان'' کے خیال سے ہٹ کر اطمینان کے میدان میں ''لیبلو کم أیکم أحسن عملاً'' (تاکہ ہم تمہیں جانچیں کہ اپنے اپنے کرداروں کی رُو سے کون تم میں سے اچھا ہے اور بھلا ہے) پڑھتے ہوئے ہم کیوں نہ اتر جائیں، اور یہاں کی ہر لحظہ کی ''شور انگیزیوں'' کو بجائے گھبرانے اور بھاگنے کے اپنی ''شوق افزائیوں'' کا ذریعہ کیوں نہ بنالیں، ہر ''شور'' پر نیا ''شیون'' پیدا ہونا بھی تو انسانی زندگی کی جان ہے، اگر ''شر'' کے وجود ہی کو ختم کر دیا جائے گا، تو ''خیر'' خواہوں اور ''خیر'' طلبوں کے لئے ''اجر و مزدوری'' کا استحقاق ہی کب باقی رہے گا، ''الشیطان'' کے وجود کو نگلنے والوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اس ملعون کے ہٹ جانے کے بعد انسان کی فطرت اب مقابلہ کس کا کرے گی؟ تم سے ٹکرا کر بلاشبہ وہ جہنم میں گرتا ہے، لیکن تم کو تو اس کی ٹکر جنت میں پہنچاتی ہے، بقا ہو یا ارتقاء اس دنیا میں دونوں کا یہی قانون ہے اور صرف یہی قانون ہے۔

چڑھاؤ کے بعد اتار اور عروج کے بعد زوال کا راز یہی ہے، ''تِلكَ الأیّامُ نُداوِلُها بین الناس'' (ان چند دنوں میں دنیاوی دولت وقوت کو ہم لوگوں میں چکر دیتے رہتے ہیں) کے ارشاد قرآنی کی یہی تفسیر ہے، اور سچی بات بھی یہی ہے، نجد کی وادی کا قیس ہی کیوں تنہا ٹھیکہ دار بنا رہے، اس وادی میں اترنے والے اترتے رہیں گے اور ''ہر کسے پنجہ زد و نوبت اوست'' کی نفیری پھونکتے ہوئے ''فی جنة عالیة'' کی بلند ٹیکری کی طرف چڑھتے ہوئے ''رضوان من اللہ أکبر'' کے ''مقام امین'' اور ''مقصد صدق'' تک پہنچتے چلے جائیں گے۔

الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کی انتہاء

چند دن ہوئے کہ ہندوستان کے ایک تجدیدی کارنامے کی داستان سنانے کی

سعادت میسر آئی تھی، بتایا گیا تھا کہ اخلاص و وفا اور صدق و صفا کے سوا جس ''فقیر بے نوا'' کے پاس قوت و طاقت کا کوئی سرمایہ نہ تھا، وہ اپنی کشکول گدائی کی اس ''بضاعة مزجاة'' کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، اور ایسا کھڑا ہوا کہ پھر اس وقت تک نہ بیٹھا، جب تک ملت و دین کی تجدید کی جس نہر کو وہ جاری کرنا چاہتا تھا وہ جاری نہ ہوگئی، وہ جاری ہوئی اور اس کے بعد بھی جاری کیا بلکہ اور بڑھتی رہی چڑھتی رہی، تا اینکہ ایک صدی بھی پوری نہ گزرنے پائی تھی کہ اس کی یہی تجدیدی نہر ایک بحرِ بیکراں کی شکل میں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی آفاق کے کناروں سے ٹکرانے لگی۔ جس مغل بادشاہ نے ''فقیہ'' کا ترجمہ بزور شمشیر ''احمق'' کیا تھا، خدا کی شان دیکھو کہ اسی کے تخت پر اسی کا حقیقی پوتا اس تجدیدی معرکہ کے بعد بیٹھتا ہے، اور قرآن و حدیث تو بڑی چیزیں ہیں، دینی و علمی حیثیت سے جس کا درجہ نسبتاً فروتر ہے، یعنی فقہ اور فقہاء جنہیں اس کے دادا نے اپنی آنکھوں سے گرایا تھا انہیں وہ اپنے سر بٹھاتا ہے، آخر کون نہیں جانتا کہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عہد میں ''فتاوی عالمگیری'' کے مدون کرانے کی خدمت انجام دلائی تھی۔

فتاوی عالمگیری کی تدوین وتالیف میں عالمگیر کی شرکت

اور یہ تو عوام میں مشہور ہے، ورنہ اصل واقعہ تو یہ ہے اکبر کا یہ پوتا فقہ کی اس کتاب کی تدوین میں عملی طور پر بذاتِ خود شریک تھا، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ''انفاس العارفین'' میں روای ہیں کہ:

''درآں ایام عالمگیر را تجمع و تدوین آں اہتمامے عظیم بود، ملا نظام ہر روز یک صفحہ پیش پادشاہ می خواندند'' (۱)

(ان دنوں میں عالمگیر کو اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں انتہا سے زیادہ اہتمام تھا، ملا نظام (افسر سررشتہ تدوین) روزانہ ایک صفحہ بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے تھے)۔

اس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ کتاب فتاوی عالمگیری اورنگ زیب کے

(۱) ص:۲۴۔

صرف حکم یا روپیہ کی امداد ہی سے مرتب نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس کی تدوین وتصحیح وترتیب میں بہ نفس نفیس خود بادشاہ بھی شریک تھا، علماء دن بھر مختلف کتابوں سے جزئیات اور مسائل کا انتخاب کرکے جب مرتب کر چکتے تو روز کا روز بادشاہ اسے سن لیتا تھا، کیا اس کا یہ سننا صرف بطور تبرک اور حصول ثواب کے تھا، شاہ صاحب نے اس کے بعد جو قصہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہر لفظ کے سمجھنے کے بعد آگے بڑھتا تھا، جو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی، اس پر بحث کرتا تھا، شاہ صاحب نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ شاہ عبدالرحیم شاہ ولی اللہ کے پدر بزرگوار نے فتاوی عالمگیری کے اس حصہ پر جوان کے ایک دوست ملا حامد کے سپرد تھا ایک حاشیہ لکھ دیا تھا، ملا نظام (جو صیغۂ تدوین کے افسر اعلی تھے) اور اپنے رفقاء کے کاموں کو روز بادشاہ کے سامنے پیش کیا کرتے تھے حسب دستور ملا حامد کے اس مسودہ کو سنا رہے تھے کہ شاہ عبدالرحیم والے حاشیہ پر پہنچے، ملا صاحب کو تو رَو میں خبر نہ ہوئی، عالمگیر جس توجہ سے عالمگیری کے مسودات کو سنتا تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حاشیہ والے زائد فقرے کا کان میں پہنچنا تھا اور ''این عبارت چیست'' کی آواز شاہی جلال کے ساتھ ملا نظام کے کان میں گونجی، پھر ہوش وحواس کو درست کرکے غور کرتے ہیں، جب بھی مطلب خبط ہی نظر آیا، حتی کہ اس وقت کچھ سمجھ میں نہ آیا۔(۱) خفیف ہوکر معذرت خواہ ہوئے اور بولے:

''ایں را مطالعہ نہ کردہ ام، فردا بتفصیل عرض خواہم کرد''

(اس مقام کا میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے کل تفصیل سے اس کا مطلب عرض کروں گا)۔

(۱) اور وہ سمجھ میں آتا کیا، اس لئے کہ واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ ملا حامد نے ایک ہی مسئلہ کے متعلق دو کتابوں کی دو متفرق عبارتوں کو جمع کرکے عبارت میں گنجلک پیدا کردی تھی، شاہ عبدالرحیم صاحب (والد حضرت شاہ ولی اللہ) کی نظر جب اس مقام پر پڑی، اصل کتابوں کو آپ نے دیکھا اور پیچیدگی کے منشاء سے واقف ہونے کے بعد مسودہ کے حاشیہ پر یہ عبارت لکھ دی من لم یتفقہ' فی الدین قد خلط فیه، هذا غلط وصوابه کذا۔ یعنی دین کی سمجھ جو نہیں رکھتا، اس نے یہاں گڑبڑ کردی، صحیح یوں ہے۔

عالمگیری کارناموں میں مجددی اشارات کا دخل

افسوس کہ الف ثانی کے تجدیدی کارنامہ کی تفصیل کا آئندہ پھر موقعہ نہ مل سکا، ورنہ تاریخی حقائق کی روشنی میں بتادیا جاتا کہ عالمگیری تحریکات ومجاہدات میں حضرت مجدد کے فرزند مولانا شاہ معصوم کے وہ مکاتیب ہی پڑھ لئے جائیں جو مطبوعہ ہیں، تو ان سے بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ عالمگیر کے دنیاوی مہمات حتی کہ جنگی اور سیاسی کارناموں میں بھی شاہ معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے مشوروں بلکہ حکم کو کتنا دخل ہے، انشاء اللہ تعالی جب کبھی اس مضمون کی تکمیل کا موقع میسر آئے گا اس وقت اس مسئلہ کو بھی روشن کیا جائے گا، اسی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ ''فتاوی عالمگیری'' اور اس کی تدوین کا بادشاہ کو اتنا عظیم اہتمام بھی حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی کوششوں ہی کا ایک ثمرہ ہے، غالباً فقہ اور فقہ کی کتابوں میں یہ خصوصیت صرف فتاوی عالمگیری ہی کو حاصل ہے کہ اس سلنطت کبری (گریٹ امپائر) کا سب سے بڑا مطلق العنان بادشاہ اس کی تدوین وتالیف میں خود شریک رہا، یوں سمجھنا چاہئے کہ جس تجدیدی عمل کی ابتداء جہانگیر سے ہوئی تھی اس کے عروج کا انتہائی کمال عالمگیر کی ذات پر ہوا، اور نسل ہا نسل سے تخت وتاج اورنگ کی ودیہم کے آغوش میں جس نے پرورش پائی ہو، تجدیدی عمل کے زور کو دیکھو کہ ایسے تلوار کے دھنی کے ہاتھ میں اس لئے قلم پکڑوایا گیا کہ فلسفہ اور تفسیر وحدیث وغیرہ کے متعلق بھی نہیں بلکہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، بیع وشری اور طلاق ونکاح کے خشک فقہی مسائل کی ترتیب میں خود شریک ہو، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دین کو اعزاز کا آخر اس سے بھی زیادہ بلند ترین مقام اور کیا مل سکتا تھا، قرآن لکھ کر اگر عالمگیر روز کا آذوقہ مہیا کرتا تھا تو اس کی نظیر تاریخ سے مفقود نہ تھی، اسی دلّی کے تخت پر نصیر الدین محمود بادشاہ اسی شان اور اسی التزام کے ساتھ سنا جاتا ہے کہ بیٹھا تھا، لیکن فقہ جیسے غیر دلچسپ، دقیق وپیچیدہ علم کے ساتھ بادشاہ کی یہ دلچسپی میرے نزدیک دینی عزت کا آخری زینہ تھا۔

عروج کے بعد نزول

اب اگر اس عروج کے بعد کسی نزول کی پیشین گوئی کی جاتی تو تاریخ کے اوراق اس کی شہادت ادا کر سکتے تھے، دنیا کے پچھلے تجربوں سے اس کی توثیق ہو سکتی تھی، جیسا کہ میں نے تمہید میں اشارہ کیا ہے کہ جمال کی تجلیوں کا جب کبھی ابتلائی حیات کے کسی عبوری دور میں اتنا زور بندھا ہے تو تاڑنے والوں نے اس کے بعد ''جلال'' کے مظاہرہ کا ہمیشہ انتظار کیا ہے۔ اور دنیا جانتی ہے کہ عالمگیر کی رحلت کے بعد ہی دوسرے رخ کا آغاز شروع ہو گیا تھا، ''شورانگیزیوں'' کی ساکن سطح میں پھر جنبش شروع ہوئی...... اور ع

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

کے غیبی نقیبوں نے صلائے عام دینا شروع کیا۔

وہی دلّی جہاں کابل سے آسام اور نیپال سے ساحل سمندر تک کی زمین اور اس کے باشندوں کے تنہا مالک کو دیکھا گیا تھا کہ وہ مبسوط سرخسی، حاوی قدسی، مضمرات تاتارخانیہ وغیرہ فقہی کتابوں کی عبارتوں کا سننا اپنے لئے زاد آخرت قرار دے رہا تھا، اسلام کے کلیات اور اساسی امور ہی نے نہیں بلکہ ان کتابوں کی جزئیات بعیدہ نے بھی عزت واحترام کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

وہی دلّی ہے، دلّی کا لال قلعہ ہے، لال قلعہ بابری و تیموری نسل کے بچوں سے ابھی خالی نہیں ہوا ہے، اسی دلّی کا سب سے بڑا امام بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا مسلّم الکل پیشوا اسی دلّی میں بیٹھا ہوا روتا ہے، اسلام پر روتا ہے، مسلمانوں پر روتا ہے اور ان کی کھوئی ہوئی عظمتِ رفتہ پر روتا ہے۔

میری مراد شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز سے ہے، اپنے چچا حضرت شاہ اہل اللہ کے نام عربی میں چند خطوط آپ نے لکھے ہیں، غالباً کسی مصلحت سے اس زمانہ کے تاثرات اور اپنے احساسات کا اظہار عربی نظم کی صورت میں فرماتے ہیں، میں ان نظموں کے چند اشعار بقدر ضرورت حاصل معنی کے ساتھ یہاں نقل کرتا ہوں، فرماتے ہیں:

شاہ عبدالعزیز کے خونیں آنسو یا نالہائے نیم شبی

جزی الله عنا قوم سکه و مرهت	عقوبة شر عاجلاً غیر آجلِ
اللہ سکھ اور مرہٹہ کی قوم کو ہماری طرف سے بدلہ چکھائے	بہت برا بدلہ اور جلد چکھائے
لقد قتلوا جمعاً کثیراً من الوری	وقد أوجعوا فی أهل شاء وجاهل
ان دونوں نے بہت سی اللہ کی مخلوق کو قتل کیا	اور بیچارے گڈریوں جاہلوں کو بھی انہوں نے دکھ پہنچایا
لهم کل عام نهضة فی بلادنا	یخوضون فنیا بالضحی والأصائل
ہماری بستیوں اور آبادیوں پر ہر سال لوٹ مار مچاتے ہیں	اور ہمارے علاقوں میں یہ دن دہاڑے اور شام کو پہنچتے ہیں
فهل هنا من معاذ لعائذ	وهل من مغیث یتقی الله عادل
پھر کیا پناہ لینے والوں کیلئے یہاں کوئی جائے پناہ ہے؟	اور ہے کوئی ایسا فریادرس جو اللہ سے ڈرتا ہو اور انصاف کر سکتا ہو

ایک اور دوسرے خط میں جو ان ہی شاہ اہل اللہ کے نام ہے، فرماتے ہیں:

أیام برد أتت فالقلب منجزع	من قوم سکه وإن الخوف معقول
سردیوں کا موسم آ گیا اور دل پریشان ہے	سکھ قوم سے اور دل کا یہ اندیشہ معقول ہے
أنفاهم الله عن هذا الدیار فانهم	شر الأعادی وهم من جنة غول
خدا اس ملک سے ان کو ناپید فرمائے	یہ بدترین دشمن ہیں اور خود یہ غول بیابانی ہیں
فوضت أمری وأمر الناس أجمعهم	إلی الله وأن الحفظ مامول
میں اپنے اور لوگوں کے معاملہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں	اور اللہ سے امید ہے کہ وہ حفاظت فرمائے گا

ایک تیسرے خط کے چند اشعار یہ ہیں:

ثم إن البلاد فاسدة	عن أیادی الغشوم والظلام
پھر معلوم ہو کہ ملک تباہ وبرباد ہے	ظالموں اور بدمعاشوں کے ہاتھ سے
غیر خاف علیك ما صنعت	قوم سکه بجانب التوشام (۱)

(۱) توشام حصار (پنجاب) کے ایک تعلقہ کا نام ہے۔

آپ پر غالباً مخفی نہ ہوگا جو کچھ کیا   سکھ قوم نے توشام علاقے میں

خفضوا کل قریة ومضوا   یفتحون الحصون والاوطام

ہر بستی کو انہوں نے پست کر دیا اور گذر گئے   قلعے اور گڑھیاں فتح کرتے پھرتے ہیں

ضیعوا أمة من الأرواح   قتلوا أمة من الأجسام

ایک گروہ کی جان انہوں نے ضائع کی   اور ایک طبقہ کے اجسام کو انہوں نے قتل کیا

نهموا عدة من الأموال   أوثقوا عدة من الأيتام

مال اندوزی کے بھوکے ہیں   اور ہمارے کتنے یتیموں کو انہوں نے قید وبند کیا

وسقوا كل من تعرضهم   من فئام الأنام كأس الحمام

اسی کو پلا دیتے ہیں موت کا پیالہ   جو انسانوں کے گروہ میں سے ان کی راہ میں آڑے آئے

ذهلت كل مرضع عما   أرضعته، وكل ذات فطام

(آج) ہر دودھ پلانے والی اس بچہ کو بھول چکی ہے   جسے دودھ پلاتی تھی اور ان کو بھی جو دودھ چھوڑ چکے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز نے اپنے اشعار میں ہندوستان کے جن سیاسی حالات کی طرف اشارہ فرمایا ہے، تاریخ کی کتابیں ان کی تفصیلات سے معمور ہیں اور آئندہ بقدر ضرورت میں ان کا ذکر بھی کروں گا، لیکن قصداً اس سلسلہ میں، میں نے حضرت شاہ صاحب کی شہادت اس لئے پیش کی ہے تاکہ ایک عام غلط فہمی جو پھیلی ہوئی ہے کہ علماء وصوفیاء کو ملک کے سیاسیات سے کوئی تعلق نہ تھا اس کا ازالہ ہوسکے، یہ صحیح ہے کہ ہمارے اسلاف کی خصوصاً اپنی تالیفات وتصنیفات میں یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہتے تھے اسی کو لکھتے تھے، بیچ بیچ میں اپنے زمانہ کے سیاسی جھگڑوں کا دکھڑا لے کر نہ بیٹھ جاتے تھے اور غالباً غلط فہمی کا منشا بھی یہی ہے، آخر یہی شاہ ولی اللہ ہیں، بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کے مؤلفات کے دفاتر وطوامیر ہزار ہا صفحات سے متجاوز ہیں، لیکن بجز ''انفاس العارفین'' کے جس میں آپ نے اپنے آباؤ اجداد کے کچھ حالات درج کئے ہیں اور اس سلسلہ میں بلا ارادہ کہیں کہیں بعض

سیاسی حالات کا بھی اجمالاً ذکر آ گیا ہے، مگر اس کے سوا آپ کی کسی چھوٹی بڑی کتاب سے بمشکل اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ وہی کتابیں ہیں جو اس وقت لکھی گئیں جب نادر شاہ اپنی بے پناہ تلوار سے چاندنی چوک کی نہروں میں بجائے جمنا کے پانی کے انسانوں کا خون بہا رہا تھا، فتحپوری کی مسجد زمین سے چھت تک لاشوں سے پٹی ہوئی تھی، قاضی کا حوض اور دلّی کے عام کنوئیں صرف مردوں سے بھرے ہوئے تھے، سڑی ہوئی لاشوں سے پاک کرنے کے لئے دلّی کے ہر ناکہ پر الاؤ جوڑا گیا تھا، جس میں ہندو ہو یا مسلمان سب کی میت بلا امتیاز جھونکی جارہی تھی اور یہی ایک واقعہ کیا، مرحوم اورنگ زیب کے بعد دلّی کے آسمان نے جن جانگداز روح گسل واقعات کا تماشا کیا تھا اس سے کون واقف نہیں ہے۔

دلّی کے خونیں فتنے اور شاہ ولی اللہ کی استقامت

لیکن دیکھتے ہو! دھن کے پکوں کی اس شان کو دیکھتے ہو بادشاہوں پر بادشاہتیں گذرتی چلی جاتی ہیں، انقلاب پر انقلاب ہوتا چلا جارہا ہے، قومیں، قوموں پر چڑھی جارہی ہیں، فتنوں کا ہر طرف زور ہے، فساد کا ہر طرف شور ہے، لیکن اللہ کے کچھ بندے ہیں جو سب کچھ دیکھتے ہیں، سب کچھ سنتے ہیں، سب سے متاثر ہوتے ہیں اور ہر مشکل کے حل کا ساز وسامان بھی اندر اندر تیار کرتے چلے جاتے ہیں لیکن ؎

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد وآواز نیامد

نہ ان کی زبانوں پر آسمانوں کو ہلانے والی تقریریں ہیں، نہ آنکھوں سے جُھوٹے آنسوؤں کا سیلاب بہایا جارہا ہے، نہ ریزولیوشنوں کے بم سے دشمنوں کے حصار پر گولہ باری کر کے فتح کے شادیانے بجائے جارہے ہیں نہ مخالفوں کی بے سروپا تجویزوں یا مشہور کئے ہوئے منصوبوں کو سن سن کر ان کا زہر آب ہوا جاتا ہے، وہمی اندیشوں میں مبتلا ہو کر نہ ڈراؤنے

خواب خود دیکھتے ہیں نہ دوسروں کو دکھاتے ہیں، نہ لا یعنی بے معنی مشوروں سے مسلمانوں کو کبھی خیبر اور بولان کے درّوں کی طرف بھگاتے ہیں۔

جس قوم کا فرض صرف آگے بڑھنا اور آگے بڑھتے ہی چلے جانا ہے، نہ ان میں بزدلی اور جبن کے جذبات کی پرورش کر کے مورچوں کے چھوڑنے کا بگل بجاتے ہیں، نہ صرف پیٹ کی روٹی اور تن کے چیتھڑوں کو بچا لینے کے لئے اللہ کی مسجدوں کو، بزرگوں کے مآثر کو، آبا وٴ اجداد کے مقابر کو، کفار کے مویشیوں کا گوسالہ بنانے پر اپنے کو راضی کرتے ہیں، کفر کی جن نسلوں کے متعلق امید تھی کہ آج نہیں تو کل جہنم کی آگ سے ان کو بچا لینے میں ہم کامیاب ہوں گے، قیامت تک کے لئے ان پر ایمان کا دروازہ بند کر کے ہم اس لئے بھاگے جا رہے ہیں کہ جس طرح بے کتاب و بے پیغمبر زندگی گذارنے والی قوموں کے سامنے روٹی کے چند ٹکڑوں کا سوال ہے اور اسی کا حل زندگی کے سارے معموں کا حل ہے، ہم بھی کوئی ایسا کونہ زمین کے کسی حصہ پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں جہاں ہمارے لقموں پر دوسری قوموں کے غرّانے والے دکھائی نہ دیں (۱)۔ ہڈیوں پر اگر ہم لڑیں بھی تو آپس ہی میں لڑیں، ایک لے دے کر اب ''فرشتہ صید''، ''پیمبر شکار''، ''یزداں گیر'' کے ''شاہین بچوں'' کو اسی ''مردار پیٹ'' کے مسئلہ پر قناعت کر لینے کا مشورہ دیا جا رہا ہے ''معاشی مشکلات'' کی افیم کھلا کر ان پر غنودگی طاری کی

(۱) اور مشاہدہ کہو یا تجربہ، وہ تو بتا رہا ہے کہ ان ''شکم پروروں''، ''نان پرستوں'' کو اگر کسی جگہ کوئی عافیت کا ایسا گوشہ کسی شکل میں میسر آ گیا ہے تو وہاں انہوں نے پھر محمد رسول اللہ ﷺ کے اسلام اور قرآن کی ہدایتوں کو بالکل بھلا دیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد اور قرآن اسلام اور مسلمان کے الفاظ صرف اس وقت تک استعمال کرتے ہیں جب تک روٹی کپڑے کے دوسرے دعویداروں کے مقابلہ میں ان ہی الفاظ سے چند لقموں کو اپنے پیٹ تک سرکانے میں یہ کامیاب ہو سکتے ہیں، لیکن جہاں اس مقابلہ کا خوف نکلا، دیکھا جاتا ہے کہ پھر ان کے مسحور دماغ اس کھیل کو عافیت کے ان گوشوں میں کھیلنا چاہتے ہیں جو ان کا مداری ان سے کھلوانا چاہتا ہے، وہی پردہ کی مخالفت، وہی مخلوط تعلیم، وہی رقص و سرود، وہی مے خواری و قمار بازی، سودی کاروبار وغیرہ کا جنون ان پر سوار ہو جاتا ہے۔

جا رہی ہے، ان نوجوانوں کو کون سمجھا سکتا ہے، جنہیں بجائے اپنے اسلام کے اہل کفر کے بزرگوں پر ایمان لانے کی خود ہمارے گھر کے لوگ دعوت دے رہے ہیں، آج کیا وقت آیا ہے، اس سے پہلے جو گھڑیاں گذر چکی ہیں، ان کے مقابلہ میں سچ تو یہ ہے کہ ابھی کچھ نہیں ہوا ہے، لیکن ہمارے باپ دادوں کا شیوہ بولنے کا نہیں کرنے کا تھا۔ محض اس لئے کہ وہ بولے نہیں، تم غلط سمجھتے ہو اگر سمجھتے ہو کہ ان کو ان ضرورتوں کا احساس نہ تھا، جو چیز کردار میں تلاش کی جاتی ہے، تم سے غلطی ہو رہی ہے کہ اسے گفتار میں ڈھونڈتے ہو، باتوں کی پیچیدگیاں باتوں سے حل ہو سکتی ہیں لیکن کام کی دشواریاں بجائے کام کے صرف باتوں سے حل ہوں، یہ اس زمانے کا دستور نہ تھا، ان کے کاموں کا جائزہ لینا چاہتے ہو تو بجائے باتوں کے ان کے کاموں سے ہی تمہیں اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے سامنے کیا تھا اور اس کے لئے انہوں کیا کیا، بقول شخصے:

اے دل طریق رندی از محتسب بیاموز
مست سب دور حق اورا کس ایں گماں
ندارد

بہر حال حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی چونکہ میں بجائے ان کی باتوں کے ان کے کام ہی کے ایک پہلو کو پیش کرنا چاہتا ہوں، اس لئے ظاہر ہے کہ ان کے اقوال کی جگہ میں بھی آپ کے سامنے ان کے اعمال کا ایک سرسری خاکہ پیش کروں گا اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے اقوال بھی پیش کرنا چاہتا ہوں، تو ''پروانہ سوختہ'' کی راکھ سے میں ان چھچھوں کا ریکارڈ کیسے تیار کر سکتا ہوں جو صرف ''مرغ سحر'' کے سوانح نگاروں کو مل سکتے ہیں، لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آئندہ اپنے جس دعوی کو پیش کرنا چاہتا ہوں اگر بجائے آثاری شہادتوں کے صرف تحریری شہادتوں کا مجھ سے مطالبہ کیا جائے تو اس مطالبہ سے عہدہ برآ ہونا شاید میرے لئے آسان نہ ہو، اگرچہ بڑی تلاش و تنقیر سے بعض جستہ جستہ چیزیں ان کی طویل الذیل تصنیفات میں ملی ہیں اور انہیں گو میں آئندہ پیش بھی کروں گا، مگر حضرت مجددؒ کے تجدیدی کارناموں کے کمال کے بعد جس زوال سے شاہ صاحب کو سابقہ پڑا ہے، قبل

اس کے کہ عام تاریخی مواد اس کے متعلق پیش کروں، میں نے براہِ راست ولی اللّٰہی گھرانے کے ایک مشہور بزرگ بلکہ براہ راست بڑے صاحب زادے کی گواہی سے اسی لئے آغاز کیا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ میں آئندہ حضرت شاہ صاحب کی طرف جن دینی وملی احساسات کو منسوب کروں گا وہ محض میرا اختراعی نظریہ نہیں ہے یا منطق کی اصطلاح میں دو اتفاقی قضیوں میں لزوم کے تعلق کو محض میرے حسنِ ظن نے نہیں پیدا کر دیا ہے۔

آخر اندازہ کرنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس باپ کا بیٹا، بیٹا ہی نہیں بلکہ جانشین خلیفہ اور کیسا جانشین خلیفہ سمتاً دولاً وہدیاً جو ہُو بہو اس کا ثنی تھا، جب وہ اپنے سیاسی ماحول سے اس طرح متاثر تھا تو یہ کتنی بڑی غباوت ہوگی کہ حضرت شاہ ولی اللہ جیسے ذکی الحس، بیدار شعور، دقیقہ رس، نکتہ سنج، ژرف نگاہ باپ کے سینہ کو ان جذبات سے محض اس لئے خالی فرض کیا جائے کہ ان کی عام کتابوں میں ان احساسات کا سراغ نہیں ملتا، حالانکہ واقعتاً یہ بھی غلط ہے، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، لیکن منجملہ اور چیزوں کے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے یہ چند اشعار بھی اپنے اندر اس کی قوی شہادت رکھتے ہیں کہ ''اسلامی ایوان'' میں عہد عالمگیری کے بعد جو آگ لگی تھی، اس میں جن جن کے کلیجے بُھنے تھے اور جن جن کے سینے آبلوں سے معمور ہوگئے، اس میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان بھی تھا، اور شاید یہی آبلے تھے جو ''اسماعیلی'' جہاد کے رنگ میں پھوٹ کر بالآخر بہہ گئے، اگرچہ اس ''جہاد'' کی روشنی پر پردہ ڈال دیا گیا تھا، لیکن خدا جزائے خیر دے برادر عزیز محترم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کو جنہوں نے بزور اس پردہ کو ''سیرت سید احمد شہید'' لکھ کر حال ہی میں چاک کیا ہے، گو میں نہیں جانتا کہ جن لوگوں نے طے کر لیا ہے کہ بزرگوں کی روشنی کو نہیں دیکھیں گے اور جو قدم بھی اٹھائیں گے وہ مغربی لیمپ یا ہندی ڈیوٹ ہی کی روشنی میں اٹھائیں گے، ان کی نظر بھی اس مینار پر پڑی یا نہیں؟

یا للعجب! ''کنتم شهدآء علی الناس'' .سارے جہان کے انسانوں کی نگرانی

جس کے سپرد کی گئی اور جن کے وجود کا ''أخرجت للناس'' طرۂ امتیاز تھا، آج وہی اپنی ہر حرکت وسکون میں غیروں کی طرف تاکتے ہیں، اپنے کو بے بس پا رہے ہیں، حالانکہ ان کو جو مرکزی قبلہ، مرکزی نبی، مرکزی کتاب دی گئی تھی، اسی سے اندازہ کرتے کہ اب سب کو ہمارے ساتھ وابستہ ہو کر جینا ہے، لیکن انہوں نے، ان کے ''چلانے والوں'' نے تو طے کر لیا ہے کہ وہی دوسروں کی کمر پکڑ کر جئیں گے، اس کے سوا زندگی کی ساری راہیں ان پر مسدود ہو چکی ہیں .... و أضل أعمالهم.

عالمگیر کے بعد فتنوں کا آغاز

خیر میں کدھر نکلا جا رہا ہوں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ اورنگ زیبی عہد کے ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا گذر رہی تھی، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تو ان واقعات کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے، اس اجمال کی تھوڑی تفصیل پہلے کر لینا چاہتا ہوں۔

سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک

اتنا تو ان اشعار سے بھی معلوم ہوا اور تقریباً سب ہی جانتے ہیں کہ عالمگیر کے بعد ہی ایک تحریک ہندوستان کے شمال مغربی خطوں میں ''سکھ تحریک'' کے نام سے اور دوسری تحریک جنوبی ہند میں ''مرہٹہ'' یا ''شیواجی'' کی تحریک کے نام سے اٹھی تھی اور ثانی الذکر تحریک کا صرف آغاز ہی نہیں بلکہ ایک حد تک اشتداد، عالمگیر ہی کے زمانہ میں ہو چکا تھا، اسی کے ساتھ اجمالی طور پر لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دونوں تحریکیں سیاسی تھیں، اور ان دونوں کا رخ اسلام اور مسلمانوں کی طرف تھا، لیکن اگر قرآنی لہجہ میں پوچھا جائے کہ " المرهٹه وما أدراك ما المرهٹه؟" یا "السکه وما أدراك ما السکه؟" تو شاید اس سوال کے جواب کی جو واقعی ہیبت ناک، زلزلہ افگن ہوش ربا تصویر ہے وہ شاید ہی اس زمانہ کے مسلمانوں کے سامنے ہو!

چونکہ ان واقعات یا ان کے سوا بھی میں اور جن چیزوں کو پیش کر رہا ہوں ان سے خود

ان واقعات کا تذکرہ مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے قلبی واردات کا حال یہ ہے کہ باوجود شاعر نہ ہونے کے جب اپنے باطنی احساسات سے مضطرب ہوتے تھے تو اس وقت بے ساختہ ان کی زبان یا قلم کی شورانگیزیاں ان اشعار کی صورت اختیار کرتی تھیں:

بہ زلف پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خودرا	خروشِ درددل شبہا نمی کردم چہ می کردم
دلے پردرد، جان افگار، یارِ تند خودارم	جہاں را پر زیاری ہا نمی کردم چہ می کردم

آخر میں آپ کا مشہور مصرعہ ہے:

''جنوں ترک منصبہا نمی کردم چہ می کردم''

تو اس وقت جب کہ ہر معمولی سواد خواں اعتصام الدولہ، صمصام الملک خان دوراں اور امیر الأمراء بن بن کر عزت وجلال کے اوج پر چمک رہا تھا، شاہ صاحب بقول خود کسی ''جنون'' میں مبتلا ہو کر سب پر لات مار کر اپنا عذر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''جنون ترکِ منصبہا نمی کردم چہ می کردم''

جلال کی جن تجلیوں کا تماشا فرما رہے تھے، ان ہی کو پیشِ نظر رکھ کر فرماتے ہیں:

جہان وجاں فدائے وضعِ شوخِ شہر آشوب
قیامت می نمائی ودمِ عیسیٰ ومرہم ہم (۱)

(۱) [یہ دوسری غزل کا مصرعہ ہے، شاید دونوں غزلوں کے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے مصنف کو اشتباہ ہو گیا ہے، دونوں غزلیں بہت پر اثر اور سوز وگداز میں ڈوبی ہوئی ہیں اس لئے فارسی زبان کے باذوق قارئین کی نذر کی جارہی ہیں:

بزلف پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خودرا	خروش درد دل شبہا نمی کردم چہ می کردم
دل پر درد جان افگار یار تند خودارم	جہاں را پر زیاری ہا نمی کردم چہ می کردم
غم تحصیل وبارشغل ودرد غزل می بینم	جنون ترک منصبہا نمی کردم چہ می کردم
کسے با مل ہمیں سازد کسے با گل ہمیں سازد	اگر من یاد آن لب ہا نمی کردم چہ می کردم

غور کرنا چاہئے ایک ایسے وارفتہ ومستِ الست کے متعلق یہ خیال کرنا کہ جس طرح بہت سے لوگ جو محض اس لئے کہ لکھنا جانتے ہیں، کتابیں لکھتے ہیں، اسی زمرہ میں شاہ صاحب یا شاہ صاحب کی تالیفی وتعلیمی خدمات کو شمار کرنا کم از کم میرے نزدیک ''واقعات'' کے عدم احساس ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے ورنہ سچ یہ ہے کہ اس گروہ کو جس کا سب سے بڑا کام صرف لکھنا ہے اس کو ان دل باختوں، سوختہ سامانوں سے کیا نسبت؟ جنہوں نے کسی بڑے کام کے لکھنے کا پیشہ اختیار کیا، ٹھیک جو حال مولانا روم کا ہے، جن کا کام شاعری نہ تھا، لیکن ایک کام کے لئے انہوں نے شاعری کا لبادہ اوڑھ لیا تھا، میرے نزدیک حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے تمام مساعی کا مرکزی نقطہ بھی یہی تھا، اور آئندہ آپ کے سامنے اسی نظریہ کی کچھ تفصیل پیش کی جائے گی، اسی لئے پہلے ان حالات کو پیش کرتا ہوں، جن میں حضرت شاہ صاحب گھِر گئے تھے، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ عہد عالمگیری کے بعد سب سے بڑے فتنے دو تھے، جن میں ایک کا مرکز پنجاب اور دوسرے کا منشاء ومولد جنوبی ہند کا وہ ساحلی علاقہ تھا جسے عموماً کوکن یا مرہٹواڑی کہتے ہیں، میں پہلے فتنۂ سکھ کا اجمالاً ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

مئے تحقیق را از خم مشرب ہا بروں دیدم	خروج از قید مشربہا نمی کردم چہ می کردم
حجاب وصل مطلوب ست دل بستن بمطلبہا	امیں گر ترک مطلبہا نمی کردم چہ می کردم

دوسری غزل

دوائے درد من بر جمع اضداد تو می نازم	نمک ریز دل مجروح من ہستی ومرہم ہم
جہان وجاں فدائے وضع شوخ شہر آشوبت	قیامت می نمائی ودم عیسیٰ ومرہم ہم
توئی اول توئی آخر توئی ظاہر توئی باطن	توئی مقصود اہل دل توئی مشتاق وہمدم ہم
زیک منبع دریں جا مختلف فوارہ می جوشد	مزاج حرص قاروں، زہد ابراہیم او ہم ہم
بخارے از زمیں خیزد بباد جو درآمیزد	گہے باران ریزان ست وگاہے برف وشبنم ہم
کدامی طرفۂ نیرنگی کاشانہ سرداری	کہ عالم ہائے کوب از دست عشقت گشت وآدم ہم

منقول از ''حیات ولی''، مولوی رحیم بخش دہلوی ص ۲۷۶۔۲۷۷ مطبوعہ افضل المطابع دہلی]

پنجاب کی جدید خاکسار تحریک اور قدیم سکھ تحریک میں وجوہ مماثلت

یہ عجیب بات ہے کہ ٹھیک جس طرح پچھلے چندسالوں میں پنجاب ہی کی سرزمین سے ایک تحریک اٹھی جس کے آغاز میں یہ ظاہر کیا گیا کہ ''مذہب'' کے سمجھنے میں لوگوں کو جو غلطی ہوئی ہے، محض اس کی اصلاح مقصود ہے اور اس سلسلہ میں آج تک تیرہ سو برس سے قرآن کا جو مطلب مسلمان سمجھتے تھے وہ وبالکلیہ الٹ دیا گیا، بہرحال ابتداء جس طرح یہ ایک مذہبی اصلاحی تحریک تھی لیکن چند ہی دنوں میں صاحب تحریک نے آہستہ آہستہ چولا بدلنا شروع کیا، ایک آہنی اوزار(۱) کو مذہبی شعار کا رنگ عطا کر کے ماننے والوں کو مسلح کیا گیا، پھر روپیہ کے ساتھ ساتھ چند دن میں گھوڑے، خیمے، دریاں وصول ہونے لگیں اور بالآخر اچانک اس تحریک کا رخ ''سیاست'' کی طرف پلٹ گیا، حتی کہ خون وقتال کی گرم بازاریاں بھی شروع ہوگئیں، ''غزاۃ'' اور ''شہداء'' کی فہرستیں بننے لگیں۔

قریب قریب کچھ اسی شکل کے ساتھ پنجاب ہی سے ''سکھ تحریک'' کا آغاز ہوا تھا، مفصل حال تو کتب تاریخ سے معلوم ہوگا یہاں صرف اتنا معلوم کر لینا بس کافی ہے کہ ایک لڑکا جسکے متعلق مصنف سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ:

''پدرش بقالے از قوم کھتری بود، در عہد طفلی حُسنے وصباحتے باندک استعداد لیاقتے خداداد داشت''(۲)

(اس کا باپ سبزی فروش ہندوؤں کے چھتری طبقۂ سے تعلق رکھتا تھا، بچپن میں بڑا حسین تھا اور خداداد ذہانت کا مالک تھا)۔

چونکہ اس حسین وصبیح لڑکے کی طرف پنجاب کے ایک صوفی منش بزرگ سید حسن نظامی کی نظر خاص تھی، ''براو نظر توجہ داشت'' اس لئے:

---

(۱) بیلچہ۔

(۲) سیر المتاخرین، ج ۲/ص ۴۰۱۔

''بہ فیضِ صحبت درویش حقیقت کیش فی الجملہ شعور ودانش بہم رسانیدہ وبرحقائق ومعارف کہ کتب فقرائے اسلام وصوفیہ ذوالاحترام بآں مشحون است اطلاعے حاصل نمود''۔

(درویشوں کے فیض صحبت سے اس میں شعور ودانشمندی پیدا ہوئی، ان حقائق ومعارف سے جن سے فقراء وصوفیاء اسلام کی کتابیں پر آگاہی حاصل کی)۔

اور اسی وجہ سے:

''از کیشِ آبائی خود درگزشتہ مضامین اقوال آں بزرگواراں بزبان پنجابی کہ داشت دربحور اشعار ہندی موزوں می نمود''۔

(اور اپنے آبائی طریقہ سے صرف نظر کر کے ان بزرگوں کے اقوال کو ہندی بحروں میں پنجابی زبان میں ڈھال دیا)۔

آخر ان ہی اشعار نے ''گرنتھ'' کے نام سے ایک مذہبی کتاب کی شکل اختیار کی اور اس کے یہ مبلغ ''گرونانک'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

تو جس طرح گویا پنجاب کی موجودہ تحریک جیسے عہد حاضر کی قوت حاکمہ کے ادبیات سے متاثر ہو کر ابتداء مذہبی رنگ میں شروع ہوئی ہے، اسی طرح پنجاب کی پہلی تحریک بھی اس زمانہ کی قوت حاکمہ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر ابتداء مذہبی ہی رنگ میں جاری ہوئی تھی....... البتہ موجودہ تحریک کے محرک اول ہی نے اپنے ہی زمانے میں اس کا رخ سیاست کی طرف پھیر دیا، لیکن پہلی تحریک نے محرکِ اول کے چند جانشینوں کے بعد اچانک سیاسی کروٹ لی۔

سکھ تحریک کی سیاسی کروٹ اور اس کے فروغ کے اسباب

ایسا کیوں ہوا اور کن اسباب کے تحت ہوا، اس کا قصہ تو طویل ہے، لیکن اسی زمانہ میں جب حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہو چکے تھے، پنجاب کی یہ مذہبی تحریک مشہور گوروگوبند کی کوششوں سے سیاسی رنگ اختیار کر چکی تھی، اپنی مذہبی تحریک کو سیاسی رنگ دینے کے لئے گوروگوبند نے بھی وہی کیا جو پنجاب کی موجودہ تحریک میں کیا گیا یا کیا جا رہا ہے، صاحب سیر المتاخرین لکھتے ہیں:

"گورگوبند بجائے پدر خود تیغ بہادر (۱) نشستہ منتشرانہ فرقہ خودرا آہستہ آہستہ جمع نمودواسلاح واسپ ویراق بہم رسانیدہ وبرہمراہیان خود قسمت کردہ واندک اندک دست وپائے خوددراز وشروع تگ وتازنمود" (۲)

(گوربند نے باپ تیغ بہادر کی جگہ بیٹھ کر اپنے فرقہ کے پراگندہ اور منتشر افراد کو آہستہ آہستہ اکٹھا کرنا شروع کیا اور ہتھیار، گھوڑے اور دوسرے جنگی سازوسامان بھی فراہم کئے اور اپنے رفقاپر سب کو تقسیم کرنے لگا، یوں تھوڑا تھوڑا کر کے اس نے اپنے پاؤں نکالنے شروع کئے اور دوڑ دھوپ کی ابتدا کی)۔

بہرحال گوروگوبند کے ساتھ تو "بموجب فرمان بادشاہ فوج داران حضور بتادیب او پرداختند" (۳) لیکن گوبند کا جانشین جب بندانامی گروہوا، اوراس وقت حضرت شاہ صاحب جوان ہو چکے تھے، اس نے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا ان چند الفاظ سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے:

گروگوبند کے زیر قیادت سکھوں کی چیرہ دستیاں اور لرزہ خیز مظالم

"بردہات وآبادی اہل اسلام ہر جادست اورسید تاختہ، ازسکنہ ایں جاہر کرامی یافت

---

(۱) تیغ بہادر کے متعلق طباطبائی نے عجیب بات لکھی ہے کہ "شیوۂ اخذ بجبر وتعدی اختیار نمودہ در پنجاب می گردید" (جبریہ گرفتاری کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا اور پنجاب میں گھومتا پھرتا تھا) لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مجدد صاحب کے مشہور خلیفہ حضرت حافظ شیخ آدم بنوری نے بھی ایک جماعت فراہم کی تھی اور "تیغ بہادراز ہندواں زرہامی گرفت" (تیغ بہادر ہندوؤں سے مال وزر جمع کرتا) اور حضرت شیخ کے متعلق لکھا ہے کہ "حافظ آدم از مسلمانان" (حافظ آدم مسلمانوں سے) طباطبائی اوران جیسے "بزرگوں" کو حضرت مجدد سے جو خاص کد تھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اس کا نتیجہ ہے یا واقعی اس سکھی تحریک کے مقابلہ میں حافظ آدم رحمۃ اللہ علیہ ہی فی الحقیقت اٹھے تھے، مجھے امید ہے کہ ہمارے دوست مولانا یوسف بنوری جو غالباً حضرت حافظ صاحب کے خاندان سے ہیں اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے، "مجددیت" کے سلسلہ میں اس سے ایک باب کا اضافہ ہوگا۔

(۲) ص:۴۰۲

(۳) فرمان شاہی کے مطابق لشکر شاہی نے اس کی گوشمالی کی۔

ابقائی کرد، ہرچند اطفال صغیر السن باشند"۔

(اہل اسلام کے گاؤں اور آبادیوں پر جہاں کہیں قابو پاتا چڑھ دوڑتا اور باشندوں میں جس کسی کو پاتا باقی نہیں چھوڑتا تھا خواہ چھوٹے کمسن بچے ہی کیوں نہ ہوں!)۔

قساوت وبطش شدید وجبّاریت کا یہ عالم تھا کہ:

"حتی زنہائے حاملہ راشکم دریدہ جنین رابیرون کشیدہ می کشتند"

(حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچہ کو باہر نکال کر مار ڈالتے تھے)

ایک ہندو مصنف کی شہادت:

یہ تو طباطبائی کا بیان ہے، مرزا حیرت نے ایک ہندو مصنف کی جو پنجاب میں اکسٹرا اسٹنٹ کے عہدہ پر مامور تھا حسب ذیل شہادت نقل کی ہے:

"مسلمانوں سے سکھوں کو بڑی دشمنی تھی، اذان یعنی بانگ بآوازِ بلند نہیں ہونے دیتے تھے، مسجدوں کو اپنے تحت میں لے کر گرنتھ پڑھنا اس میں شروع کرتے اور اس کا نام مست گڑھ رکھتے تھے، شکار اور شراب خور ہوتے تھے، گھوڑے پر چڑھے ہوئے روٹی کھاتے جاتے تھے، دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جہاں پہنچتے تھے، جو برتن مٹی کا استعمالی کسی مذہب والے خصوصاً مسلمانوں کا پڑا ہوا ان کے ہاتھ آجاتا تھا، پانچ چھتر (جوتے) اس پر مار کر اس میں کھانا پکالیتے تھے"۔(۱)

مسلمانوں کے برتن کے پاک کرنے کا سکھوں نے جوتے مارنے کا عجب طریقہ اختیار کیا تھا، بہرحال اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بعید از قیاس کہا جائے اس واقعہ کو جو اُن "شکار اور شراب خوروں" کے متعلق مرزا حیرت نے درج کیا ہے کہ:

زندہ جانوروں کے ہُولے

"سکھوں کا دستور ہے کہ وہ ہُولے کر کے کھاتے ہیں، ہلی میں ہُولے سوکھے بوٹوں کو گھاس پھوس کی آگ میں مع شاخوں کے خستہ کرنے کو کہتے ہیں، مگر سکھ اُنہیں ہولے نہیں

---

(۱) حیات طیبہ ص ۱۳۱۔

کہتے، وہ ایک بڑے فولادی پنجرے میں چیل، کوّے، کبوتر، تیتر، مینائیں، طوطے غرض مختلف قسم کے جانور بند کرکے پنجرے کو کسی درخت سے لٹکا دیتے ہیں اور پھر نیچے آگ دے دیتے ہیں، وہ زندہ پرندے پھڑ پھڑا کے بھن کے کوئلہ ہوجاتے ہیں، پھر انہیں صاف کرکے یہ نا خداترس کھاتے ہیں"۔

انسانوں کے ہُولے

خیر یہ غریب پرندوں اور جانوروں کو ہولہ بنانے کی شکل تھی، آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے جب اسی کے بعد مرزا حیرت کی اس روایت پر نظر پڑتی ہے کہ:

"اسی طرح بے گناہ مسلمانوں کے ہُولے کئے جاتے تھے، اور یوں تڑپا تڑپا کر انہیں مارا جاتا تھا" (۱)

بہرحال قتل وغارت، خونریزی وخوں خواری اس تحریک کی روح تھی، دماغوں کو اتنا مسحور کیا گیا تھا کہ جب فرخ سیر نے اپنے زمانہ میں سکھوں کی ان ظالمانہ چیرہ دستیوں کا قرار واقعی علاج کرانا چاہا اور عبدالصمد خاں تورانی صوبہ دار کشمیر اس مہم پر متعین ہوا، جس نے بڑی دلیری سے بندا اور اس کے ساتھیوں پر قابو حاصل کرکے سب کو گرفتار کرکے دہلی روانہ کیا، بادشاہ کے پاس ہزارہا غریب وبے کس مسلمانوں کی فریاد وزاری کی عرضیاں پہنچی ہوئی تھیں، جب حکم دیا گیا کہ اب ان سے انتقام لیا جائے تو بقول طباطبائی اس وقت کا سماں عجیب تھا۔

سکھوں کا جذبۂ قربانی

"تصلبے عجیب ازآں جماعت مسموع شدہ کہ در کشتہ شدن یکے بر دیگرے سبقت می جست ومنّت جلاّدی نمود کہ اول مرا بکشید" (۲)

(عجیب قسم کی سخت جانی اس گروہ کے متعلق سننے میں آئی یعنی مارے جانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا، جلاّد کی خوشامد کرتا کہ پہلے اسے مار ڈالا جائے")۔

---

(۱) ص ۱۳۰۔

(۲) ج ۲ ص ۴۰۳۔

باطل کے لئے مرجانے اور حق پر جان دینے کا فرق

کتنی عجیب بات ہے، حق ہو یا باطل اس قسم کی قربانیوں اور دیدہ دلیریوں کے نظائر کی تاریخ میں کچھ کمی نہیں ہے، لیکن پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو ہر چیز سے قطع نظر کرکے کسی کے تصلب واستقلال یا جذبۂ قربانی کو اس کی صداقت کی دلیل بنالیتے ہیں، کس لئے مرا؟ یہ نہیں دیکھتے، بلکہ کسی بات پر ہٹ کرتے ہوئے مرجانا بس یہی ان کے نزدیک ان کے خیال کی صحت اور اس کے مسلک کی راستی کی کافی شہادت ہے، حالانکہ اگر حق وباطل کا یہی معیار ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ابوجہل اور سیدالشہداء حمزہ رضی اللہ تعالی عنہ میں یہ دیوانے کس بنیاد پر امتیاز پیدا کرتے ہیں، آخر ابوجہل نے قربانی کی کونسی ایسی قسم تھی جو پیش نہیں کی، مال لٹایا، گھر چھوڑا، در چھوڑا اور بالآخر اپنے مسلک پر اصرار کرتے ہوئے بدر پہنچ کر اسی راہ میں اپنی جان بھی دے دی، پھر کیا واقعی محض اس لئے ابوجہل ہونے کے بجائے ابوالحکم قرار دیا جاسکتا ہے، جس نے بھی اپنی جان دے دی، بس اس کے بلندئ رتبہ کا ان کے سامنے پھر کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا، حالانکہ سچ پوچھئے تو ایک نہیں لاکھوں ہر زمانہ میں، ہر ملک میں آپ کو ایسے آدمی مل سکتے ہیں اور ملتے رہتے ہیں، اور اس وقت بھی مل رہے ہیں، جو کسی بڑی چیز کے لئے نہیں صرف پندرہ روپے ماہوار کے لئے فوجوں میں اس لئے بھرتی ہونے پر تیار ہیں کہ جب جی چاہے ان کی گردن ان کے سروں سے اتار لی جائے، پھر کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ فوج کا ہر سپاہی قربانی وایثار، استقامت واستقلال کا پیکرِ مجسم اور مظہرِ اتم ہے؟ صرف اس لئے کہ بجائے کسی بڑے نصب العین کے عام فوجی سپاہیوں کے سامنے محض چند روپے ہوتے ہیں جن کے لئے وہ اپنی جانوں سے بھی دست بردار ہوجاتے ہیں، ان کی کوئی عظمت کسی دل میں نہیں پائی جاتی! یہی واقعہ ہے اور یہی فطرت کی شہادت ہے۔

بڑی جہالت ہے کہ کس لئے جان دی؟ اس سوال کی تحقیق کرنے سے پہلے لوگ غل مچادیتے ہیں کہ فلاں نے جان دے دی، اب اس سے زیادہ اس کی راست بازی کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔

آج بھی تحریکوں کی صداقت وعدم صداقت کا معیار جاہلوں میں صرف یہی چیز بنی ہوئی ہے، کبھی کسی مسلک کی تصدیق اس لئے کی جاتی ہے کہ اس پر چلنے والے بڑے منظّم ہیں، بڑے اولوالعزم ہیں، ہندوستان ہی نہیں ہندوستان کے باہر بھی اپنے خیال کے پرچار میں دیوانہ وار مارے مارے پھرتے ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ آخر جو نہ کسی سے کچھ لیتے ہیں اور نہ مانگتے ہیں بلکہ اپنی جیب سے اپنی وردیاں بناتے ہیں، بیلچے خریدتے ہیں، کرایہ یا بلا کرایہ ریل گاڑیوں پر سفر کرتے ہیں، ہر بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جانے پر ہر وقت تیار رہتے ہیں، نہ اپنی جائیدادوں کی انہیں کوئی پروا ہے، نہ اپنی اولاد کی فکر، ''جانِ عزیز'' ہر وقت ان کی مٹھی میں دھری ہے، معمولی اشاروں پر اسے بآسانی پھینک دینے پر آمادہ ہوجاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ آخر اس سے بڑھ کر ان کی سچائی اور خدا کی مرضی کے مطابق ہونے کی اور کیا دلیل تلاش کی جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بجائے خود یہ صفات اچھے نہیں ہیں، لیکن لکڑی کاٹنے کے لئے جسے تیشہ دیا گیا، اگر بجائے لکڑی کے وہ مسجد کی دیوار کھودنے لگے تو اس میں ''تیشہ'' کی برائی نہیں، استعمال کرنے والے کی غلطی ہے، ''سعدیؒ'' نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن   نہ گفتم کہ دیوار مسجد بکن

آپ یہ نہ دیکھئے کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے، بلکہ یہ دیکھئے کہ وہ اپنے ہتھیار کو کن چیزوں پر چلا رہا ہے، تنظیم، اتحاد، ایثار، قربانی، یہ قدرت کے اٹل قوانین ہیں جن کے بغیر اپنے ''نصب العین'' کی تکمیل میں بمشکل ہی کوئی کامیاب ہوسکتا ہے، مگر بذات خود ان کی کوئی قیمت نہیں ہے، اگر کسی اچھے بلند نصب العین کے لئے انہیں استعمال کیا جائے تو یہ بہترین چیزیں ہیں لیکن اگر شر وفساد، خونریزی وتباہ کاری، اضلال وتسویل، نوامیس شرعیہ کی توہین، اہل حق کی تحقیر کا ذریعہ ان ہی چیزوں کو بنایا جائے تو پھر ان صفات سے زیادہ بدتر کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، چونکہ مجھے شمال مغرب کی قدیم تحریک اور جدید تحریک میں گونہ

(۱) طباطبائی ج ۲ ص ۴۰۲۔

مشابہت نظر آرہی ہے، اس لئے ان چند اشارات کا ذکر مناسب معلوم ہوا، اب میں اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ سکھوں کے جس فتنہ کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا، آپ کو تو اس وقت یہ سنایا جارہا ہے، لیکن دین کے جس دیوانے اور شمع محمدی ﷺ کے جس پروانے کا نام ''ولی اللہ'' تھا اسے یہ سب کچھ دکھایا جارہا تھا، ٹھیک جن دنوں پنجاب بندا کی ترک تازیوں سے قیامت کا نمونہ بنا ہوا تھا، اسلامی حکومت اس کا اور اس کے ساتھیوں کا تعاقب کرتی تھی، لیکن:

> ''بندائے مذکور کمتر مقابل افواج پادشاہی می گشت، اکثر بطور چپاؤلی وقطاع الطریق در اطراف وجوانب دویدہ یک جانمی آسود، ہر جا قابومی یافت در قتل وغارت وتخریب مساجد ونبش قبور مسلمان قصور نمی نمود'' (۱)
>
> (مذکورہ بالا بندا بادشاہی فوج کا سامنا بہت کم کرتا تھا، بلکہ زیادہ تر (گوریلا وار کے طور پر) چھپ چھپا کے حملے کرتا تھا اور اطراف وجوانب میں راہزنی کرتے ہوئے پھرا کرتا، ایک جگہ اپنا ٹھکانہ بنا کر نہیں رہتا تھا، جہاں موقع مل جاتا قتل وقتال، لوٹ مار اور مسجدوں کی بربادی، مسلمانوں کے مقابر کے اکھاڑنے میں کمی نہیں کرتا)۔

بندا کے یہ ساتھی جس وقت دلّی میں خود اپنے قتل کے لئے ''منّتِ جلاد'' میں سبقت کررہے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت دلّی ہی میں موجود تھے اور یہ سارے واقعات ان کے سامنے گزر رہے تھے، ان صفات کے زیر اثر جو تحریک اٹھائی گئی ہو، عوام کو اس کی اہمیت کا ممکن ہے صحیح اندازہ نہ ہو، لیکن جس نے حجۃ اللہ البالغۃ اور خیر الکثیر، ازالۃ الخفاء جیسی ولی اللّٰہی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے اور حضرت شاہ صاحب کی نگاہ عقابیں کا اسے تجربہ ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ ان حالات کو دیکھ دیکھ کر قرآن وحدیث کے اس عاشق جانباز پر کیا گزر رہی ہوگی، مسلمانوں کے بھیانک انجام کی جو تصویر ان کے سامنے گھوم رہی ہوگی، ارباب

(۱) ج ۳ ص ۹۲۳۔

بصیرت ہی اس کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں، ایک طرف پنجاب سے یہ آندھی اٹھی تھی اور بتدریج تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی، سلطنت وحکومت کی قوتیں بھی اس کے مقابلے میں بسا اوقات اپنے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور پارہی تھیں کہ شیواجی کے دماغ نے ''دکن'' کا جو ''الاؤ'' جوڑا تھا، عالمگیر أنار للّٰہ برھانہ کی کئی سالہ مسلسل کوششوں سے اگر چہ وہ کبھی کبھی دب دب جاتا تھا لیکن سچی بات یہی ہے کہ جیسا کہ اسی طباطبائی نے لکھا ہے کہ:

''عالمگیر خود بہ نفس نفیس متوجہ دکن شد، وبست و پنج سال کامل در گوشمالی مرہٹہ صرف نمود، اما از تہاون بعض امرائے رکاب کہ برائے اغراض خود انفصال ہنگامہ مرہٹہ نمی خواستند استیصال جماعۃ مرہٹہ صورت نہ گرفت''(۱)

(عالمگیر نے بذات خود دکن کی طرف رخ کیا اور پورے پچیس سال مرہٹوں کی گوشمالی میں صرف کئے، لیکن شاہی رکاب میں جو امراء تھے، ان کی سستی وکاہلی سے جس میں ان کے اغراض پوشیدہ تھے معاملہ کا قطعی فیصلہ نہ ہونے پایا، یا امراء اپنے ذاتی اغراض کے تحت مرہٹوں کے ہنگاموں کو ختم کرنا ہی نہیں چاہتے تھے)۔

بلکہ ''اورنگ زیبی'' پنجۂ فولادیں کے دباؤ کے اٹھ جانے کے بعد اس قوم کو صرف دکن اور کوکن ہی نہیں بلکہ تقریباً ہندوستان کے اکثر علاقوں میں تگ وتاز، تاخت وتاراج کا کھلا میدان مل گیا، ''برگی'' جو مرہٹہ غارت گروں کا کپکپا دینے والا نام تھا، اس سے ملک کے اکثر وبیشتر صوبے پامال ہورہے تھے، خود دہلی پر اکثر مرہٹوں کے حملے ہوتے تھے اور حکومت ان کے مقابلہ سے دن بدن اپنے کو عاجز پاتی چلی جارہی تھی، یہ وہ واقعات ہیں جن سے عامی وخاصی سب ہی واقف ہیں۔

سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک کا ایک خاص فرق

لیکن اس سلسلہ میں ایک چیز قابل غور ہے کہ مغربی شمالی گوشہ سے جو فتنہ اٹھا تھا، جیسا

(۱) ص ۴۰۰۔ [ترجمہ: اگر چہ ان کا تعلق مختلف فرقوں سے ہو، لیکن اس مذہب سے وابستگی کے بعد ہندوؤں کی قدیم روایت کے مطابق ایک دوسرے سے الگ نہیں رہتے تھے، اگر چہ بعد میں ان میں فرق کرتے تھے]

کہ بیان کیا گیا، ابتداءً اس کی شکل ایک مذہبی اصلاحی تحریک کی تھی اور غالباً انتقامی جذبات کے تحت اس نے سیاسی کروٹ لی، لیکن اسی کے مقابلہ میں جس تحریک کی ابتداء جنوبی ہند سے ہوئی تھی عجیب بات ہے کہ بجائے کسی مذہبی اصلاحی تحریک کے شروع ہی سے اس کا آغاز ایک ایسی سیاسی تحریک کی شکل میں ہوا جس کا مقصد ہندوستان کو قدیم پراچین تہذیب کی طرف واپس لے جانا تھا، پنجاب کی تحریک کا تعلق عوام کے مذہبی خیالات کی اصلاح سے تھا اور چونکہ اس کا بانی ہندوؤں کی کسی اعلی ذات سے نہیں بلکہ قوم کھتری سے تعلق رکھتا تھا، اس لئے ہر طبقہ کے عوام اس میں شریک ہوتے تھے، صاحب سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ سکھ لوگوں کا دستور تھا کہ:

''ہر چند از فرق مختلفہ باشند ہرگاہ ایں مسلک اختیار نمانید اجتناب واحتراز از ہم گر بقاعدہ مستمرہ بضابطۂ دیرینۂ ہنود نمی کنند، اگر چہ از بعد فرق او باشند''(۱)

لیکن جنوبی ہند کی تحریک کے بانی چونکہ شیواجی سمجھے جاتے ہیں، اور ان کا نسلی تعلق اودے پور کے راناؤں سے بتایا جاتا ہے، اس لئے شروع سے ہندوؤں کے اعلی طبقے اس میں شریک رہے، حتی کہ آخر میں تو مرہٹہ تحریک کی جو عنان بالاجی المعروف بہ پیشوا کے ہاتھ میں آگئی تھی جو براہ راست کوکنی برہمن تھا۔

گویا آج جنوبی ہند سے جس تحریک کی ابتداء ہوئی اور بالآخر اس وقت تمام دوسرے صوبوں کی مختلف تحریکیں بھی دب دبا کر اسی میں ہضم ہوچکی ہیں، اس تحریک کی خصوصیت بھی وہی ہے جو پہلے کی تھی، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی جن کی زندگی کا بڑا حصہ مرہٹواڑی میں گزرا ہے، اور اس قوم کے عادات واطوار، مقاصد اور منصوبوں سے جتنی زیادہ واقفیت اس مؤرخ کو حاصل ہوسکتی تھی، دوسروں کو اس کے مواقع حاصل نہ تھے، وہ یہ لکھتے ہوئے کہ:

''حق (۱) علیم است وکفی بہ شہیداً کہ ایں ہمہ امور مطابق بقلم آمدہ، وتعصب وتصنع اصلاً دخلے ندارد''

(۱) یہ ساری عبارت ان کی کتاب ''خزانہ عامرہ'' سے منقول ہے، طباطبائی نے بھی بجنسہ اپنی کتاب میں اس کو نقل کیا ہے۔

(اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور گواہ ہونے کیلئے وہ کافی ہے کہ (جو کچھ لکھا جا رہا ہے) یہ سب کچھ وہی ہے، جو واقعات کے مطابق ہے، تعصب یا بناوٹ کو اس میں قطعاً دخل نہیں ہے)۔

مرہٹہ تحریک کے نصب العین کو ان الفاظ میں ادا فرماتے ہیں:

''مخفی نماند کہ فرقتین مذکورتین نیتے دارند کہ ہر جادست یابند وجوہ معاش جمیع خلق رابند کردہ بہ طرف خودمی کشند وزمینداری ومقدمی وعمل پٹواری گری ہم باقد میں نہ گذاشتہ، اساس وارثان کارہائے مذکورہ از بیخ وبُن برکندہ بنیاد دخل وتصرف خود قائم کنند''

(لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ دونوں فرقوں (مرہٹہ اور کوکنی برہمن) کی نیت یہ ہے کہ جہاں ان کو قابو حاصل ہو جائے، وہاں خدا کی ساری مخلوق کے ذرائع معاش کو بند کر کے اپنی طرف ان کو سمیٹ لیں، زمینداری، مقدمی، پٹواری کا کام، ان پیشوں کو بھی پُرانے لوگوں کے ہاتھوں میں انہوں نے باقی نہیں چھوڑا ہے، جو بے چارے ان لوگوں کے وارث ہیں ان کی تو جڑ نکال کر انہوں نے پھینک دی اور سب پر اپنا عمل دخل قائم کر لیا)۔

آخر میں ان کے ''اندرونی منصوبے'' کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

''می خواہند کہ مالک تمام روئے زمین بشوند''

(یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تمام روئے زمین کے مالک بن جائیں گے)۔

اگرچہ بے چارے میر صاحب نے اس کے بعد اپنے ایمانی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ:

''رزاقِ مطلق تعالیٰ شانہ کہ روزی رسان ہندو مسلمان است برأتِ رزق اصناف خلائق بر ہمیں زمین نوشتہ، تمام ایں مملکت بر یک قوم چہ طور مسلم تواند ماند''۔

(رازق مطلق اللہ تعالیٰ جو ہندو اور مسلمان دونوں کا روزی پہنچانے والا ہے، اسی نے ہر ایک کی روزی کا حصہ اسی سرزمین (ہند) میں مقرر فرمایا ہے، یہ سلطنت کسی ایک قوم کے فائدہ کے لئے کس طرح مخصوص کی جاسکتی ہے)۔

ہندوؤں کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں کا رخ اور ان کا مقصد

لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جنوبی ہند سے شروع ہونے والی موجودہ سیاسی تحریک کو

(جس کی قیادت عملاً اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں ہے) جو لوگ مغربی کلیات اور کالجوں کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اس بنیاد پر اس قوم کا گُن گایا جاتا ہے اور کم از کم اس کے وجود کا یہ فائدہ بتایا جاتا ہے کہ اسی کی بدولت سوتے ہوئے جاگ پڑے، ان کو غور کرنا چاہئے کہ اس میں کہاں تک حقیقت کا عنصر شریک ہے۔

کیا ہندوستان کی تقسیم سے ہمارے مرض کا علاج ہوسکتا ہے

اور اس کے بعد مجھے ان لوگوں سے عرض کرنا ہے جو اسی مسئلہ ''رزق'' کے حل کی یہ صورت نکال کر مطمئن ہونا چاہتے ہیں کہ ہم ملک کا کوئی گوشہ اپنے لئے الگ کر کے آباد ہو جانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر روز کی اس کھٹ کھٹ سے نجات مل جائے گی اول تو جنگ وجدال اور باہمی نزاع وفساد کے لئے صرف ہندو مسلمان کی تفریق کی ضرورت نہیں، چاہنے والے چاہیں گے تو شیعہ سنی کے مسئلہ میں بھی اسی قدر زہر بھر سکتے ہیں، بلکہ میں تو آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ خالص حنفی سنی مسلمانوں میں بھی اس سے زیادہ خونریزیاں اور بربادیاں محض ایک لفظ ''وہابی'' وغیر وہابی یا ''دیوبندی''، ''بریلوی'' یا ازیں قبیل دوسری تقسیموں سے پھیلائی جاسکتی ہیں، پھر جن لوگوں نے مرض کا یہ علاج تجویز کیا ہے میں اگر ان کے متعلق یہ باور کرتا ہوں کہ ان کی نظر دور نہیں پہنچی ہے تو کیا غلط سمجھ رہا ہوں، اور بالفرض مسلمانوں کے بانٹنے یا بٹوانے میں بانٹنے والی قوتوں کو کسی وجہ سے کامیابی نہ بھی ہو، لیکن جس کا نصب العین آج ہی نہیں بلکہ آج سے صدیوں سے پہلے یہ تھا کہ:

''می خواہند کہ مالک تمام روئے زمین شوند''

(چاہتے ہیں کہ تمام ''روئے زمین'' کے مالک ہو جائیں)

آخر ان سے ہم کہاں تک بھاگ بھاگ کر پناہ لیں گے، آپ ہندوستان ہی کے متعلق سوچ رہے ہیں کہ اس ملک کے کسی علاقہ میں ہمیں چین نصیب ہوسکتا ہے، اگر ان سے بالکل الگ ہو جائیں، لیکن ہندوستان تو بقول ان کے ''ہندواستھان'' ہے جو ''ہندواستھان''

نہیں ہے، جب وہ بھی ان کے ''می خواہند'' میں داخل ہے تو آخر صرف جدائیگی اور بٹوارہ کو جو ہر مرض کی دوا خیال کیا جا رہا ہے، کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے، زندگی اور حیات کے قدرتی قانونوں سے محروم ہونے کے بعد محض لاشوں کے چہروں پر غازے ملنے سے کسی کو زندہ نہیں خیال کیا گیا ہے اور نہ ان سے زندگی کے آثار نمایاں ہوسکتے ہیں، ہمارے پاس ہماری کتاب میں ہمارے پیشوا (ﷺ) کی تعلیم میں جینے کے جو اصول بتائے گئے ہیں، ان سے کٹ کر جو باوجود ادعاء اسلام کے اپنی خود تراشیدہ تدبیروں کے ذریعہ جینا چاہتے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے کو کس طرح زندہ رکھ سکتے ہیں۔

بہرحال ایک طرف پنجاب سے سکھوں کا فتنہ تھا جو بڑھتے ہوئے بادل کی طرح مسلمانوں پر چھاتا چلا جاتا تھا اور بے دردی سے بجائے پانی کے ان پر آگ برسا رہا تھا اور دوسری طرف جنوبی ہند کا مرہٹی سیلاب تھا، جس میں جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک کے مسلمان اپنے ڈوبنے اور بہنے کا تماشا دیکھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

مرہٹہ گردی

مرہٹے ملک میں اس کنارے سے اس کنارے تک جہاں تک پہنچ سکتے تھے پہنچ کر:

''ہر جا آبادی یافت سوختہ غارت کردہ بخاک برابر ساختہ''(۱)

(جہاں کہیں آبادی انہوں نے پائی اسے جلا کر، لوٹ کر زمین کے برابر کرتے چلے گئے)۔

دلی پر مرہٹوں کی تاخت اور دوسری اسلامی بستیوں کی بربادی

حتیٰ کہ خود دہلی کو اس وقت جس وقت شاہ صاحب کی عمر چونتیس سال کی تھی، اور کالکہ کے میلہ کا تماشا دیکھنے کے لئے ہندو مسلمان شہر سے باہر ہوگئے تھے، مرہٹوں نے:

''ازدحام عظیم نمودہ بخاطر جمع غارت نمود مال وافر اندوخت، وشب نزدیک مزار

(۱) سیر: ج ۲ص ۴۷۵۔

خواجہ قطب الدین ماندہ صبح روز چہار شنبہ یوم العرفہ مینا بازار ودوکانہائے آبادی آں جارا سوختہ غارت نمود''(۱)

(ہلہ کر کے ایک بڑی بھیڑ کے ساتھ بااطمینان تمام دلی کو لوٹا اور بہت دولت جمع کی، رات جب قریب ہوئی تو حضرت خواجہ قطب الدین (کاکی) کے مزار کے پاس شب گزار کر صبح بدھ کے دن جو عرفہ کا دن تھا مینا بازار اور آبادی کی دکانوں کو آگ لگا کر بھسم کیا اور سب کو لوٹ کھسوٹ لیا)۔

''قصبۂ ریواڑھی وپاٹوڈہی رفتہ، ہر دو قصبہ راچناں کہ خواست غارت نمودہ از بیخ وبن برافگند''

(قصبہ ریواڑھی، پاٹوڈہی گئے اور دونوں قصبوں کو جیسا ان کے جی میں آیا لوٹا، غارت کیا اور ان آبادیوں کی بیخ وبنیاد اکھاڑ دی)۔

عیدقربان کے دن مسلمانوں کی قربانیاں

گویا ٹھیک عیدالاضحیٰ کے دن مسلمانوں کی قربانیاں کر کے یہ اپنے حرص وآرزو کے دیوتاؤں کو خوش کر رہے تھے، سوچنے والے سوچ سکتے ہیں کہ اس ماحول میں اوروں کا جو حال ہوگا وہ تو بجائے خود، لیکن جس سینہ میں "اطیب النغم"(۲) کا سوز بھرا ہوا تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی امت مرحومہ کے اس حال کو دیکھ دیکھ کر، سن سن کر اس پر کیا گذرتی ہوگی!

حضرت شاہ صاحب کا ایک تاریخی خواب

کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس مشہور خواب میں جس کا تذکرہ "فیوض الحرمین" میں آپ نے فرمایا ہے، ان احساسات کو دخل نہ تھا، درحقیقت اسی سلسلہ میں آپ کی آرزوؤں اور ہمت ودعا کی توجہات ہی نے عالمِ مثال میں یہ شکل اختیار کی تھی۔

(۱) ص ۴۷۶۔

(۲) شاہ صاحب کے نعتیہ قصائد کا مجموعہ ہے جو اپنی عربیت وبلاغت کے لحاظ سے جو کچھ بھی ہو، لیکن مجھ پر ان قصیدوں کا یہی اثر پڑتا ہے کہ آنسو تھم نہیں سکتے۔

"فیوض الحرمین" کے پڑھنے والے تو اس خواب سے واقف ہیں، لیکن نہ پڑھنے والوں اور نہ جاننے والوں کے لئے بجنسہ اصل عبارت کے ساتھ درج کرتا ہوں، فرماتے ہیں:

"رأيتني في المنام قائم الزمان أعني بذلك أن الله إذا أراد شيئاً من نظام الخير جعلني كالجارحة لإتمام مراده، ورأيت أن ملك الكفار قد استولى على بلاد المسلمين ونهب أموالهم وسبا ذريتهم وأظهر في بلدة أجمير شعائر الكفر وأبطل شعائر الإسلام (العياذ بالله) فغضب الله تعالى على أهل الأرض غضباً شديداً، ورأيت صورة هذا الغضب متمثلة في الملأ الأعلى ثم ترشح الغضب إليّ، فرأيتني غضباناً من جهة نفث من تلك الحضرة في نفسي لا من جهة ما يرجع إلى هذا العالم وأنا ساعتئذ في جم غفير من الناس، منهم الروم ومنهم الأزابكة ومنهم العرب، بعضهم ركبان الإبل، وبعضهم فرسان، وبعضهم مشاة على أقدامهم، وأقرب ما رأيت شبهاً بهؤلاء الحجاج يوم عرفة و رأيتهم غضباناً لغضبي، وسألوني ماذا حكم الله في هذه الساعة قلت: فك كل نظام، قالوا: إلى متى؟ قلت إلى أن تروني قد سكت غضبي فجعلوا يتقاتلون بينهم ويضربون إليهم، فقتل منهم كثير وانكسرت رؤوس إبلهم وشفاهها، ثم إني تقدمت إلى بلدة أخرّبها وأقتل أهلها فتبعوني في ذلك، وكذلك خرّبنا بلدةبعدبلدةحتى وصلناالى أجمير وقتلنا هنالك الكفار واستخلصناها منهم، وسبينا ملك الكفار، ثم رأيت ملك الكفار يماشي مع ملك الإسلام في نفر من المسلمين. فأمر ملك الإسلام في أثناء ذلك بذبحه، فبطش به القوم وصرعوه وذبحوه بسكين، فلما رأيت الدم يخرج من أوداجه متدفقا، قلت: الآن نزلت الرحمة، ورأيت الرحمة والسكينة شملت من باشر القتال من المسلمين وصاروا مرحومين، فقام إليّ رجل وسألني عن المسلمين اقتتلوا فيما بينهم فتوقفت عن الجواب ولم أصرح" (١)

(میں نے خواب میں دیکھا کہ میں قائم الزماں ہوں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی جب بھلائی اور خیر کے کسی نظام کو قائم فرمانا چاہتے ہے تو اس وقت مجھے اس مقصد کی تکمیل کے لئے گویا ایک آلہ اور واسطہ بناتے ہیں، اور میں نے دیکھا کہ کفار کا راجہ (یا بادشاہ)

(١) ص ٩٠-٨٩۔

مسلمانوں کے بلاد پر مسلط ہوگیا اور ان کے اموال کو اس نے لوٹ لیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرلیا، اور اجمیر شہر میں اس نے کفر کے شعائر کا اعلان کردیا، شعائر اسلام کو اس نے مٹادیا (خدا کی پناہ)، پھر اس کے بعد یہ دیکھا کہ زمین کے باشندوں پر حق تعالی غضبناک ہوئے اور سخت غضبناک، اور میں نے حق تعالی کے غصہ کی صورت کو ملأ اعلی میں متمثل ہوتے ہوئے دیکھا، پھر وہاں سے ٹپک ٹپک کر وہی الہی غیظ میرے اندر اترا، پھر میں نے اپنے کو غضبناک پایا، اور یہ غضب جو مجھ میں بھر گیا تھا حضرت الہیہ کی طرف سے مجھ میں دم کیا گیا تھا، اس کا منشاء کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کا تعلق اس عالم سے ہو، اور میں نے اس وقت اپنے کو ایک بڑے مجمع میں پایا جس میں روم والے بھی تھے اور ازبکی (ترک) بھی اور عرب بھی، اور بعض ان میں اونٹوں کے سوار تھے اور بعض اسپ سوار، اور بعض پیدل، قریب قریب اس گروہ کی حالت ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے عرفہ کے دن حجاج کی ہوتی ہے، پھر میں نے ان لوگوں کو بھی اپنے غضبناک ہونے کی وجہ سے غصہ میں بھرا پایا، ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس وقت اللہ تعالی کا کیا حکم ہے، میں نے کہا کہ "ہر نظام اور آئین کو توڑ دینا" یہی حکم ہے، انہوں نے دریافت کیا یہ حال کب تک رہے گا؟ میں نے کہا کہ اس وقت تک جب تک تم میرے غصہ کو ٹھنڈا ہوتا نہ پاؤ، پھر وہ باہم آپس میں لڑنے لگے، اور جانوروں کو مارنے لگے، پھر ان میں سے بہت سے مارے گئے، ان کے اونٹوں کے سر ٹوٹے اور لب چور ہوئے، پھر میں ایک شہر کی طرف اسے برباد کرتے ہوئے اور اس کے باشندوں کو قتل کرتے ہوئے آگے بڑھا، لوگ میرا ساتھ دے رہے تھے، یوں ہی ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کو تباہ و برباد کرتے ہوئے ہم بالآخر اجمیر پہنچ گئے اور وہاں ہم نے کفار کو قتل کیا، پھر میں نے کفار کے بادشاہ کو دیکھا کہ وہ اسلام کے بادشاہ کے ساتھ مسلمانوں کے ایک گروہ میں ساتھ ساتھ چل رہا ہے، اتنے میں اسلام کے بادشاہ نے کفار کے بادشاہ کے متعلق حکم دیا کہ اسے ذبح کردیا جائے، لوگوں نے اسے پکڑ کر دے پٹکا اور چُھری سے اسے ذبح کردیا، میں نے جب دیکھا کہ اس کی گردن کی شہ رگوں میں سے خون اُچھل اُچھل کر نکل رہا ہے تب میں نے کہا اب رحمت نازل ہوگئی اور میں نے دیکھا کہ یہ جو مسلمانوں میں لوگ جنگ میں شریک تھے ان کو اس رحمت وسکون نے احاطہ کرلیا اور ان پر رحم کیا گیا، پھر ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر میرے پاس آیا اور ان مسلمانوں کے متعلق پوچھا جو باہم لڑتے تھے، میں جواب میں خاموش ہوگیا اور کوئی تصریح میں نے نہ کی)۔

شاہ صاحب عام طور پر اپنے خوابوں کے آخر میں تاریخ درج نہیں کرتے، لیکن اس میں خواب کی تاریخ لکھی ہے، اسی طرح ایک اور خواب جس کا ذکر آئندہ آئے گا، اس میں [بھی] انہوں نے یہی کیا، بہر حال اس خواب کی تاریخ انہوں نے یہ درج کی ہے:

”رأیت ذلک فی لیلۃ الجمعۃ الحادیۃ والعشرین من ذی القعدۃ“ (۱۱۴۴ھ)

(میں نے یہ خواب شب جمعہ ۲۱/ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ کو دیکھا)۔

شاہ صاحب کے اس خواب کی تعبیر پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ

ٹھیک اس تاریخ سے ۲۹/سال بعد یعنی ۱۱۷۳ھ میں اپنی وفات سے تین سال پہلے اسی شخص نے جس نے گزشتہ بالا واقعات کو خواب میں دیکھا تھا اپنے سر کی آنکھوں سے وہی شخص ایک اور واقعہ دیکھتا ہے جس میں بجائے اجمیر کے اگر دلّی کا لفظ شامل کر دیا جائے تو تقریباً جو کچھ خواب میں دیکھا گیا تھا بیداری میں ”کفلق الصبح“ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر اسی کا معائنہ کرایا گیا، اس سے میرا اشارہ پانی پت کے مشہور فیصلہ کن معرکہ کی طرف ہے جو تاریخوں میں ”مرہٹہ اور ابدالی کی جنگ“ سے موسوم ہے، چونکہ ہندوستانی ”تاریخ“ کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں یہ واقعہ یا اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور مذکور ہے اس لئے تفصیل کی تو یہاں گنجائش نہیں، لیکن ”سیر المتاخرین“ جو تقریباً تمام پچھلی تاریخوں کا ماخذ ہے اسی سے بعض جستہ جستہ فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

خواب اور بیداری کے واقعات کا انطباق

میں نے جو یہ کہا کہ بجائے ”اجمیر“ کے دلّی فرض کی جائے یہ بھی محض فرض نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کے ”خالص اسلامی مرکز“ کو کفر کے احاطہ میں چونکہ دکھانا مقصود تھا اور دلّی کو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے، جس طرح اسلامی بادشاہوں نے اسے دارالسلطنت بنایا تھا، ہندوؤں کا ”اندر پرست“ بلکہ ”ہستناپور“ دلّی ہی کے کھنڈروں میں موجود ہے

اور آج ”رائے سینا“ بھی دلّی ہی کے اطراف میں موجود ہے، علاوہ اس کے ”دلّی“ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کا مرکز تھی، لیکن ہندوستان میں مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ اسلام کا سب سے پہلا مرکز تو وہی ہے، جہاں سے ولی الہند (یا بقول عوام ”ہند الولی“) حضرت خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ نے:

کرد از ”اجمیر“ کارِ انبیاء　　بے کتاب و بے پریس و مدرسہ (۱)

اور یہ ان کے لئے کہہ رہا ہوں جو نہیں دیکھتے ہیں، پر جو اس محسوس نظام کو کسی غیر محسوس نظام کے ساتھ وابستہ پا رہے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ”اجمیر“ (۲) کا تعلق ہندوستان کے محیط سے کیا ہے، خیر کسی وجہ سے بھی سہی، آپ اجمیر کی جگہ دلّی پڑھ لیجئے اور اس کے بعد مؤرخین نے ”ابدالی“ اور ”مرہٹوں“ کی اس فیصلہ کن جنگ کا جو حال لکھا ہے اسے پڑھیے، پھر اندازہ کیجئے کہ ۱۱۴۴ھ میں جو کچھ خواب میں دیکھا گیا تھا کیا اسی کا ۱۱۷۳ھ میں مشاہدہ نہیں کرایا گیا، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ پہلے میں نے دیکھا کہ ملک الکفار مسلمانوں کے بلاد پر مسلط ہو گیا اور ان کے اموال کو اس نے لوٹ لیا اور ان کی اولاد کو قید کر لیا۔

لال قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ

طباطبائی لکھتے ہیں:

”نو ذی الحجہ سال مذکور ۱۱۷۳ھ قلعہ (لال قلعہ) بدست بہاؤ افتادہ، حرم سرائے شاہی وجمیع کارخانجات سلطنت باختیار مرہٹہ رفت ”ذلك تقدير العزيز العليم“ (۳)

---

(۱) بغیر کسی کتاب، پریس اور مدرسہ کے اجمیر سے کارِ نبوت بحسن وخوبی انجام دیا۔

(۲) ممکن ہے علماء ظاہر یا ”متحز بین“ تقطعوا أمرهم بينهم زبراً پر میری گفتگو گراں گذرے، وہ باوجود ”چشتی صابری“ ہونے کا دعوی رکھنے کے اس بلدہ پاک سے وہ تعلق رکھنا نہیں چاہتے یا نہیں رکھتے جو حضرت شاہ صاحب کو اپنے اس خواب میں ”اسلامی مرکز“ کے رنگ میں دکھایا گیا ہے، مگر کیا کروں جو پاتا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں، اپنے ان محسنوں کو کیسے بھول جاؤں جن کے صدقہ میں ایمان واسلام کا حصہ ملا ہے، رضی اللہ عنہم ورضوعنہ۔

(۳) ج ۳، ص ۹۱۲۔

(نویں ذی الحجہ ۱۱۷۳ھ میں لال قلعہ بھاؤ (سپہ سالار مرہٹہ) کے قبضہ میں چلا گیا اور شاہی حرم سرا کے ساتھ سلطنت کے تمام کارخانے مرہٹوں کے تصرف میں آ گئے، یہ عزیز علیم کا نوشتہ تھا۔)

آگے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اجمیر شہر پر اس کا قبضہ ہو گیا اور کفر کے شعائر کا اس نے اعلان کیا، اسلامی شعائر کو ختم کر دیا، طباطبائی کے یہ الفاظ ہیں:

''بھاؤ قلعہ داری شاہ جہاں آباد بنارو شنکر برہمن تفویض کرد، وجمعے را بہ حراست قلعہ ہمراہ او کرد''

(بھاؤ (سپہ سالار مرہٹہ) نے شاہجہاں آباد (دہلی) کی قلعہ داری نارو شنکر برہمن کے سپرد کر کے ایک فوجی دستہ کو قلعہ کی حفاظت کے لئے اس کے ساتھ چھوڑ دیا۔)

اس سلسلہ میں ''بھاؤ'' جب یہ چال چلا کہ اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے اودھ کے شجاع الدولہ کو اپنے ساتھ ملانا ضروری ہے، اور مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے ایک شاگرد برہمن کو اس مہم پر شجاع الدولہ کے پاس بھیجا تو اس وقت شجاع الدولہ نے جو جواب دیا وہ مرہٹوں کی بھی اور شاہ صاحب کے خواب کی بھی کامل شرح ہے، شجاع الدولہ نے جواباً کہا:

''از مدتے براہمہ دکھن بر ہندوستان مسلط شدہ اند، روادار آبرو ورفاہ وآسائش احدے از خلق خدا ندانستند''

(ایک زمانہ سے دکن کے برہمن ہندوستان پر مسلط ہو گئے ہیں، اور یہ لوگ خلق اللہ میں سے کسی کے آرام و آسائش اور فارغ البالی کے روادار نہیں ہیں۔)

اور آخر میں ان ''براہمہ دکن'' کی اس عجیب خصوصیت کا اظہار کیا ہے:

''ہمہ را برائے خود واقوام خود می خواہند، مردم از دست ایشاں بجان آمدہ''

(سب کو اپنے لئے اور اپنی قوم کے لئے محکوم بنانا چاہتے ہیں، لوگ ان کے ہاتھوں جاں بلب ہیں)

خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا، مجھے تو شاہ صاحب کے خواب سے غرض ہے یعنی مسلمانوں پر ''ملک الکفار'' کے غلبہ کو جس شان سے انہوں نے دیکھا تھا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ من وعن

وہی صورت پیش آ رہی ہے۔

تنگ ظرف مرہٹوں کی لوٹ مار کی ذلیل نوعیت

''لال قلعہ'' پر جس وقت مرہٹوں کا قبضہ ہوا ہے تو ''نہب اموال'' (لوٹ مار) میں کس حد تک وہ پہنچے تھے اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ:

''دنائت وتنگ چشمی بھاؤ بمرتبہ بود کہ سقف دیوان خاص پادشاہی را کہ از نقرہ مینا کار بود کندہ مسکوک ساخت وطلاآلات ونقرہ آلات مزار اقدام نبوی ومقبرہ .... نظام الدین معروف بہ اولیاء ومرقد محمد شاہ مثل عود وسوز وشمعدان وقنادیل وغیرہ طلبیدہ مسکوک نمود''(۱)

(بھاؤ کی پست نظری اور تنگ چشمی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ دیوان خاص کی چھت جس کی مینا کاری چاندی سے کی گئی تھی، اس کی سب چاندی کو کھرچ کر اس نے سکہ بنا لیا، اور طلائی آلات اور چاندی کے ظروف جو قدم رسول ﷺ کی زیارت گاہ اور حضرت نظام الدین کے مقبرہ اور محمد شاہ کے مرقد میں تھے مثلاً عود، سوز، شمعدان، قندیل وغیرہ کو اس نے سکہ بنا لیا۔)

مرہٹوں کی اس تنگ نظری کا ذکر آزاد بلگرامی نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

''رسوم حق داران دہات مثل مقدم وپٹواری ونجار وگاذر وحجام وحداد وغیرہم را ضبط نمودہ''

(دیہات کے رسوم کے پرانے حق دار مثلاً مقدم پٹواری، بڑھئی، دھوبی، حجام لوہار سب کے حقوق کو ضبط کر لیا تھا۔)

اور صرف ''ضبط'' نہیں کیا گیا بلکہ ان سب کو بھی ٹھیکہ پر لگا دیا گیا۔

''بہ مستاجراں داد ومبالغ خطیرے ازیں وجہ داخل خزانہ حرص اوشد''

(ٹھیکداروں کو (یہ حقوق دے دیئے گئے تھے) اور بڑی بڑی رقمیں اس راہ سے ان کے حرص کے خزانہ میں داخل ہوتی تھیں۔)

حالانکہ ہر دیہات کے یہ رسوم تقریباً ہزار ہا سال سے چلے آتے تھے، اور اب بھی

(۱) سیر المتاخرین ج ۲ ص ۹۱۲۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ان موروثی حقوق پر کسی نے دست اندازی نہیں کی ہے، نقطۂ نظر کے اس اختلاف کا کیا علاج ہے کہ طباطبائی صاحب تو اسے ''دنائت وتنگ چشمی'' پر محمول کرتے ہیں، لیکن حسن ظن سے کام لینے والے اس کو ''معاشی مہارت'' اور اقتصادی بلند نظری سے تعبیر کریں گے، میر غلام علی صاحب نے اسی ''ملک الکفار'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''بالا جی راؤ با اقتدار کہ سلطنت ہندو دکن بدست آوردہ بود، نان باجرہ می خورد، و نان گندم خوش نداشت، بادنجان خام، وانبہ خام و کرسنہ خام برغبت تمام خوردہ''

(بالا جی راؤ اس اقتدار کے باوجود کہ دکن اور ہندوستان کی سلطنت پر اس کا قبضہ ہو گیا تھا، باجرے کی روٹی کھاتا تھا اور گیہوں کی روٹی اسے اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی، کچے بیگن، کچے آم، کرسنہ (۱) خام، ان سب چیزوں کو بڑی رغبت سے کھاتا تھا)

ان عجیب وغریب خوراکوں اور عجیب باتوں کا ظہور جب اس زمانہ میں ہوا تو کتنوں نے اسے نفس کشی کی مثال قرار دیا، لیکن واقعی میں یہ نفس کشی ہے یا نفس پرستی؟ میر غلام علی کو تو ان حرکات کے پیچھے جو ''چیز'' نظر آتی تھی وہ ان ہی کی زبانی سنئے، ممکن ہے آپ کو یا مجھے اس سے اتفاق نہ ہو لیکن بطور نقل اس کے ذکر میں کیا حرج ہے، فرماتے ہیں:

''چوں اصل پیشہ براہمہ گدائی وکیش ہندوان مقرر شدہ کہ صدقات را بہ براہمہ بائدداد، طباع آں قوم نسلاً بعد نسل بدریوزہ گری معتاد شدہ است وطماعی وابن الغرضی لازم ماہیت برہمنی گردیدہ، بنابریں باوجود حصول مرتبہ سلطنت وامارت شیوہ گدائی از طینت آں ہا بدر نمی رود''

(چونکہ برہمنوں کا اصل پیشہ دریوزہ گری ہے، ان کے دھرم کی مانی ہوئی بات ہے کہ ہر قسم کے دان پُن برہمنوں کو ہی دیئے جائیں، اس کی وجہ سے نسلاً بعد نسل اس قوم کی سرشت میں ابن الغرضی بطور لازم ماہیت کے شریک ہوگئی ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ سلطنت اور حکومت کے درجہ تک پہنچنے کے بعد بھی ان کی فطرت سے شیوۂ گدائی الگ نہ ہو سکا۔)

خود اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ:

''ہر محتاجے کہ بحکام ومتصدیان براہمہ مذکور رجوع کند نظر آنہا ہمیں کہ برائے ما چہ آوردہ، وہر چہ برسر دور او یابند کشیدہ بر آمدہ کار او حوالہ بعالم می کنند''

(۱) کرسنہ کو بہار میں کھساری کہتے ہیں، مثلث شکل، خاکی رنگ کا اناج ہے۔

(کسی قوم کا کوئی حاجتمند جب ان مذکورہ بالا برہمنوں کے حکام اور کارندوں کی طرف رجوع کرتا ہے تو ان حکام اور کارندوں کی نظر اسی پر ہوتی ہے کہ ہمارے لئے وہ کیا لایا ہے، جو کچھ اس بیچارے کے پاس ہوتا ہے اسے بھی گھسیٹ لیتے ہیں اور اس کے کام کو دنیا کے حوالہ کرتے ہیں)

آخر میں داد دیتے ہوئے ایک شعر بھی درج فرماتے ہیں:

بدست خلق عالم کاسۂ دریوزہ می بینم　　　گدا چوں پادشاہ گردد گدا سازد جہانے را

(یعنی میں دنیا کی مخلوق کے ہاتھ میں بھیک کا پیالہ ہی دیکھتا ہوں، گدا جب بادشاہ ہو جائے تو سارے جہاں کو گدا بنا کر رہتا ہے۔)

خدا جانے میر صاحب طب کے ماہر تھے یا نہیں، لیکن اس کے بعد انہوں نے جو لطیفہ درج کیا ہے ممکن ہے کہ اطباء اس کی تصدیق کریں، فرماتے ہیں ان عادات واطوار کی ایک دوسری توجیہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ:

''مدار غذائے آنہا خواہ غنی باشد یا فقیر بر دال تو راست، وبا ایں دال عملے از روغن کہ آں را در ہندی بگھار گویند نمی کنند، واز خارج نیز روغن بکار نمی برند کہ یبوستش را اصلاح نماید، واحیاناً اگر کسے بخورد اقل قلیل مرتبہ ایست کہ گویا نخوردہ (۱) ومرچ سرخ وحلیت وزرد چوبہ ہم در ماکولات شان بسیار استعمال می شود، مرچ سوائے انچہ در پختن داخل نمودہ اند ہنگام خوردن باطعام نیز بافراط می خورند، لہذا نطفہ اینہا پشت بر پشت از ماکولات مذکور متکون می شود'' (۲)

(ان کی خوراک کا دارومدار خواہ امیر ہو یا فقیر صرف تورا (ارہر) کی دال پر ہے، اس دال کے

(۱) اس مرچ سرخ کے متعلق میر صاحب نے ایک اور عجیب خبر سنائی ہے وہ فرماتے ہیں ''دریں دہ بست سال کہ قدم آنہا بہ سرزمین ہندوستان رسیدہ برخے مردم ہندوستان ہم استعمال مرچ سرخ آموختند، پیشتر رواج ایں مرچ در بیت المال ہندوستان نہ بود''۔ (خزانہ عامرہ ص ۴۸) (ادھر دس بیس سالوں میں جب سے یہ ہندوستان پہونچی ہے، ہندوستانیوں نے بھی سرخ مرچ کا استعمال سیکھ لیا ہے، پہلے ہندوستان میں اس مرچ کا رواج نہیں تھا۔) واللہ اعلم بالصواب، کیا کہا جائے، جس طرح چائے ایک حکومت کے زیر ہندوستان کے ہر گھر میں پہنچی ہے، یہی حال اس مرچ سرخ کا بھی ہے؟

(۲) خزانۂ عامرہ میر غلام علی آزاد ص ۴۸۔

ساتھ روغن ڈال کر جو تدبیر کی جاتی ہے جسے ہندوستان میں بگھار کہتے ہیں یہ لوگ اس عمل کو دال کے ساتھ نہیں کرتے، علاوہ اس کے باہر سے بھی روغن اس میں شریک نہیں کرتے تاکہ اس کی خشکی کی کچھ اصلاح ہو، کبھی اگر کوئی روغن ڈالتا بھی ہے تو اس کی مقدار اتنی قلیل ہوتی ہے گویا کہ اس نے روغن کا استعمال نہیں کیا، اسی طرح لال مرچ اور ہینگ، ہلدی بھی ان کے کھانوں میں بہت مستعمل ہے، لال مرچ کو پکاتے وقت تو کھانے میں شریک کرتے ہی ہیں، اس کے سوا جب کھانا کھانے لگتے ہیں، اس وقت بھی بکثرت لال مرچ کو چباتے ہیں، اسی لئے ان کی نسل پشت ہا پشت سے اسی قسم کی خوراکوں سے تیار ہوتی چلی آرہی ہے)

خیر یہ تو اس قوم کی چند خصوصیات کا ایک ضمنی ذکر ہے، چونکہ اس زمانہ میں اس کی تعبیر سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی سے کی جاتی ہے، اور جو قومیں نسلہا نسل سے نہ ان خوراکوں کی عادی ہیں نہ اس طرز زندگی کی، ان سے جب اسی قسم کے لباس، اسی قسم کے کھانوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ گھبراتی ہیں، کچھ دن ساتھ دیتی ہیں اور پھر پیچھے ہٹ جاتی ہیں، مقصود یہ ہے کہ اس کے حقیقی اسباب کی طرف بھی موقع سے اشارہ کرتا چلوں، ورنہ اصل گفتگو تو شاہ صاحب کے خواب کے متعلق ہو رہی تھی، یعنی خواب میں جس شان سے یہ دیکھا گیا تھا، ٹھیک ان ہی خصوصیات کے ساتھ ملک الکفار مسلمانانِ ہند پر مستولی ہو گیا اور ان کے مرکزی مقام پر قبضہ کر لیا تھا۔

شاہ صاحب کے خواب کا دوسرا جزو ہندوستان پر غازی احمد شاہ ابدالی کا حملہ اور مرہٹہ طاقت کی شکست

خواب کے دوسرے اجزاء کے متعلق بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اچانک احمد شاہ ابدالی غازی کا ہندوستان پر جو حملہ ہوا اور مرہٹہ تحریک پانی پت کے میدان میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی، کہا جاتا ہے اور مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس حملہ پر احمد شاہ کو خود ہندوستان کے امیروں اور نوابوں نے عرضداشت بھیج کر آمادہ کیا تھا، جیسا کہ طباطبائی کا بیان ہے:

''نجیب الدولہ وراجہائے ہندوستان از دست مرہٹہ وعماد الملک بجاں آمدہ زوال دولت وملک خود از دست برد مرہٹہ برائے العین مشاہدہ نمود، عرائض استدعا بخدمت احمد شاہ ابدالی نگاشتہ خواہاں ورود او در ہند شدند''

(نجیب الدولہ اور ہندوستان کے مختلف راجواڑے، مرہٹوں اور عماد الملک کے ہاتھوں جاں بلب ہو کر دیکھنے لگے کہ ان کی حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل کر مرہٹوں کے قبضہ میں جارہی ہے، اپنی آنکھوں سے یہ تماشا ان کو نظر آرہا تھا، تب انہوں نے احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں عرائض لکھ کر بھیجے اور اس بات کے خواہش مند ہوئے کہ شاہ ابدالی خود ہندوستان پہنچیں)

لیکن یہ تو باہر والے دیکھ رہے تھے، پر ''بارگاہ الست کے دُور بینوں'' کو انتیس سال پہلے ہی دکھایا گیا تھا کہ یہ:

'ربك لبالمرصاد کا "سوط عذاب" تھا جو ہمیشہ فأكثروا فيها الفساد"(جب لوگ زمین میں بگاڑ اور فساد کو (بھلائی اور خیر سے) آگے بڑھا دیتے ہیں) کے موقعہ پر قدرتی قانون کے ماتحت ظاہر ہوتا رہتا ہے، لوگوں نے ''الغازی الابدالی'' کو ''خدا کا ہاتھ'' خیال کیا، لیکن اس عالم محسوس کے پیچھے بھی جو نظام ہے، وہاں کسی اور نے اپنے آپ کو ''جعلنی كالجارحة'' (مجھے خدا نے بمنزلہ ایک آلہ اور عضو کے قرار دیا) کی شکل میں پایا، باہر والوں نے نجیب الدولہ، شجاع الدولہ، دوندے خاں، رحمت خاں اور آخر میں ان سب کے ساتھ ''ابدالی'' کے قلوب کو غصہ سے معمور پایا، لیکن اندر والے نے اس کو باہر سے نہیں بلکہ اس غضب کی آگ کو ''اندر'' سے بلکہ ''باطن الباطن'' سے بھڑکتے ہوئے ملأ اعلیٰ تک اور ملأ اعلیٰ سے خود اپنے اندر پہنچی ہوئی محسوس کیا، جیسا کہ فرماتے ہیں:

''فغضب اللہ علی أہل الأرض غضباً شدیداً ورأیت صورة ہذا الغضب متمثلة فی الملأ الأعلی ثم ترشح الغضب إلیّ فرأیتنی غضباناً''

(پھر اللہ تعالیٰ زمین والوں پر سخت غصہ کے ساتھ غضبناک ہوا، اور میں نے اسی غصہ کو ملأ اعلیٰ میں متمثل ہوتے ہوئے پایا، وہاں سے ٹپک کر وہی غصہ مجھ میں اترا، پھر میں

نے اپنے آپ کو بھی غضب ناک پایا)

اور یہی آگ تھی جو غیب سے چل کر بالآخر پانی پت کے میدان میں بھڑکی اور جن پر خدا کا غضب تھا وہ اس میں بھسم ہوئے، باہر والوں نے ''پانی پت کی آخری جنگ'' کا مرد میدان احمد شاہ ابدالی رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا، لیکن آج سننے والے سن رہے ہیں کہ اس سلسلہ میں اپنے کو ''قائم الزمان'' کسی اور کو دکھایا گیا تھا۔

شاہ صاحب نے اس خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ خود اس معرکہ میں مسلمانوں نے بھی مسلمانوں کا قتل کیا تھا، اور ان مسلمانوں کے متعلق ان سے پوچھا بھی گیا جس کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، کون نہیں جانتا کہ مرہٹوں کی اس جنگ میں مسلمانوں کی بھی ایک جماعت بطور نوکروں کے مرہٹوں کے ساتھ تھی، ان میں حضرمی عرب بھی تھے اور ہندوستان کے مسلمان بھی، خصوصاً توپ خانہ کا سردار تو آج تک ابراہیم گاردی کے نام سے مشہور ہے جو ''بادوازہ ہزار بندوق چقماقی وتوپہا بضابطۂ فرنگ'' (۱) مرہٹوں کے ساتھ تھا اور اسی نے ایک مدت تک توپوں کی زنجیر بندی کر کے مرہٹوں کو سانس لینے کا موقع دیا اور تعجب ہی کیا اور کیوں ہو، کیا آج بھی مختلف رنگوں میں یہی تاریخ نہیں دہرائی جارہی ہے؟

شاہ صاحب نے یہ بھی دیکھا تھا کہ پوچھنے والوں نے پوچھا کہ ''خدا کا حکم اس وقت کیا ہے؟''، تو آپ نے ''فك كل نظام'' (۲)، (اس وقت ہر قسم کے نظام کو ختم کر دینا چاہیے) فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس وقت پانی پت کی جنگ ہوئی ہندوستان کے تقریباً بڑے بڑے نواب اور امیر اپنی اپنی حکومتوں کو چھوڑ کر آخری فیصلہ کے لئے میدان میں اتر آئے تھے، حتی کہ دلی میں بھی کوئی نظام حکومت باقی نہ تھا اور جب تک ''غضب الٰہی'' کا ظہور رہا اس وقت

(۱) بارہ ہزار بندوقوں اور توپوں کے ساتھ۔

(۲) ہمارے ایک اشتراکی مزاج دوست نے جو اسلامی نظام کو بھی ایک قسم کا اشتراکی نما نظام یا اقرب الاشتراکیت سمجھتے ہیں، نہ معلوم کہاں سے نقل فرمایا ہے کہ شاہ صاحب سے عالم رویا یا مکاشفہ میں جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا یعنی انقلاب کا حکم دیا، غالباً اس کو ارشاد نبوی ٹھہرانے میں ان سے سہو ہوا ہے۔

تک کوئی نظام قائم نہ ہو سکا، شاہ صاحب نے یہ بھی دیکھا کہ ملک الکفار پکڑا گیا اور ذبح ہوا، طباطبائی واقعات کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب کشتوں کے پشتے لگنے لگے تو:

''سرداران اول بسواس راؤ پسر بالا جی راؤ کہ شہزادۂ آنہا بود، درعین شباب بزخم تفنگ آہنگ صحرائے عدم نمود''

(اعلیٰ درجہ کے مرہٹہ سردار بالا جی پیشوا کا بیٹا بسواس راؤ جو مرہٹوں کا شہزادہ تھا عین جوانی کے دنوں میں بندوق کے فائر سے عدم کے صحرا کی طرف روانہ ہوگیا)

ہاشمی صاحب اپنی تاریخ میں ناقل ہیں کہ بھاؤ نے دلی پہنچ کر چاہا تھا کہ اپنے بھتیجے (یعنی اسی بسواس راؤ پسر بالا جی) کو تخت پر بٹھا کر یہ اعلان کردے کہ ''اب ممالک ہند کی شہنشاہی مرہٹہ برہمنوں کی ملکیت ہے''۔ لیکن پھر جنگ کے فیصلہ تک اعلان کے خیال کو ملتوی کر دیا۔

بہر حال تخت شاہی پر بیٹھنے والے بسواس راؤ بھی اور بٹھانے والا بھاؤ بھی اسی جنگ میں ختم ہوئے، طباطبائی ان دونوں کے ذکر کے بعد ایک طویل فہرست درج کرتے ہیں، آخر میں لکھتے ہیں:

''واز سرداران نامور غنیم، احدے جاں سلامت نہ برد مگر دو سہ کس''

(دشمن کے نامور سرداروں میں کوئی اپنی جان بچا کر نہ بھاگ سکا مگر صرف دو تین آدمی)

خواب میں ''ملوکانہ اقتدار'' کے ان مظاہر کو بلکہ ''شہزادہ آنہا'' جس کی بادشاہت کا گویا صرف اعلان کرنا باقی رہ گیا تھا، اگر اسی خواب میں: ''رأيت الدم يخرج من أوداجه متدفقاً'' (میں نے دیکھا کہ اس کی شہ رگ سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے) کی شکل میں دیکھا گیا، تو مثالی اور ناسوتی تعلقات کے جاننے والے کیا تعبیر کی تکمیل میں شک کر سکتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جب تمام مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ:

''بعد از وقوع ایں شکست فاش بالا جی ہم غصہ مرگ گشتہ پس از پنج ماہ وسیزدہ روز نوز

دہم ذیقعدہ سال مذکور بہ پسر و برادر خود ملحق گشت''

(اس فاش شکست کے بعد بالاجی (یعنی پیشوا جو مرہٹوں کا موجودہ بادشاہ تھا) وہ بھی موت کے غصہ کا شکار ہوگیا پانچ مہینے تیرہ روز بعد انیسویں ذیقعدہ کو اسی سال وہ بھی اپنے لڑکے اور بھائی (بھاؤ) کے ساتھ جا کر مل گیا)

تو پھر بغیر ''تاویل'' کے شاہ صاحب کا خواب "کفلق الصبح" بن جاتا ہے، بلکہ خواب میں ملک الکفار کا میدان جنگ میں نہ قتل ہونا اور بعد کو ملک الاسلام کے ساتھ ساتھ چلنا اس کے یہی معنی ہیں کہ ہر طرف سے گھر جانے گویا قیدیوں کے مانند ہونے کے بعد پھر بھی کچھ دن وہ ''ملک الاسلام'' کے ساتھ رسوائی وذلت کی زندگی گزارے گا اور بالآخر ختم ہوجائے گا، یہاں ایک نکتہ قابل لحاظ یہ بھی ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے یہ خواب ذیقعدہ ہی میں دیکھا تھا اور بالاجی راؤ کا انتقال بھی ذیقعدہ ہی میں ہوا۔

درمیان میں ایک خاص چیز جس کی طرف شاہ صاحب نے اجمالاً لیکن بلیغ فقرے میں اشارہ فرمایا ہے وہ اپنے غیظ کے متعلق آپ کا یہ جملہ ہے کہ:

"نفث من تلك الحضرة في نفسي لا من جهة ما يرجع إلى هذا العالم"

(حضرت (الہیہ) کی طرف سے یہ غصہ مجھ میں پھونک دیا گیا، اور اس کا سبب اور منشا کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کا تعلق اس عالم سے ہو)۔

یہ بڑے پتہ کی بات ہے کہ حمیت وغیظ وغضب تو وہ ہوتا ہے، جس کی محرک (مثلاً) اپنی کوئی رسوائی وفضیحت ہوتی ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس میں مومن وکافر سب ہی شریک ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن اس حمیت اور غصے کا خدا کے یہاں بھی اجر ہے یا اس کا شمار "حمية الجاهلية" میں ہے، بہت زیادہ محل غور وتامل ہوسکتا ہے، اسی کی تعبیر حضرت نے کم از کم میرے نزدیک "ما يرجع إلى هذا العالم" سے فرمائی ہے، لیکن ایک حمیت وغیظ وہ ہے جس کی بنیاد "الحب للّٰه والبغض للّٰه" کی نہ ملنے والی چٹان پر قائم ہے، یہی حمیت وغیرت اور یہی غیظ وغضب وہ ہے جس کی پیدا کردہ دعا وہمت اور الحاح وزاری سے غیب اور غیب الغیب

تک کے دوائر میں جنبش پیدا ہوجاتی ہے، سچ پوچھئے تو حمیت کی یہی للّٰہی رگ جب کسی کی پھڑک اٹھتی ہے اور اس مقدس محرک سے جب کسی کے خون میں جوش آتا ہے تو ''بیوہ زن'' کی آہ ''برکند عالے'' کا تماشہ دکھاتی ہے اور شب گیر نالوں کا یہی شور ہوتا ہے جو "المنتقم الجبار" کی انتقامی شانوں کو برسر کار لاکر ملأ اعلی واسفل میں طلاطم پیدا کرکے کتنے ابدالی اور کتنے حافظ الملک، دوندے خاں اور نجیب الدولہ کی شکل عالم ناسوت میں اختیار کرتا ہے، حالانکہ کام کسی کنج نشین کا دلِ شکستہ کرتا ہے لیکن تاریخ والے ان واقعات کو ان ہی ناسوتی مظاہر اور شہادتی قوالب کی طرف منسوب کرتے ہیں، نالوں کی بے تاثیری کے شکوہ کرنے والے چاہیں تو حضرت شاہ صاحب کے اس عمیق لیکن مختصر اشارے ہی سے اپنی ہدایت کی شمع روشن کرسکتے ہیں، اور جو مشکلات کی گرہوں کو دماغ کے زور سے کھولنے میں جب بے بس ہوجائیں تو دل کی قوت سے بھی وہ امداد حاصل کرسکتے ہیں، بہرحال اس کے بعد شاہ صاحب نے دیکھا کہ یکے بعد دیگرے شہروں کو فتح و برباد کرتے ہوئے ہم ''اجمیر'' پہنچ گئے، تاریخوں کو اٹھا کر پڑھیے ٹھیک اسی شان کے ساتھ ابدالی اور ان کے رفقاء شہروں کو فتح کرتے ہوئے ''اسلامی مرکز'' یعنی دہلی پہنچ گئے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ملک الکفار کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں پر رحمت وسکینت نازل ہوئی اور ان پر خدا کا رحم ہوا، ظاہر ہے کہ اس ''فتح'' کے بعد وہی لوگ جن کا مال چھینا گیا اور جن کی شاہی حرم سرائیں کفار کے قبضے میں آگئی تھیں، وہی غنیم کی فوج سے:

''دو ہزار غلام وکنیز کہ اکثرے از اولاد واحفاد سرداران ومتوسطان بود در عسکریان ابدالی تقسیم یافت، وغنائمے کہ در احاطہ وانحصار نمی گنجد از جواہر ونقود واجناس دیگر وتوپ خانہ وپنجاہ ہزار اسپ ودو لاکھ گاؤ وچندیں ہزار شتر وپانصد فیل کوہ پیکر بدست عساکر منصورہ افتاد''(۱)

(دو ہزار غلام اور لونڈیاں جن میں اکثر بڑے اور اوسط درجہ کے لوگوں کے خاندان

---

(۱) ص ۹۱۴۔

سے تعلق رکھتی تھیں، ابدالی کے لشکر میں تقسیم ہوئیں اور جواہر ونقد روپیہ اور دوسری قسم کی چیزیں توپ خانے وغیرہ کے ذیل کی بیشمار مال غنیمت میں ہاتھ آئیں، پچاس ہزار گھوڑے، دولاکھ بیل اور کئی ہزار اونٹ، پانچ سو ہاتھی کوہ پیکر کامیاب اور فتحمند فوج کے قبضہ میں آئے۔)

شاہ ابدالی کا بے نظیر ایثار اور اس کا راز

اس ''تاریخی معمہ'' کا حال بھی شاہ صاحب کی اس رویاءِ صادقہ میں اگر لوگ چاہیں تو تلاش کرسکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کرنے دھرنے کے بعد شاہ غازی ابدالی "أنار الله برهانه" نے:

''شانزدہم شعبان سال مذکور از باغ شالا مار دہلی بقصد قندھار یکراں ہمت زیر راں کشید وکلمہ مراجعت قندھار نمود''۔

(اسی سال کی سولہویں شعبان کو دلّی کے شالا مار باغ سے ہمت کے گھوڑے پر سوار ہوکر قندھار کا ارادہ فرمایا اور اسی طرف پلٹ گئے)

اور بخوشی ورضا شاہ ابدالی نے:

''سلطنت برائے شاہ عالم ووزارت بنام شجاع الدولہ وامیر الامرائی بنام نجیب الدولہ مقرر نمود''۔

(سلطنت شاہ عالم کے نام، وزارت شجاع الدولہ کے نام اور امیر الامرائی نجیب الدولہ کے نام مقرر فرما کر خود قندھار چل دیئے)۔

لوگ حیران ہیں کہ اتنے بڑے برّ اعظم پر اتنی عظیم کامیابی وفتحمندی کے بعد ابدالی کا ملک کو شاہ عالم ہی کے سپرد کرکے قندھار جیسی معمولی حکومت کی طرف واپس ہوجانے کا کیا راز تھا؟ حضرت شاہ صاحب کا وہی فقرہ کہ یہ جو کچھ تھا کسی اور عالم کی بات تھی، "لا ما يرجع إلى هذا العالم" (اس کا تعلق اس دنیا کے قانون سے نہ تھا)۔

اگر یہ صحیح ہے، اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے، تو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی، غازی ابدالی قدس اللہ سرہ نے اپنے دین کو دنیا اور اپنے خدا کو بُت بنانا نہیں چاہا،

جن کے اندر "إن الدار الآخرة لهي الحيوان" اور " والآخرة خير وأبقى" کا یقین راسخ نہیں ہوا، اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہوسکتی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ان کو اعتماد کامل میسر نہیں ہوا ہے ورنہ اس کی توثیق وتکمیل کے بعد یقیناً ان کو بھی وہی نظر آسکتا ہے جو ابدالی مؤثر الآخرة على الدنيا کو نظر آیا تھا، لیکن "رضوا بالحيوٰة الدنيا واطمأنوا بها" جن کا انتہائی مبلغ علم ہو، ان کے فہم سے سچ ہے کہ یہ بات بعید ہی نہیں بلکہ ناممکنات کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ محمدی معجزوں میں اگر کوئی چاہے تو ''ایثار ابدالی'' کو بھی شریک کرسکتا ہے۔

نقمت اور نعمت کے بعد مسلمانوں کی غفلت اور خدا فراموشی

یہ واقعہ بھی گزر گیا اس فتنہ کا شباب بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی زندگی میں ہوا اور اس دنیا سے روانہ ہونے سے پہلے اپنے خواب کی تعبیر بھی انہوں نے دیکھ لی۔ لیکن جن مسلمانوں کے ''مکاسب ابدی'' اور ''زشتیِ اعمال'' نے مرہٹوں کی شکل اختیار کی تھی، باوجود سب کچھ دیکھنے کے کیا ان میں کوئی تغیر پیدا ہوا تھا، حضرت شاہ صاحب کا مکاشفہ کہ مسلمانوں اور اسلام پر ''ملک الکفار'' کی جانب سے جو مظالم ہو رہے تھے اسی سے:

"غضب الله تعالى على أهل الأرض غضباً شديداً"

(زمین والوں پر حق تعالی سخت غصہ کے ساتھ غضب ناک ہوئے)

کا ظہور ہوا تھا، واحسرتاہ، یا ویلاہ! کہ ''غیب'' میں جس امت کی یہ ناز برداریاں ہیں، آہ! کہ اس کی بے نیازیوں میں سچ پوچھئے تو کوئی کمی نہیں، یا بہت کم کمی واقع ہوئی تھی اور اپنی زشتیِ اعمال کو ''صورت نادر'' بھی قرار دیتے تھے، وہ سکھی اور مرہٹی فتنوں کو خدا کی تنبیہ بھی سمجھتے تھے لیکن باوجود سب کچھ سمجھنے کے کچھ نہیں سمجھتے تھے، باوجود سب کچھ دیکھنے کے انہیں کچھ نہیں سوجھتا تھا، فطرتیں مسخ ہوچکی تھیں، دلوں پر میل اور زنگ چھایا ہوا تھا، دیکھتے تھے، اور نہیں دیکھتے تھے، سنتے تھے اور نہیں سنتے تھے، سننے والے بہرے اور دیکھنے والے اندھے ان میں زیادہ پیدا ہوچکے تھے۔

شاہ ولی اللہ کی چیخ وپکار اور خطرے کا مسلسل الارم

وہ ''قدسی روح'' جو اس بجھتے ہوئے چراغ کو آخری دفعہ سنبھالا دینے کے لئے ''غیب'' سے ہندوستان کے مسلمانوں کو دی گئی تھی، وہ چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی، لیکن ان میں کم تھے جو اس نقار خانہ میں طوطی کی اس آواز پر کان دھرتے، میری مراد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ہے، ان کی مختلف کتابوں میں ان کی چیخ وپکار کی شورشیں اس وقت تک بند ہیں، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ''پیغام'' کیا تھا، مختلف طریقوں سے وہ مسلمانوں پر پیش کیا جاتا تھا، لیکن ان میں علم بانوں، کتاب بازوں اور معارف فروشوں کا ایک گروہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا، غلطی ہوئی اور بڑی غلطی ہوئی کہ شاہ ولی اللہ کو بھی ان ہی پیشہ وروں میں سے ایک خیال کیا گیا، حالانکہ وہ ہر بات میں ان سے جدا تھا، اس کی آواز سب سے نرالی تھی، لیکن اس کی تمیز کس میں باقی تھی۔

مسلمانوں کے مختلف طبقات کے نام شاہ صاحب کا ایک پیغام اور سب کے لئے مفصل پروگرام

بطور نمونہ کے حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک پیغام کا ترجمہ درج کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ لیلاً ونہاراً اور سراً وجہراً جس امر کی دعوت دے رہے تھے وہ کیا تھا، ''تفہیمات الٰہیہ'' کے جامع نے ایک جگہ اس کو بھی درج کر دیا ہے، میں اسی کا ترجمہ پیش کرتا ہوں، کیونکہ اصل عبارت کے نقل کرنے میں طوالت ہوگی، عربی کے جاننے والے عربی میں پڑھ سکتے ہیں، خدا جزائے خیر دے مجلس علمی ڈابھیل کو جس نے ان چند سالوں میں ان گراں بہا دفینوں کو وقف عام کر دیا ہے، بہرحال منجملہ تفہیمات کے ایک طویل تفہیمی مقالے کے بعض اجزاء یہ ہیں، جس میں مسلمانوں کے مختلف طبقات اور گروہوں کو ان کے موجودہ حالات پر تنبیہ کر کے آپ نے اصلاح کی راہ سمجھائی ہے۔

سلاطین اسلام سے خطاب

مثلاً سلاطین اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اے بادشاہو! ملأ اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تمام تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو، جب تک مسلم، مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہوجائے اور اہل کفر وفسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جا کر شامل نہ ہوجائیں اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھاسکیں۔ قاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله ۔ (یعنی ان سے جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ فرو ہوجائے اور ''دین'' صرف اللہ کے لئے مخصوص ہوجائے) پھر جب کفر واسلام کے درمیان ایسا کھلا نمایاں امتیاز پیدا ہوجائے، تب تمہیں چاہیے کہ ہر تین دن یا چار دن کے سفر کی منزلوں پر ایک ایک حاکم مقرر کرو، ایسا حاکم جو عدل وانصاف کا مجسمہ ہو، قوی ہو، جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کرسکتا ہو اور خدا کے حدود کو قائم کرسکتا ہو، اور اس میں سرگرم ہو کہ پھر لوگوں میں بغاوت وسرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں، وہ جنگ پر آمادہ نہ ہوں اور دین سے مرتد ہونے کی کسی میں جرأت باقی نہ رہے، نہ کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی کسی کو مجال ہو، اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو، اور اس کے شعائر کا علانیہ اظہار کیا جائے، ہر شخص اپنے متعلقہ فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے، چاہیے کہ ہر شہر کا حاکم اپنے پاس اتنی قوت رکھے، جس کے ذریعہ سے اپنے متعلقہ آبادی کی اصلاح کرسکتا ہو، مگر اسی کے ساتھ اس کو اتنی قوت فراہم کرنے کا موقع نہ دیا جائے جس کے بل بوتے پر وہ خود ان سے نفع گیر ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے اور حکومت کے مقابلہ پر آمادہ ہوجائے، چاہیے کہ اپنے متعلقہ مقبوضات کے بڑے علاقہ اور اقلیم پر ایسے امیر مقرر کئے جائیں جو جنگی مہمات کا بھی اختیار رکھتے ہوں، ایسے امیر کے ساتھ بارہ ہزار کی جمعیت رکھی جائے مگر جمعیت ایسے آدمیوں سے بھرتی ہو جن کے دل میں جہاد کا ولولہ ہو اور خدا کی راہ میں کسی کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوں، ہر سرکش ومتمرد سے جنگ اور مقابلے کی ان میں صلاحیت ہو......اے بادشاہو! جب تم یہ کرلو گے تو اس کے بعد ملأ اعلیٰ کی رضامندی یہ چاہے گی کہ تم لوگوں کی منزلی اور عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو، ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ اور ایسا کردو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے جو شرعی قوانین

کے مطابق نہ ہو، اسی کے بعد لوگ امن وامان کی صحیح مسرت سے فائز المرام ہو سکتے ہیں‘‘۔

امراء وارکانِ دولت سے خطاب

اسلامی امیروں کو مخاطب فرماتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’اے امیرو! دیکھو، کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جارہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں......کیا تم علانیہ شراب نہیں پیتے؟ اور پھر اپنے اس فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے؟ تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کئے ہیں کہ ان میں زنا کاری کی جائے اور شرابیں ڈھالی جائیں، جوا کھیلا جائے، لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے اور اس حال کو نہیں بدلتے، کیا حال ہے ان بڑے بڑے شہروں کا جن میں چھ سوسال سے کسی پر حد شرعی نہیں جاری ہوئی، جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور جب قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو، تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہورہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو، اور نرم وگداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے ہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی، کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے؟ خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہانیوں میں اس نام کو استعمال کرو اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانے کا انقلاب ہے کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کردے یعنی زمانے کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے‘‘۔

فوجی سپاہیوں کو خطاب

اے فوجیو اور عسکریو! تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا، مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہوگی اور خدا کا کلمہ بلند ہوگا اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دنیا سے نکال پھینکو گے لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے اسے تم چھوڑ بیٹھے، اب جو تم گھوڑے پالتے ہو، ہتھیار جمع کرتے ہو اس کا

مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ محض اپنی دولت میں اس سے اضافہ کرو اس سلسلہ میں جہاد کی نیت سے تم بالکل خالی الذہن رہتے ہو، تم شراب پیتے ہو، بھنگ کے پیالے چڑھاتے ہو، ڈاڑھیاں منڈواتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو، عام لوگوں پر زیادتیاں اور ظلم کرتے ہو حالانکہ جو کچھ ان کا لے کر کھاتے ہو اس کی قیمت ان تک نہیں پہنچتی، خدا کی قسم، تم عنقریب اللہ کی طرف واپس جاؤ گے پھر تمہیں وہ بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے، تمہارے ساتھ خدا کی یہ مرضی ہے کہ اچھے پارسا، صالحین، غازیوں کا لباس اور ان کی وضع اختیار کرو، چاہیے کہ اپنی ڈاڑھیاں بڑھاؤ، مونچھیں کٹواؤ، پنج وقتہ نماز ادا کیا کرو، اور عام لوگوں کے مال سے بچتے رہو جنگ اور مقابلے کے میدان میں ڈٹے رہو، تمہیں چاہیے کہ سفر اور جنگ وغیرہ کے موقع پر نماز میں جو آسانیاں اور رخصتیں رکھی گئی ہیں انہیں سیکھ لو مثلاً قصر کرنا، جمع کرنا، سنتوں کے ترک کرنے کی اجازت ہے اس سے واقف ہونا، تیمّم کی اجازت سے مطلع ہونا، پھر اس کے بعد نماز کو خوب زور سے پکڑ لو اور اپنی نیتوں کو درست کرلو اور اللہ تعالیٰ تمہارے جاہ ومنصب میں برکت دے گا اور دشمنوں پر تمہیں فتح عطا فرمائے گا‘‘۔

اہل صنعت وحرفت سے خطاب

عام پیشہ وروں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

ارباب پیشہ! دیکھو، امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے، تم اپنے رب کی عبادت سے خالی الذہن ہو چکے ہو اور تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو تم مدار اور سالار کا حج کرتے ہو، تم میں بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹوٹکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے، یہ لوگ خاص قسم کا لباس اور بانا اختیار کرتے ہیں، خاص طرح کے کھانے کھاتے ہیں، ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے وہ

اپنی عورتوں اور بچوں کے حقوق کی پروانہیں کرتے، تم میں بعض صرف شراب خوری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں اور تم ہی میں کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ پالتے ہیں، یہ کیسا بدبخت آدمی ہے، اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے، حالانکہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے مختلف قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں، جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لئے کافی ہوسکتے ہیں، بشرطیکہ تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ جو تمہیں بآسانی اخروی زندگی کے نتائج تک پہونچادے، لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی اور غلط راہ حصول رزق کی اختیار کی، کیا تم جہنم کے عذاب سے نہیں ڈرتے جو برا بچھونا ہے، دیکھو! اپنی صبح وشام کو خدا کی یاد میں بسر کیا کرو اور دن کے بڑے حصہ کو اپنے پیشہ میں صرف کرو اور رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ گزارو، اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی، مسکینوں کی مدد کیا کرو اور کچھ اپنے اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لئے پس ماندہ بھی کیا کرو، تم نے اگر اس راہ کو اختیار نہ کیا تو تم غلط راہ پر جا رہے ہو، اور تمہاری تدبیر درست نہیں ہے۔

پھر اس طرح مشائخ کی اولاد، اس زمانے کے عام طلبۂ علم اور واعظوں، زاہدوں کو بھی آپ نے خصوصیت کے ساتھ پکارا ہے، مثلاً مشائخ کی اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب

اے وہ لوگو جو اپنے آباء کے رسوم کو بغیر کسی حق کے پکڑے ہوئے ہو یعنی گزشتہ بزرگانِ دین کی اولاد میں ہو میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹکڑیوں ٹکڑیوں، ٹولیوں ٹولیوں میں آپ بٹ گئے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے راگ اپنی اپنی منڈلی میں الاپ رہا ہے اور جس طریقہ کو اللہ نے اپنے رسول محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ نازل فرمایا تھا اور محض اپنے لطف وکرم سے جس راہ کی طرف رہنمائی فرمائی تھی، اسے چھوڑ کر ہر ایک تم میں ایک مستقل پیشوا بنا ہوا ہے، اور لوگوں کو اسی طرف بلا رہا ہے، اپنی جگہ اپنے کو راہ یافتہ اور رہنما

ٹھہرائے ہوئے ہے، حالانکہ دراصل وہ گم کردہ راہ اور دوسروں کو بھٹکانے والا ہے، ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تاکہ ان سے ٹکے وصول کریں، ایک علم شریف کو سیکھ کر دنیا بٹورتے ہیں، کیونکہ جب تک اہل دین کی شکل وشباہت اور طرز وانداز نہ اختیار کریں گے دنیا حاصل نہیں ہوسکتی۔

اور نہ میں ان لوگوں سے راضی ہوں جو سوائے اللہ ورسول خود اپنی طرف بلاتے ہیں اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں، یہ لوگ بت مار اور راہگیر ہیں، ان کا شمار دجالوں، کذابوں، فتانوں اور ان لوگوں میں ہے جو خود فتنہ اور آزمائش کے شکار ہیں۔

خبردار! خبردار! ہرگز اس کی پیروی نہ کرنا جو اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو، اور اپنی طرف بلاتا ہو، اور چاہیے کہ زبانی جمع خرچ صوفیہ کرام کے اشاروں کے متعلق عام مجلسوں میں نہ کیا جائے، کیونکہ مقصد تو (تصوف سے) صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا مقام حاصل ہو جائے، لوگو! دیکھو کیا تمہارے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ارشاد میں کوئی عبرت نہیں ہے:

"إن هذا صراطي مستقيماً فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله"۔

"یہ میری راہ ہے سیدھی تو اس پر چل پڑو اور مختلف راہوں کے پیچھے نہ پڑو، وہ تمہیں اللہ سے بچھڑا دیں گی"

طلبہ علم سے خطاب

پھر اس زمانے کے طلبۂ علم کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:

اے بدعقلو! جنہوں نے اپنا نام "علماء" رکھ چھوڑا ہے تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو، اور صرف ونحو ومعانی میں غرق ہو، اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے، یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔

چاہیے کہ قرآن سیکھو! پہلے اس کے غریب لغات کو حل کرو، سبب نزول کا پتہ چلاؤ اور اس کے مشکلات کو حل کرو، اسی طرح جو حدیث رسول اللہ ﷺ کی صحیح ثابت ہو چکی ہے اسے محفوظ کرو یعنی رسول اللہ ﷺ نماز کس طرح پڑھتے تھے، وضو کرنے کا حضور ﷺ کا کیا طریقہ

تھا، اپنی ضروریات کے لئے کس طرح جاتے تھے اور حج کیونکر ادا فرماتے تھے، جہاد کا آپ کے کیا قاعدہ تھا، گفتگو کا کیا انداز تھا، اپنی زبان کی حفاظت کس طرح فرماتے تھے، حضورﷺ کے اخلاق کیا تھے، چاہیے کہ حضورﷺ کی پوری روش کی پیروی کرو، اور آپﷺ کی سنت پر عمل کرو، مگر اس میں بھی اس کا خیال رہے کہ جو سنت ہے اسے سنت ہی سمجھو نہ کہ اسے فرض کا درجہ عطا کرو، اسی طرح چاہیے کہ جو تم پر فرائض ہیں انہیں سیکھو مثلاً وضو کے ارکان کیا ہیں، نماز کے ارکان کیا ہیں، زکوۃ کا نصاب کیا ہے، قدر واجب کیا ہے، میت کے حصوں کی مقدار کیا ہے، پھر حضورﷺ کی عام سیرت کا مطالعہ کرو جس سے آخرت کی رغبت پیدا ہو، صحابہ اور تابعین کے حالات پڑھو اور یہ چیزیں فرائض سے فاضل اور زیادہ ہیں لیکن ان دنوں جن چیزوں میں تم الجھے ہوئے ہو اور جس میں سر کھپا رہے ہو اس کو آخرت کے علم سے کیا واسطہ، یہ دنیا کے علوم ہیں۔

پھر ان ہی طلبہ کو فرماتے ہیں:

جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع و آلات کی ہے (مثلاً صرف ونحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو، نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم کا پڑھنا تو اسی لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو، لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو ضرورت سے زائد باتوں کا مشورہ دے رہے ہو، تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے، حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں جو علماء سے خالی ہیں اور جہاں علماء پائے بھی جاتے ہیں وہاں بھی دینی شعاروں کو غلبہ حاصل نہیں ہے۔

دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظوں اور کنج نشین زاہدوں سے خطاب

پھر آپ نے ان لوگوں کو بھی مخاطب کیا ہے جنہوں نے اپنے وسوسوں کا نام دین رکھ چھوڑا ہے اور جو ان کے وسواسی معیار پر پورا نہیں اترتا، گویا دین سے وہ خارج ہے، اس گروہ

میں زیادہ تر زہاد، عبّاد اور وعّاظ ہی اس زمانے میں مبتلا تھے، اس لئے عنوان کا آغاز ان ہی سے کیا گیا، فرماتے ہیں:

دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں اور واعظوں، عابدوں اور ان کنج نشینوں سے سوال ہے جو خانقاہوں میں بیٹھتے ہیں کہ یہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا کیا حال ہے، ہر بری بھلی بات، ہر رطب ویابس پر تمہارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گڑھی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم تو (اے امت محمدیہ) اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دو گے، تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہو جو بیچارے مغلوب الحال تھے اور عشق ومحبت الٰہی میں عقل وحواس بھی کھو بیٹھے تھے، حالانکہ اہل عشق کی باتیں وہیں کی وہیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں نہ کہ ان کا چرچا کیا جاتا.....تم نے وسواس کو اپنے لئے گوارا کر لیا ہے اور اس کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے، حالانکہ تمہیں صرف یہ چاہیے تھا کہ اعتقاداً وعملاً احسان کے مقام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے بس اس کو سیکھ لیتے، لیکن جو بیچارے اپنے خاص حال میں مغلوب تھے، خواہ مخواہ ان کی باتوں کو احسانی خالص امور میں گڈمڈ کرنے کی حاجت نہ تھی اور نہ ارباب کشف کی چیزوں کو ان میں مخلوط کرنے کی ضرورت تھی۔

چاہیے کہ مقام احسان کی طرف لوگوں کو بلاؤ، پہلے اسے خود سیکھ لو پھر دوسروں کو دعوت دو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سب سے بڑی رحمت اور سب سے بڑا اکرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول اللہﷺ نے پہنچایا ہے، وہی صرف ہدایت ہے جو آپ کی ہدایت ہے۔

پھر تم کیا بتا سکتے ہو کہ جن افعال کو تم کرتے ہو وہ رسول اللہﷺ اور آپ کے صحابہؓ کیا کرتے تھے۔

عام امت مسلمہ سے جامع خطاب امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز

آخر میں ایک پیغام عام مسلمانوں کے نام ہے جس میں کسی خاص طبقے کی تخصیص نہیں ہے، فرماتے ہیں:

’’میں مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف اب مخاطب ہوں اور کہتا ہوں، آدم کے بچو! دیکھو!! تمہارے اخلاق سو چکے ہیں تم پر بے جا حرص و آز کا ہو کا سوار ہو گیا ہے تم پر شیطان نے قابو پا لیا ہے، عورتیں، مردوں کے سر چڑھ گئی ہیں اور مرد عورتوں کے حق برباد کر رہے ہیں، حرام کو تم نے اپنے لئے خوشگوار بنا لیا، اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے پھر قسم ہے اللہ کی، اللہ نے ہرگز کسی کو اس کے بس سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے، چاہئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو، خواہ تمہیں ایک سے زیادہ نکاح ہی کیوں نہ کرنا پڑے ،اور اپنے مصارف، وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو، اسی قدر خرچ کرو جس کی تم میں سکت ہو، یاد رکھو! ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا اور اپنے اوپر خواہ مخواہ تنگی سے کام نہ لو، اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کی حدود تک پہنچ جائیں گے، اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اسکے بندے اس کی آسانیوں سے نفع اٹھائیں، جیسا کہ یہ بھی اسی کو پسند ہے کہ جو چاہیں وہ اعلیٰ مدارج پر احکام کی پابندی بھی کر سکتے ہیں، اپنے شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہئے کہ کھانوں سے کرو اور اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں ،دوسروں کے سینے کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو، کہ ان سے مانگ کر کھایا کرو، تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں، اسی طرح بے چارے بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ، تمارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو، اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمہیں معاش کی بھی راہ سمجھائے گا جو تمہارے لئے کافی ہوگی۔

اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو، جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے سیر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے، ایسی بیوی جو اس کی شرم گاہ کی حفاظت کر سکتی ہو، اور اس کے رہن سہن کی جد و جہد میں مدد دے سکتی ہو، تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے، چاہئے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔

بہرحال کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے اور اسی کے ساتھ قناعت کو اپنا دستور زندگی بنائے اور رہنے سہنے میں اعتدال کا جادہ اختیار کرے اور اللہ کی یاد کے لئے جو فرصت ہم دست ہو اسے غنیمت شمار کرے، کم از کم تین وقتوں صبح و شام اور پچھلی رات کے ذکر کا خاص طور پر خیال رکھے، حق تعالیٰ کی یاد، اس کی تسبیح و تہلیل اور قرآن کی تلاوت کے

ذریعہ سے کیا کرے، اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور ذکر کے حلقوں میں حاضر ہوا کرے۔

اے آدم کے بچو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لئے ہیں، جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے، تم عاشورہ کے دن جھوٹی باتوں پر اکٹھا ہوتے ہو، اسی طرح شب برات میں کھیل کود کرتے ہو اور مردوں کے لئے کھانے پکا پکا کر کھلانے کو اچھا خیال کرتے ہو، اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو۔

اسی طرح اور بھی بُری بُری رسمیں تم میں جاری ہیں، جس نے تم پر تمہاری زندگی تنگ کر دی ہے، مثلاً تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے، اسی طرح ایک بری رسم یہ بھی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن طلاق کو گویا تم نے ناجائز ٹھہرا لیا ہے، یوں ہی بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکے رہتے ہو، ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو، وقت برباد کرتے ہو اور جو صحت بخش روش تھی اسے چھوڑ بیٹھے ہو، تم نے اپنی نمازیں برباد کر رکھی ہیں تم میں کچھ لوگ ہیں جو دنیا کمانے میں اور اپنے دھندوں میں اتنے پھنس گئے ہیں کہ نماز کا انہیں وقت ہی نہیں ملتا، کچھ لوگ ہیں جو قصہ کہانی سننے میں وقت گنواتے ہیں، خیر پھر بھی اگر ایسی مجلسیں لوگ ایسے مقامات پر قائم کیا کرتے جو مسجدوں سے قریب ہوں تو شاید ان کی نمازیں ضائع نہ ہوتیں، تم نے زکوٰۃ کو بھی چھوڑ دیا ہے، حالانکہ کوئی ایسا دولت مند نہیں ہے، جس کے اقرباء، اعزاء میں حاجت مند لوگ نہیں ہوتے، اگر ان لوگوں کی وہ مدد کیا کریں، ان کو کھلایا پلایا کریں اور زکوٰۃ کی نیت کر لیا کریں تو یہ بھی ان کے لئے کافی ہو سکتی ہے، تم میں بعض نے روزے چھوڑ رکھے ہیں، خصوصاً جو فوجی ملازم ہیں کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہیں، یعنی جو محنت انہیں برداشت کرنی پڑتی ہے اس کے ساتھ روزے نہیں رکھ سکتے، تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ تم نے راہ غلط کر دی ہے اور تم حکومت کے سینے پر بوجھ بن گئے ہو، بادشاہ جب اپنے خزانے میں اتنی گنجائش نہیں پاتا، جس سے تمہاری تنخواہ ادا کرے تب رعایا پر زندگی کو دشوار کرتا ہے، سپاہیو! یہ تمہاری کیسی بری عادت ہے، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو روزے رکھتے ہیں لیکن سحری نہیں کرتے اور رمضان میں ان سخت کاموں کو نہیں چھوڑتے جن کی وجہ سے روزے ان پر گراں گزرتے ہیں‘‘۔

آخر میں فرماتے ہیں:

’’ملأ اعلیٰ کی طرف سے اصلاحی مطالبات کا اس زمانے میں جن امور کے متعلق

تقاضہ ہورہا ہے اس کا ایک طویل باب ہے، کھڑکی سے آدمی بڑی نیکیوں کو جھانک سکتا ہے،
اور ڈھیر کے لئے اس کا نمونہ کافی ہے“۔

میں نے قصداً شاہ صاحب کے ان دعوتی پیغاموں کا ترجمہ پیش کیا ہے، جس سے اس کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کے ہر طبقہ کی ہندوستان میں کیا حالت ہوچکی تھی، نیز اس سے حضرت شاہ صاحب کے اندرونی جذبات واحساسات کا بھی سراغ مل سکتا ہے کہ ان کی نگاہیں کہاں کہاں تھیں، جو لوگ ان کی کتابوں کو حنفیت، شافعیت، تقلید وعدم تقلید یا صرف تصوف وکلام کے متعلقہ مباحث تک محدود خیال کرتے ہیں ان کے لئے بھی ان تقریروں میں تنبیہ ہے، چاہئے کہ شاہ صاحب کی خدمات کی قیمت لگاتے ہوئے ذرا زیادہ بلند نظری سے وہ کام لیں۔

ہندی مسلمانوں کا جمود یا مرنے کا تہیہ

خلاصہ یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے تکوینی طور پر بھی مسلمانانِ ہند کو مسلسل الارم دیا جارہا تھا اور تشریعی حیثیت سے پیغمبروں کے صحیح جانشینوں کو اٹھایا جارہا تھا جو انہیں بار بار چونکا رہے تھے، جگا رہے تھے، لیکن وہ اپنی جگہ کچھ اور فیصلہ کرچکے تھے، ان کے بڑے اور چھوٹوں نے گویا مرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔

ادھر مرہٹوں کا نازک ترین مرحلہ محض اللہ کے رحم وکرم سے طے ہوگیا تھا، چاہئے تھا کہ آنکھیں کھل جاتیں لیکن شاہ صاحب کے جو کچھ مطالبات تھے ان میں سر مو فرق نہ ہوا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں فساد کے ایک جرثومہ کی جڑ نکلی تھی، بلکہ سچ یہ ہے کہ شاہ ابدالی غازی نے سکھوں کی قوتوں پر بھی مختلف ضربیں ایسی لگائیں تھیں کہ پنجاب کے مسلمان اگر چاہتے تو وقفہ کی ان گھڑیوں میں جاگ سکتے تھے، لیکن وہ اسی طرح سوتے رہے جیسے پہلے تھے، گویا ان کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

قدرتی قانون کے مطابق اس خوابِ غفلت کی سزا انگریزی اقتدار کا آغاز

آخر قدرت کے قوانین جو اٹل ہیں وہ بھی کام کرتے رہے، ادھر اندرونی فتنوں کی شدت میں کچھ کمی ہوئی، لیکن شمال مشرق اور جنوب مشرق کے ساحلی کناروں سے وہی قوم جس کے متعلق مسلمانوں کے اہل لغت کبھی یہ لکھا کرتے تھے کہ:

”انگریز بروزن رنگریز نوعی ست از نوع انسانی کہ گاہ گاہ کنارِ دریا ظاہر می شود۔“
”انگریز کا لفظ رنگریز کے وزن پر ہے، یہ انسانی نوع کی ایک قسم ہے جو کبھی سمندر کے کنارے نمایاں ہوتی ہے۔“

تو ان ہی دنوں میں جب پانی پت کے میدانوں میں مرہٹوں کا یہ فیصلہ ہورہا تھا، قدرت کسی اور فیصلہ کا انتظام کررہی تھی، بنگال کے ناظم سراج الدولہ کی فوج لارڈ کلیف (المشہور بہ کلایو) کے اس شبخون حملہ سے دل از دست رفتہ ہوچکی تھی، جس میں غالباً پہلی دفعہ چقماقی بندوقوں کے چلانے والوں کو کارتوسی گولیوں کا تجربہ ہوا تھا۔

سراج الدولہ کی فوج پر کارتوسی بندوقوں کے ساتھ لارڈ کلایو کا پہلا شبخون حملہ

طباطبائی نے لکھا ہے کہ کلایو اور اس کے ساتھی:

”ساعتے از شب باقی ماندہ، اکثر از کشتی فرود آمدہ از طرف پشت لشکر تفنگ افگنان داخل شدند، وفاصلہ در شلک ندا دہ قدم بقدم راہ می پیمودند و گولہ تفنگ چوں تگرگ بلا بر سر لشکریان سراج الدولہ می بارید“

(کچھ رات رہے بہت سے انگریز کشتی سے اتر کر سراج الدولہ کی فوج کے پشت کی طرف سے بندوقیں سر کرتے ہوئے اس کی فوج میں گھس گئے، وہ باڑھ مارنے میں وقفہ نہیں دیتے تھے اور مسلسل مارچ کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے تھے، اور بندوق کی گولیاں اولوں کی طرح سراج الدولہ کے فوجیوں پر برس رہی تھیں)

سراج الدولہ کے لشکر میں ابتری اور قیامت کا نمونہ

ظاہر ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کو ”گولہ تفنگ چوں تگرگ“ کا پہلی دفعہ تجربہ ہوا تھا،

وہاں نہ ڈھال کام آتی تھی، نہ نیزہ، نہ تلوار، اور نہ اس کے ہاتھ اور پینترے، نتیجہ یہ ہوا کہ:

''بہ مشاہدہ ایں رست خیز کہ نمونہ محشر دراں معسکر آشکارا ونمایاں گشتہ بود، دل از دست رفتہ اضطرابے وہراسے عظیم ورخاطر جائے گرفت۔''

(اس بھاگ دوڑ میں جو قیامت کا نمونہ سراج الدولہ کی چھاؤنی میں قائم ہوگیا تھا، لوگوں کے دل قابو سے نکل گئے، دلوں میں سخت خوف وہراس نے جڑ پکڑ لی)

میر جعفر کی غداری اور جنگ پلاسی میں انگریزوں کی فتح

اگر چہ واقعہ ''پانی پت'' کے سانحہ سے تین سال پہلے پیش آیا تھا، لیکن ''تفنگ چوں تکرگ'' کے مقابلے میں سپاہیوں میں پھر کبھی ہمت نہ ہوئی اور بالآخر ''پلاسی'' کے مشہور میدان میں اس لئے کہ:

''میر جعفر خاں ودیگراں کہ باعث ایں فساد وخواہان شکست سراج الدولہ بودند، از دور بطرفیکہ متعین بودند استادہ تماشائے می نمودند''

(میر جعفر خاں اور دوسرے لوگ جو اس فساد کے بانی مبانی تھے اور سراج الدولہ کی شکست کے آرزومند تھے جس مقام پر متعین تھے دور ہی کھڑے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے)

سراج الدولہ کا لرزہ خیز قتل

جو مقدر تھا وہ پورا ہوا، اپنے نمک حرام، طوطا چشم ملازم میر جعفر کا قیدی سراج الدولہ، محمدی بیگ سے جو اس کے قتل کے لئے بھیجا گیا تھا یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ:

''آیا راضی نمی شوند کہ در گوشہ افتادہ زندگی کنم''

(کیا (میر جعفر وغیرہ) اس پر بھی راضی نہیں ہیں کہ کسی گوشہ تنہائی میں پڑا میں زندگی گزار دوں؟)

لیکن اس کے باپ اور نانا کے نمک پروردہ محمدی نے سر ہلایا۔

''وضربتے چند بر پیکر نازنیں اوزد وبرروی زمین افتاد، گفت بس است کہ کارمن تمام شد وانتقام بانجام رسید''

(اور چند وار اس کے نازنین پیکر پر اس نے کئے، وہ زمین پر گر پڑا اور بولا بس کرو میرا کام تمام ہوگیا اور انتقام اپنے آخری انجام کو پہنچ گیا۔)

اپنے پایہ تخت مرشد آباد کے بازاروں میں سراج الدولہ کی لاش

وہی مرشد آباد جہاں بنگال وبہار واڑیسہ کے اس مطلق العنان خود سر بادشاہ کی سواریاں شاہانہ تجمل وشکوہ سے روز نکلا کرتی تھیں آج:

''لاش اوبر ہودج فیلے انداختہ بطور تشہیر در شہر گردانیدند۔''

(اس کی لاش ایک ہاتھی کے ہودج پر ڈال کر بطور تشہیر شہر میں پھرائی گئی)

اور میر جعفر کی کھال اوڑھ کر کرنل کلیف (کلایو) اور اس کے جانشینوں نے کمپنی بہادر کے نام سے سرزمین ہند پر اس تخت کو بچھا دیا جو آج تک بچھا ہوا ہے۔

بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی کمپنی بہادر کے نام

ہندوستان کے مسلمانوں کو الغازی الابدال جس شاہ عالم اور شجاع الدولہ کے سپرد کر کے خود قندھار روانہ ہوگئے تھے حضرت شاہ صاحب کی وفات کے تقریباً دو سال بعد کلایو نے بہ مقام الہ آباد مشہور:

''فرمان اسناد دیوانی ہر سہ صوبہ بنگال، بہار، اڑیسہ، بنام کمپنی وزیر (شجاع الدولہ) وبادشاہ (شاہ عالم) درخواست......وچار وناچار قبول نمودہ بروفق خواہش اوفرامین اسناد نوشتہ دادند۔''

(تینوں صوبے بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی کی سند کمپنی بہادر کے نام وزیر (شجاع الدولہ) اور بادشاہ (شاہ عالم) سے چاہی اور چاروناچار (دونوں کو) قبول کرنا پڑا، اور کلایو کی خواہش کے مطابق اسناد کے فرامین لکھے گئے)

اتنے بڑے بڑے صوبوں کی کل مال گذاری چوبیس لاکھ مقرر ہوئی اور چالیس ہزار سالانہ ناظم بنگالہ کے اخراجات کے لئے طے ہوئے اور:

"قبولیت بہ مہر کمپنی کہ دست آویز بعہد مال گذاری است داخل دفتر پادشاہی گردید"

(کمپنی کے مہر کے ساتھ قبولیت نامہ جو مالگزاری کے معاہدہ کی دستاویز تھی بادشاہی دفتر میں داخل ہوئی)

بقول طباطبائی اتنا اہم کام اتنی آسانی سے انجام پا گیا کہ:

"بیع وشرائے خر بار بردار وچار پائے رہوار ہم بایں زودی بدون تکرار یک سوئی نمی شود، انفصال وانقطاع یافت"

(کسی بوجھ لادنے والے گدھے اور کسی چوپایہ کی خریداری بھی اتنی جلدی بغیر کسی رد وکد اور تکرار کے طے نہیں ہوتی، لیکن یہاں (اتنا بڑا معاملہ) طے پا کر ختم ہو گیا)

"تؤتي الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء" کی پھر ایک تفسیر گنگا جمنا کے سنگم پر لکھی گئی۔

فرنگی ٹھیکہ داروں کی نزاکت دماغی، شاہی نقارہ کی آواز سے سر میں درد

شاہ عالم نام کو ہندوستان کے بادشاہ تھے، لیکن کرنل اسمٹ جوان کی نگرانی کے لئے الہ آباد میں چھوڑا گیا تھا، اس کا یہ حال تھا کہ:

"از صدائے نقارہ نوبت خانہ پادشاہی کہ در قلعہ بودگاہے ناخوش گشتہ نواختن نوبت رامانع شد ومردم نقارخانہ ناچار ممنوع از عمل خود بودند"

(بادشاہی نوبت خانہ کی آواز سے ناخوش ہوتا تھا اور نقارے کے بجانے میں مانع ہوا، نقارخانے والے مجبوراً رک گئے)

سچ ہے ؎

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

ان "ٹھیکہ داروں" کی نزاکتِ دماغ کے اب کیا کہنے تھے۔

غنچہ چٹکا تو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے

فإنا لله وإنا إليه راجعون۔

ظاہر ہے دین کا وہ دیوانہ جو مسلسل پچاس ساٹھ سال سے آسمان کے ان بدلے ہوئے تیوروں کا اندازہ کر رہا تھا اس کی اندرونی تڑپ اور بے چینی کبھی کبھی ابدالی اور حافظ الملک رحمت خاں، شجاع الدولہ اور میر قاسم کی شکلیں بن بن کر نمایاں ہوتی تھیں، لیکن جن کے لئے وہ تڑپتا تھا، وہ تو سوئے ہوئے تھے، کیا کرتا، کب تک اپنے جگر کے نالوں سے آسمان کو ہلاتا۔

آخر میں شاہ ولی اللہ کی دردناک وصیت

آخر عمر میں جب وصیت نامہ ترتیب دینے لگے، تو جہاں اور باتیں لکھیں ان میں سب سے زیادہ دردناک وصیت وہ ہے جسے پڑھ کر کلیجہ کانپ اٹھتا ہے، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے عاصمہ (پایہ تخت) میں بیٹھ کر اسی سلطنت کا ایک عالم لکھتا ہے اور حالات نے جو رُخ پلٹا تھا ان کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"ما مردم غریبیم کہ در دیار ہندوستاں آبائے ما بغربت افتادہ اند" (۱)

(ہم لوگ اجنبی مسافر لوگ ہیں ہمارے باپ دادا اس ملک میں بحالت مسافرت وغربت ہی یہاں داخل ہوئے (اور پھر وہی حالت واپس ہوگئی))

حضرت کے کلام اور مختلف کتابوں سے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اپنی قوم کی اس حالت کا خاص اثر تھا، وہ دیکھ رہے تھے کہ اگر یہی لیل ونہار ہیں تو اس ملک میں اب دین اور اہل دین کا بس خدا ہی حافظ اور اب اس میں شک کی گنجائش ہی کیا باقی تھی جو کچھ ہونے والا تھا اس کی صبح بلکہ صبح سے بھی زیادہ روشنی طلوع ہو چکی تھی قوم کی تقدیر ان پر واضح ہو چکی تھی۔

۱۱۴۳ھ میں حالات کی نزاکت کے باوجود شاہ صاحب کے سفر حجاز کا اصل راز

اور آج ہی نہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ۱۱۴۳ھ میں جب آپ کی عمر تقریباً ۳۰ رسال

(۱) وصیت نامہ ص ۱۱

کی تھی اچانک آپ کا سفر حجاز کیلئے آمادہ ہوجانا، اور ایسے زمانے میں اس خطرناک ارادے پر عمل کر گزرنے کی ٹھان لینا جب بحرِ عرب، بحرِ ہند اور بحرِ احمر کے تمام سواحل پرتگیزی، ولندیزی قزاقوں اور فرانسیسی وانگریزی تاجر صورت ملک گیروں کی بحری ترک تازیوں کی جولان گاہ بنے ہوئے تھے، علانیہ حاجیوں کے جہاز لوٹے جاتے تھے، جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں بلکہ ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے، یوں بھی شمالی ہند سے جنوبی ہند کے علاقوں کو طے کر کے سورت کی بندرگاہ تک پہنچنا آسان نہ تھا، خشکی میں ہر جگہ خصوصاً صوبجات متوسط اور مالوہ، گجرات جو بندرگاہ کے راستہ پر واقع تھے، مرہٹوں کی شورشوں کی خصوصی آماجگاہ بنے ہوئے تھے، تاہم شاہ صاحب راہ کی ان تمام دشواریوں کے باوجود عزم حجاز کو پورا کر کے رہے، راستہ کا یہ حال تھا کہ رات کو اگر کوئی ساتھی گاؤں یا آبادی میں بھی چھوٹ جاتا تھا تو شاہ صاحب "یا بدیع العجائب یا بدیع العجائب" کا وظیفہ شروع کر دیتے تھے جس کے یہ معنی ہیں کہ گویا ایسے آدمی کا بچ کر خطرہ سے نکل آنا ایک اعجوبہ روزگار بات تھی، بہرحال میرے نزدیک علاوہ حج وزیارت اور دوسرے مقاصد کے ایک بڑا محرک، جیسا کہ آئندہ بھی اس پر کچھ بحث کی جائے گی، مسلمان ہند کے تاریک مستقبل کا احساس بھی تھا جس کی امت سرزمین ہند میں اس حال میں گرفتار ہونے والی تھی کچھ ان تک خبر پہنچائی تھی اور جہاں کی دعائیں رد نہیں ہوتیں وہاں بھی کچھ عرض کرنا چاہتے تھے، اسی سلسلہ میں ان کو مکہ معظّمہ میں وہ خواب دکھلایا گیا جس کا ذکر گذر چکا، اور مدینہ منورہ میں یہ سرفرازی نصیب ہوئی کہ خود ختمی مآب ﷺ نے براہ راست اس بشارت سے مفتخر فرمایا کہ:

"ان مراد الحق فيك أن يجمع شملاً من شمل الأمة المرحومة بك" (۱)

(تمہارے متعلق خدا کا ارادہ ہوچکا ہے کہ امت مرحومہ کے جتھوں میں سے کسی جتھے کی تنظیم تمہارے ذریعہ سے کی جائے)

میرے خیال میں یہ ہندوستان ہی کی امت مرحومہ تھی جس کی پراگندگیوں کی تنظیم کا کام ایک خاص الٰہی تدبیر سے حضرت اور حضرت کے دودمان اور "ذرّیات طیبات" سے لیا

(۱) فیوض، صفحہ ۶۲ ر۔

گیا، اس مضمون کو کسی آئندہ مناسب مقام پر ذرا تفصیل سے انشاء اللہ عرض کروں گا۔

شاہ صاحب نے ہندوستان کو بالکل خیرباد کہہ کر حجاز ہی میں اقامت کیوں نہیں کرلی

بالفعل یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسی حالت میں جب شاہ صاحب ہندوستان کو چھوڑ چکے تھے اور ایک دوسری صورت بھی آپ کے سامنے تھی، یعنی اپنی اس مسافرت کی مصیبت اور غربت کا ازالہ جس کا احساس انہیں اس ملک میں تو ہو چکا تھا، یوں بھی تو کر سکتے تھے کہ بجائے غربت اور مسافرت کی مصیبت کے ملک حجاز ہی میں رہ پڑتے، کیونکہ گو ان ممالک کی خیر بھی نظر نہیں آرہی تھی، اور مسلمان جن علاقوں کو اب تک اپنا وطن سمجھ رہے تھے مستقبل کی گھڑیوں پر نظر رکھنے والے وہاں بھی ان کی غربت اور مسافرت کو دبے پاؤں آتا ہوا دیکھ رہے تھے لیکن پھر بھی ؎

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو اب شبلی کہاں جائیں
کہ اب امن وامانِ شام ونجد وقیرواں کب تک

کی حالت پیدا نہ ہوئی تھی، بالخصوص سرزمین حجاز تو ترکی اور مصری سلطنتوں کے بیچ میں بہت کچھ قابل بھروسہ تھی پھر اس مقدس ملک میں آپ کو قیام کا بھی کافی موقع ملا، مختلف مقامات میں آپ کو مختلف اشارے بھی ہوتے رہے اور طرح طرح کے مکاشفے مختلف رنگوں میں ہوئے مگر ان میں کسی جگہ بھی آپ کو اس کا ایما نہ کیا گیا کہ ہندوستان کی واپسی کا ارادہ ترک کردو، یہی نہیں بلکہ آپ کے بعض متوسلوں نے ہندوستان کی ان حالتوں کو دیکھ کر جب چاہا کہ حجاز سے واپس نہ ہوں اور وہیں رہ پڑیں اور مشورۃً شاہ صاحبؒ کو اس بارہ میں خط لکھا تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

"وأما عزم ترك الرجوع إلى الوطن فلا تستبدوا به حتى يشرح الله صدركم أو صدر رجل لأجلكم" (۱)

(۱) مکاتیب حیات ولی ص ۲۹۱۔

(اور یہ ارادہ کہ وطن کی طرف اب واپس نہیں ہونا چاہئے تو اس پر اصرار نہ کرو جب تک خود تمہارا سینہ نہ کھل جائے یا کسی اور شخص (یعنی خود شاہ صاحب) کو شرح صدر تمہارے لئے نہ ہو جائے)

بلکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امت مرحومہ کے جس طبقہ کے ''شمل'' کے اجتماع کی آپ نے بشارت پائی تھی، اس کے لئے بہرحال اسی ''عالم غربت'' میں مرنا اپنے لئے پسند کرتے تھے، حتی کہ حالات جب روز بروز بد سے بدتر ہوتے چلے جارہے تھے اور آپ کو اس کا یقین ہو گیا کہ اب اس ملک پر مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی اور بہرحال غیر اسلامی قوتوں کا اس پر اقتدار قائم ہی ہو جائے گا، تو اب چاہے آپ اسے اپنے دل کی تسلی خیال کیجئے، جہاں اور بہت سی چیزیں انہوں نے ''غیبی اشارات'' کے تحت لکھی ہیں، اس کا بھی اعلان کسی گمان غالب کے تحت میں نہیں بلکہ یقین واعتقاد کی صورت میں کیا ہے۔

شاہ صاحب کی ایک محیر العقول توقع

''والذی أعتقد أنه ان اتفق غلبةُ الهنود مثلا علیٰ إقلیم هندوستان غلبة مستقرة عامة وجب فی حکمة الله تعالی أن یلهم رؤساء هم التدین بدین الإسلام'' (۱)

(اور جس بات کا مجھے یقین ہے وہ یہ ہے کہ اگر مثلاً ہندوؤں کا ہندوستان کے ملک پر تسلط قائم ہو جائے اور یہ تسلط مستحکم اور ہر پہلو کے اعتبار سے ہو، جب بھی اللہ تعالی کی حکمت کی رو سے یہ واجب اور ضروری ہے کہ ہندوؤں کے سرداروں اور لیڈروں کے دل میں یہ الہام کرے کہ وہ دین اسلام کو اپنا مذہب بنالیں)۔

غالباً آپ کی یہ تحریر ''پانی پت'' کے تقدیری فیصلے سے پہلے کی ہے اور خاص کر اسی قوم کے تسلط کے خیال کو انہوں نے تمثیل کی شکل میں پیش کیا ہے، بہرحال ہندوستان کے متعلق ان کا نظریہ بلکہ عقیدہ تھا، بلکہ سچ یہ ہے کہ غالباً اس نظریہ کے موجد اول بھی وہی ہیں کیونکہ انہوں نے لکھا ہے کہ ''کما ألهم الترك'' یعنی جیسے ترکوں کو قبول اسلام کی الہامی توفیق ہوئی اور جو

(۱) تفہیمات الٰہیہ، ص ۱۰۳۔

اسلامی جھنڈے کو سرنگوں کر رہے تھے، خود ان کے آگے سرنگوں ہو کر صدیوں اسلامی علم کے دنیا میں تنہا علم بردار رہے۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

شاہ صاحب اور نظریہ وطنیت

لیکن باوجود اس خیال کہ ''غربت ومسافرت'' کی حالت میں بھی سرزمین ہند کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے اس کا خیال کبھی نہیں پکایا کہ بجائے عرب کے اپنا مرکزی تعلق بھی ہم ہندوستان ہی سے قائم کرلیں، اپنی اسی وصیت میں شدت کے ساتھ اصراراً لکھتے ہیں:

''مارا لابدست کہ حرمین محترمین رویم، روئے خود برآں آستانہا مالیم''

(ہم مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے کہ حرمین محترمین ہم جایا کریں اور اپنے چہروں کو آستانوں پر جا کر ملا کریں)

اور آخر میں دوٹوک قطعی فیصلہ کی صورت میں ارقام فرماتے ہوئے نظریہ ''وطنیت'' کی جو واقعی جڑ ہے اس پر تیر لگاتے ہیں:

''سعادت ما ایں ست وشقاوت ما دراعراض ازیں''۔

(ہماری سعادت اور کامیابی اسی میں ہے اور ہماری بدبختی وشقاوت اس مسلک سے روگردانی اور اعراض کرنے میں ہے)

کس قدر عجیب بات ہے آج ''ہندی قومیت'' (انڈین نیشلنٹی) کی راہ کا جو سب سے بڑا کانٹا خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمان جسم کو اپنے تو رکھتے ہیں ہندوستان میں لیکن دل ان کا رہتا ہے مکہ اور مدینہ میں، کہا جاتا ہے اور اعلانیہ کہا جاتا ہے کہ جب تک یہ ڈوری کاٹ نہیں دی جائے گی اس ملک میں صحیح وطنیت کا جذبہ کبھی بار آور نہیں ہوسکتا، اور سچی بات بھی یہی ہے کہ وطن پرست ہی نہیں بلکہ ایک اچھے وطن دوست کے لئے بھی یہ بات دنیا کی نظر میں قابل تعجب ہوسکتی ہے اور ضرور ہوسکتی ہے کہ رہتا ہے وہ ہندوستان میں اور ہر تھوڑی دیر بعد وہ سر جھکاتا ہے،

اس خطہ کی طرف، اس ملک کی طرف، اس سمت کی طرف اور اس قبلہ کی طرف جو ہزاروں میل سمندر پار ایک ریگستان میں ہے، ''وطن پرستوں'' کے نزدیک تو یہ طریقہ غلط اور اتنا غلط ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے، لیکن وطن پرستوں کے ایک حلقہ میں بھی اس کی لاسود کوشش جاری ہے کہ دونوں نظریوں میں تطبیق دی جائے اور "ماجعل الله لرجل من قلبين في جوفه" کے قدرتی قانون کو توڑ کر چاہا جاتا ہے کہ ایک ہی آدمی کے سینے میں دو دل بنا دیئے جائیں، ایک اللہ والے آخر کسی دوسرے اللہ کا اضافہ اپنے معبودوں، مطلوبوں، مقصودوں میں کیونکر کریں۔

بہرحال جس کی جو سمجھ میں آ رہا ہے کر رہا ہے، اور ذاتی طور پر میں ان خیالات میں کسی خیال کی ترجیح کی صلاحیت اپنے اندر نہیں پاتا لیکن حضرت شاہ صاحب کا خیال یہی تھا کہ مسلمانوں کی ساری سعادت اسی میں ہے کہ وہ اپنا مرکز حرم کی زمین پاک ہی کو بنائے رکھیں اور ان کی پوری بد بختی یہی ہے کہ کسی حیثیت سے بھی وہ ان دونوں مقدس مقاموں سے الگ ہو جائیں۔

حجازی تہذیب اور مسلمانوں کے امتیازی طریقہ زندگی کے بارہ میں شاہ صاحب کا تشدد

اور صرف یہی نہیں، بلکہ اپنی مختلف کتابوں کے مختلف مقاموں پر منجملہ چند کلی امور کے شاہ صاحب جس پر بالکل بے اختیار ہو کر پھر جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ کسی ملک میں اپنی ابتدائی زندگی گزاریں، لیکن بہرحال اپنی وضع قطع اور طرز بود و ماند میں ان کو اس ملک کے مقامی باشندوں سے قطعاً جدا رہنا چاہیے اور جہاں کہیں رہیں اپنی عربی شان اور عربی رجحانات ہی میں ڈوبے رہیں، اسی وصیت میں فرماتے ہیں اور اپنے خیال کی توجیہہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عربیت نسب، عربیت لسان ہر دو فخر ماست کہ ما را سید الأولین والآخرین و أفضل الأنبیاء والمرسلین وفخر موجودات علیہ وعلی آلہ الصلوات والتسلیمات نزدیک می گردانند''

(عربی نسل، عربی زبان، یہ دونوں چیزیں ہمارے لئے فخر ہیں کہ انہیں دونوں نسبتوں سے ہم سید الاولین والآخرین افضل الانبیاء والمرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات

سے نزدیک رہتے ہیں)

پھر اس کے بعد اور صراحت کرتے ہیں کہ:

''شکر نعمت عظمیٰ آن ست کہ بقدر امکان عادات و رسوم عرب اول کہ منشاء آنحضرت ﷺ است را از دست ندہیم''

(اس سب سے بڑی نعمت کا شکر یہی ہے کہ حتی الوسع عرب اول کے عادات و رسوم جو آنحضرت ﷺ کا منشاء ہے، اس کو ہم اپنے ہاتھوں سے نہ چھوڑیں)

شاید ہمارے ہی بعض حلقوں میں قیامت کا شور برپا ہو جائے گا اور غل مچایا جائے گا جب ان کو سنایا جائے گا کہ یہی امام ولی اللہ جن کو ''ہندی نیشنلزم'' اور ''قومی پالیسی'' کے پہلے علم بردار لیڈر ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اپنی اسی وصیت میں آگے فرماتے ہیں کہ:

''رسوم عجم و عادات ہنود را در میان خود نہ گذاریم''

(عجم (غیر عربی اقوام) کی رسمیں اور ہندوؤں کی عادتوں کو چاہیے کہ ہم اپنے اندر کسی طرح باقی نہ رکھیں)

اب للہ مجھے بتاؤ کہ جب شاہ صاحب ہی کا نام لے کر مسلمانوں کو لباس اور وضع قطع تک میں غیروں کے قدم بقدم چلنے کا مشورہ دیا جائے اور مجھے اس پر حیرت اور غصہ ہو تو کیا قصور وار میں ہی ہوں؟

انصاف! انصاف! اے اہل انصاف! للہ انصاف!!!

اور اسی ایک جگہ کو نہیں "زی الأعاجم" (غیر عربی اقوام کے فیشن) کے متعلق "إياك إياك" کی صدا شاہ صاحب نے اپنی کس کتاب میں نہیں لگائی ہے، آپ نے ایک مکتوب میں اس کا اندازہ کر کے کہ ''وضع قطع'' یا فیشن کی تبدیلی کا عارضہ پہلے کھاتے پیتوں اور ان ہی لوگوں کو پکڑتا ہے جو تھوڑی بہت معاشی فراغ البالی رکھتے ہوں، جس کا شاہ صاحب کو تو فقط اندازہ ہوا تھا اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کا تماشہ کر رہے ہیں، اگرچہ اس زمانہ میں ''امیروں'' کی ''حقیقت'' پر ''تعلیم یافتگی'' کی چادر اڑھا دی گئی ہے، اور جب ارباب ثروت و فراغت کا ذکر

آتا ہے، تو عموماً لوگوں کا ذہن پرانے جاگیرداروں اور زمینداروں کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، حالانکہ مدت ہوئی، کم ازکم مسلمانوں میں تو اس طبقہ کا گویا خاتمہ ہو چکا ہے، اور اب ان کی جانشینی کا کام وہی لوگ انجام دے رہے ہیں، جو کسی نہ کسی حیثیت سے موجودہ حکومت کے متوسلین میں ہیں، ان میں وہ سارے عوارض پیدا ہو چکے ہیں جو عموماً امیروں اور امیرزادوں کے ساتھ خاص ہیں لیکن ایک لفظ تعلیم یافتہ بول کر خود ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی ان کو امراء واغنیاء کے جرگہ سے باہر کردیتے ہیں، اور اب جو کچھ امیروں کے متعلق سنا جاتا ہے، سمجھتے ہیں کہ اس کا نشانہ، تعلیم یافتوں کا معاشی وسعت رکھنے والا گروہ نہیں ہے۔

اہل عجم کے فیشن اختیار کرنے والوں سے شاہ صاحب کی بےزاری

بہرحال شاہ صاحبؒ نے اس خط میں چند خاص طبقات سے مکتوب الیہ کو پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے، اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:

”فإياك..... وغنى طاغ يتكلف زى الأعاجم ويتداخل فى مضاربة الجماجم“ (۱)

(خبردار! بچے رہنا اس تونگر امیر سرکش سے جو خواہ مخواہ غیروں (عجمیوں) کے فیشن کو زبردستی اختیار کرتا ہے اور جو لوگ صحیح راہ سے منحرف ہیں ان سے برابری اور مقابلہ کے میدان میں گھسا پھرتا ہے)۔

موجود اصطلاح کے ”تعلیم یافتوں“ اور پرانے محاورہ کے تونگروں، امیروں میں یہ دونوں خصوصیات کتنے بہتر طریقے پر پائی جاتی ہیں، لیکن شاہ صاحب بےچارے کو کیا معلوم تھا کہ آئندہ دنوں میں ارباب غنا وثروت تو اپنی امارت وتونگری کی وجہ سے بہ تکلف، زبردستی غیروں کی ریس کریں گے، لیکن جو غربت کی وجہ سے اس مرض سے محفوظ رہیں گے ان کے سر ان ہی کی امامت اور قیادت کے نام سے غیروں کے لباس اور معاشرت کے منڈھنے کی کوشش کی جائے گی، إنا لله وإنا إليه راجعون.

(۱) منقول از حیات ولی، ص ۲۹۰۔

پھر شاہ صاحب نے ہندوستان کو کیوں نہیں چھوڑا

اس قصہ کو مختصر کر کے میں پھر اپنے اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یعنی بہرحال شاہ صاحب کے گزشتہ بیانات سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ان مصائب کو دیکھتے ہوئے بھی اور اس کا بھی اندازہ لگاتے ہوئے کہ زوال کی یہ حالت ابھی دور تک جائے گی، ”شاہ صاحب“ نے ”ہندوستان“ چھوڑنے کا ارادہ کبھی نہیں فرمایا اور نہ کسی کو اس کا مشورہ دیا کہ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والے کروڑوں مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر محض اپنی تن آسانی کے لئے ملک سے باہر نکل جائیں گویا

زاہد نداشت تابِ جمال پری رُخاں
کنجے گرفت وترسِ خدا را بہانہ ساخت

درحقیقت کشمکش حیات سے کسی طرح پیچھا چھوٹ نہیں سکتا

حالانکہ جب زندگی ابتدائی کشمکشوں ہی کا نام ہے، جو بھی جہاں کہیں جس حال میں ہے، وہ:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے

کی چیخ میں مبتلا ہے، حتی کہ ایک ملک، ایک مذہب، ایک رنگ، ایک معاشرت رکھنے والا یورپ آج جن قیامت خیز مصیبتوں کا شکار ہے اس سے زیادہ کا تو شاید تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اور آج کیا؟ کب ایک صدی بھی بایں ہمہ اتحاد واشتراک وتعلیم وتہذیب ورواداری اس ملک میں خون کی ندیاں نہیں بہی ہیں، سروں کو گردنوں سے نہیں اڑایا گیا ہے، اپنے ہی ہم مذہبوں نے خود اپنے مذہب والوں کی عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم نہیں کیا ہے، گھروں میں آگ نہیں لگائی ہے، مال ودولت کو تاخت وتاراج نہیں کیا ہے۔ ہاں تو پھر ”ثم خيرا“ کے خیالی منصوبے پکانا کہ یہاں سے چھوڑ کر دوسری جگہ جب چلے جائیں گے تو عافیت نصیب ہوگی، اور جس آسمان کے نیچے یہاں ہیں کسی

دوسری زمین میں وہ آسمان بدل جائے گا خام خیالی نہیں تو کیا ہے؟ بلاشبہ بعض اوقات خاص حالات میں قومیں اس فعل پر بھی مجبور ہوئی ہیں، اور مجبوری ارادی نہیں بلکہ مجبوری کی شکل میں آتی ہے، اس وقت اس پر عمل ناگزیر ہو جاتا ہے اور ایسی حالت میں عمل نہ کرنے والے اپنی قومی وملی خصوصیات کو کھو بیٹھتے ہیں، لیکن ہر تھوڑی پریشانی کے بعد پیٹھ پھیر کر مورچہ چھوڑ دینا اور اسی کو عقل ورائے کا حکم قرار دینا میرے خیال میں بزدلی ہی نہیں بلکہ ان لاکھوں بلکہ کروڑوں بیکسوں، کمزوروں کے ساتھ غداری بھی ہے، جنہیں دشمنوں کے پنجوں میں پھڑ پھڑانے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔

حتی الوسع حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے، اور اپنے سے زیادہ ان بے وسیلہ غریب ہم قوموں کا خیال کرنا چاہئے جو اپنے اندر بھاگنے کی سکت بھی نہیں پاتے، میرا خیال ہے کہ شاہ صاحب نے اسی خیال سے ہندوستان کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں فرمایا، اور اپنے کو اس حد تک راضی کرلیا کہ اگر خدانخواستہ اس پر ہنود کا عام اور تام دخل وقبضہ بھی ہوگیا تو اس وقت بھی ان کو یقین تھا جیسا کہ پہلے بھی یقین دلایا گیا ہے کہ ”وہی نہیں جن پر ہم گرتے ہیں بلکہ وہ جو ہم پر گریں گے ان کو چکنا چور ہونا پڑے گا“ اسلام کی مادی تاریخ بجائے پہلی صورت کے دوسری صورت کی شہادتیں اپنے اندر زیادہ تعداد میں رکھتی ہے، عرب گرا، چور ہوا، ایران گرا بھسم ہوگیا، مصری ہم پر ٹوٹے ان کو ٹوٹنا پڑا، ترک جھپٹے، لیکن ہم ہی نے ان کو اپنے جھپیٹے میں لے لیا، اور یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ ہمارا نصب العین صرف خود ہی جینا نہیں ہے، بلکہ اسی کے ساتھ دوسروں کو جلانے کا کام بھی تو ہمارے سپرد ہے، اور بقول حضرت شاہ صاحب کے ”ختم نبوت“ کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ پہلے تو شخصی انبیاء اٹھائے جاتے تھے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے صدقہ میں جب ایک امت ہی ”أخرجت للناس“ کی سند دے کر دنیا کے لئے اٹھائی گئی ہے، پھر اب فالتو نبوتوں کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے، قرآن مجید میں متعدد جگہ آنحضرت ﷺ کی شہادت اور نگرانی کو اس کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے کہ ہم بھی ”شہداء علی الناس“ (دنیا کے انسانوں کے نگراں) بنے رہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہدے کے ہٹنے کے ساتھ ہی اپنے

رسول کی شہادت ونگرانی سے ہم محروم ہو جاتے ہیں، کیونکہ جس دن سے ہمارا دماغ عام انسانوں سے ہٹ کر صرف اپنی جماعت تک محدود ہوگیا ہے، روز بروز ان نگرانیوں کی برکات سے ہم محروم ہوتے چلے جاتے ہیں، جو النبی الخاتم ﷺ کی نگرانی کے لازمی نتائج ہیں۔

کیا کروں بات میں بات نکلی چلی آتی ہے، قلم کو روکتا ہوں، لیکن یہ خیال کر کے کہ پھر موقعہ ملے نہ ملے جو کچھ اپنے اندر ہے دوسروں تک پہنچا دیا جائے، جذبات دبانے سے نہیں دبتے اور سلف کے حالات سننے یا سنانے کا مقصد بھی صرف سننا یا سنانا نہ ہونا چاہئے، ماضی سے مستقبل کی زندگی میں اگر کچھ مدد مل سکتی ہے تو پھر یہ کام کی بات ہے ورنہ بجز ایک دلچسپ داستان کے وہ اور کیا ہے۔

ہندوستان میں قیام اور مستقبل کا کام

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہندوستان ہی میں قیام کا ارادہ طے کرتے ہوئے شاہ صاحب نے یقیناً اپنے عمل کا کوئی پروگرام بنایا، اگرچہ بہ تفصیل انہوں نے اپنے دستور العمل کے ضوابط کو کسی جگہ قلم بند نہیں فرمایا ہے، لیکن پھلوں سے بھی درختوں کی نوعیت کا پتا چلایا گیا ہے، خود جس کا عمل اس کے منصوبے کی فہرست اگر ہمارے سامنے پیش کرتا ہو تو ہمیں اس کے سمجھنے اور پڑھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔

بہرحال میں نے جہاں تک غور کیا ہے اور شاہ صاحب کی کتابوں کی کثرت مطالعہ نے ان نتائج تک مجھے پہنچایا ہے، اس کا خلاصہ میرے الفاظ میں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے زمانہ کے مختلف فتنوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، گویا ٹھیک ”اطیب النغم“ میں جو شاہ صاحب کا پہلا شعر ہے:

كأن نجوما أو مضت في الغياب

عيون الأفاعي أو رؤوس العقارب

(تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناگوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے سر ہیں)

وہ سماں ہندوستان میں ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا، انہوں نے اندازہ کر لیا تھا اور وہ نہ کرتے تو کون کر سکتا تھا کہ

اب بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

بہ دیر یا بسویر سہی نام نہاد اسلامی حکومت کے خاتمہ کا وقت قریب آ چکا ہے، ان کے سامنے سوال آتا ہوگا کہ آخر ان کروڑوں مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا، معاش کا کفیل تو خیر ''رزاق مطلق'' ہے، جب تک جو جیتا ہے، "ذوالقوة المتين" بہرحال اس کا انتظام کسی نہ کسی شکل میں کر ہی دیا کرتا ہے، اور یوں قناعت کی راہوں کو چھوڑ کر کوئی سینہ کوبی ہی پر مصر ہو تو آج انگلستان جو نہ صرف سیاسی قوتوں کے ذریعہ سے دنیا کی آبادترین پیداواروں کا تنہا خرمن ہے، بلکہ تجارت، صنعت وحرفت، قمار، ربا، الغرض مالی انتفاع کے ممکنہ وسائل کی کنجیاں ساری روئے زمین کی اسی کے ہاتھ میں ہیں، اور کس انگلستان کا یہ حال ہے جو اپنے طول وعرض میں بنگال کے کسی متوسط درجہ کے ضلع سے بھی بڑا نہیں ہے، آبادی بمشکل صرف چار ساڑھے چار کروڑ تک پہنچی ہے، لیکن بایں ہمہ ان چار کروڑ میں میں تقریباً دو کروڑ لیبرز اور مزدوروں کے ''پیٹ پیٹ'' کے شور سے آسمان تھرا رہا ہے، آئے دن حکومت والوں پر پتھر پھینکے جاتے ہیں، کھڑکیاں توڑی جاتی ہیں، اور جو کچھ ہوتا رہتا ہے، روزناموں کے تاروں میں اس کی خبریں چھپتی رہتی ہیں، بھلا جس ملک کو خود آزادی ہی حاصل نہیں ہے، بلکہ بیسیوں ممالک واقالیم کی آزادیاں بھی اسی کی آزادی میں ہضم ہو چکی ہیں، سیاسۃً بھی، تجارۃً بھی، صنعۃً بھی، حرفۃً بھی، اور اس کے سوا ہر راہ سے ہر چیز ہر قوم کی اسی انگلستان کے باشندوں میں فنا ہو رہی ہے، جب اس کا یہ حال ہے، تو جن کا یہ خیال ہے کہ صرف غیروں سے آزاد ہو کر ہم بتیس کروڑ انسانوں کی ''آواز شکم'' کو قناعت کے ذریعہ سے نہیں بلکہ حرص وآرزو کی بھٹیوں کو بھڑکا کر دبانے میں کامیاب ہوں

گے ان کے اس خیال کو خواب وخیال کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، آج جو حضرات عوام کو اپنے جھنڈوں کے نیچے پیٹ بجا بجا کر بلا رہے ہیں اور دنیا کو یہ بتلا اور سمجھا رہے ہیں کہ انسان کے لئے سب سے مقدم اور اہم پیٹ کا مسئلہ ہے اور اعضاء انسانی میں عضو رئیس بس معدہ ہے، ان کو ''فکر معقول'' سے کام لینا چاہیے کہ جس راہ پر آدم کی اولاد کو وہ لے جا رہے ہیں یہ ترکستان جا رہی ہے یا کعبہ پہنچائے گی۔

بہرحال میرے نزدیک شاہ صاحب کے سامنے مسلمانوں کے ''شکم'' کے غم سے زیادہ زندگی کے اس ''سوال اہم'' کا ''غم'' تھا، جس کے جواب کے بغیر اس دنیا کی ہر زندگی بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہے، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ''انجام'' کی درستی کے لئے ''آغاز'' کا جو دستور خدا کی طرف سے پہنچایا تھا، شاہ صاحب دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کو اس پیغام سے جو تعلق ہے، ان فتنوں کی پہلی زد قدرتاً اسی تعلق پر پڑے گی، اب تک ہر مسلمان علاوہ موروثی مسلمان ہونے کے "على دين ملوكهم" کے قانون کے تحت بھی مسلمان ہی رہنے میں فائدہ محسوس کرتا تھا، بلکہ غیروں میں بھی کتنے تھے جو اپنے مسلمان نہ ہونے پر اس زمانے میں پچھتاتے تھے، لیکن جب ''ملوک'' بدل جائیں گے اور "أفسدوها وجعلوا أعزة أهلها أذلة وكذلك يفعلون" (۱) کے مستمر قاعدہ کی بنیاد پر اس وقت اسلام سے وابستگی کا یہ ''ملوکی'' ذریعہ بھی باقی نہ رہے گا، سوال یہی تھا کہ پھر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے دامن مبارک کے ساتھ بندھے رہنے کی ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا شکل ہوگی۔

شاہ صاحب کے زمانہ کے ''علماء ومشائخ'' کی کمزوریاں

دوسری طرف وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان میں مذہب اسلام کی تعلیم وتعلم اور نشر واشاعت کے جو ذمہ دار ہیں، ان کے دونوں طبقوں یعنی مذہب کے ظاہری رسوم وعام

(۱) قرآن کی آیت ہے کہ ملکہ سبا نے کہا تھا کہ ''سلاطین جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو بگاڑ دیتے ہیں اور ملک کے عزت والوں کو خوار وذلیل کر دیتے ہیں''۔

عقائد کے محافظ جنہیں عموماً علماء کہتے ہیں اور مذہب کی واقعی روح اور اس کے باطنی مقاصد کے علم بردار جنہیں صوفیہ اور مشائخ کہتے ہیں، دونوں گروہوں کا اس زمانہ تک پہنچتے پہنچتے عجب حال ہو رہا تھا، شاہ صاحب کے جس ''پیغام'' کا ترجمہ پہلے درج کر چکا ہوں، اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس عہد کے علماء کی کیا حالت تھی کہ ان کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

"اشتغلتم بعلوم اليونانين و بالصرف والنحو والمعانی"

(تم یونانیوں کے علوم اور صرف ونحو میں الجھے ہوئے ہو)۔

فقیہوں کے بے راہ روی اور بے بصری

اور یہ تو عام علماء کا حال تھا، خصوصیت کے ساتھ جنہیں علماء دین کا لقب حاصل تھا، اور فلسفہ ومنطق سے وہ ناکارہ تھے جن کا نام فقہاء تھا، ان کی یہ کیفیت تھی کہ دین کے حقیقی سرچشموں قرآن وحدیث اور ائمہ مجتہدین اور ان کے تلامذہ کے اقوال تک سے بہت دور آگے نکل کر ہر وہ چیز جو فقہ کے نام سے کسی کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی ہے ان کے نزدیک ''وحی محکم'' اور ''نص قطعی'' کا درجہ حاصل کئے ہوئے تھی، اپنی مشہور کتاب ''انصاف'' (۱) میں فقہاء عصر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

"فالفقیه يومئذٍ هو الثرثار المتشدق شدقيه، الذی حفظ أقوال الفقهاء قويها وضعيفها من غير تميز و سردها بشقشقة شدقيه" (۲)

(اس زمانہ میں فقیہ اس شخص کا نام ہے جو باتونی ہو، زور زور سے ایک جبڑے کو دوسرے جبڑے پر پٹکتا ہو، جو فقہا کے اقوال قوی ہوں یا ضعیف سب کو یاد کر کے بغیر اس امتیاز کے ان میں سے کس میں قوت ہے کس میں نہیں ہے وہ انہیں اپنے جبڑوں کے زور سے چلتا کرتا رہے)۔

اسی گروہ کے متعلق دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ان کی بے تمیزیوں کا یہ حال ہے کہ خود امام

(۱) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف

(۲) ص:۹۳۔

ابوحنیفہؒ ان کے تلامذہ اور بعد کے اقوال تک میں فرق نہیں کر سکتے:

"ويزعم أن جميع ما يوجد فی هذه الشروح الطويلة و كتب الفتاویٰ الضخمة فهو قول أبی حنيفة وصاحبيه، ولا يفرق بين القول المخرج وبين ما هو قول فی الحقيقة، ولا يحصل معنى قولهم "على تخرج الكرخی كذا" و "علىٰ تخريج الطحاوی كذا" ولا يميز بين قولهم "جواب المسئلة على قول أبی حنيفة كذا" و"على أصل أبی حنيفة كذا". (۱)

(یعنی اس زمانے کے فقیہوں کا) خیال یہ ہے کہ طویل وضخیم شرحوں اور فتاویٰ کی کتابوں میں جو مسائل پائے جاتے ہیں یہ سارے کے سارے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کے ہیں، (یہ مسکین فقیہ) اس کی تمیز نہیں رکھتا کہ جو باتیں ائمہ کے اصول کی بنیاد پر ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں، ان میں اور جو واقعی ان کے اقوال ہیں ان میں کیا فرق ہے، وہ بیچارہ فقہ کی یہ اصطلاح بھی نہیں سمجھتا جو لکھتے ہیں کہ فلاں بات کرخی کی تخریج پر مبنی ہے یا طحاوی کی تخریج سے اس کا تعلق ہے، اسی طرح یہ قول کہ ابوحنیفہؒ کے قول پر مسئلہ کا جواب یہ ہے اور ابوحنیفہؒ کی اصل پر جواب یہ ہے، ان دونوں قولوں میں ان کو کوئی تمیز نہیں ہوتی، اور یہ بے چارے ان میں کوئی فرق نہیں جانتے)۔

اس قسم کی واقعی تنقیدوں سے ان کی کتابیں معمور ہیں، ماسوا اس کے ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو:

"نهضوا لطلب العلم توصلاً إلى العزة والجاه فأصبح الفقهاء بعد ما كانوا مطلوبين طالبين وبعد أن كانوا أعزة بالإعراض عن السلاطين، أذلة بالإقبال عليهم"۔ (۲)

(طلب علم کے لئے اس لئے آمادہ ہوئے تاکہ علم کو اپنی عزت اور جاہ کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں، نتیجہ اس کے بعد یہ ہوا کہ فقہاء جو پہلے عوام کے مطلوب تھے اب یہی عوام کے طالب ہوگئے اور سلاطین اور بادشاہوں کے دربار سے الگ رہنے کی وجہ سے جو معزز شمار کئے جاتے تھے اب بادشاہوں کے آستانوں پر وہ جھک کر ذلیل وخوار ہو رہے ہیں)۔

(۱) ص:۸۶۔

(۲) ص:۸۱۔

دین کے ان حاشیہ برداروں کو شاہ صاحب دیکھ رہے تھے، اور ان کا سینہ شق ہوا جاتا تھا، ''ملوکی'' رابطہ کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کو ان کے صحیح دین پر باقی رکھنے کی ایسوں سے کیا توقع ہوسکتی تھی، پھر کچھ ہی دن پیشتر ان ہی دنیا طلب علماء کے ہاتھوں اکبر کے دربار میں اسلام کا جو انجام ہو چکا تھا، اس کا نقشہ بھی شاہ صاحب کے پیش نظر تھا۔

صوفیوں کی افسوسناک حالت

دوسری طرف صوفیہ اور مشائخ کی جو کیفیت تھی، شاہ صاحب کے دردمند دل کے لئے وہ صرف اذیت اور دکھ ہی بنی ہوئی تھی، کیونکہ علماء سے زیادہ غریب مسلمانوں پر اس زمانہ میں خصوصاً ہندوستان میں ان ہی کا اثر غالب تھا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر مسلمان ان ہی کے ہاتھوں میں سپرد کر دیئے گئے تو یہ ان کو کہاں لے جا کر غرق کریں گے اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں:

''کرامات فروشاں ایں زماں ہمہ الا ماشاءاللہ طلسمات و نیرنجات را کرامات دانستہ اند''

(کرامتوں کے بیچنے والے اس زمانہ میں سب کے سب۔بجز اس کے جسے خدا چاہے۔اپنی طلسماتی کاروائیوں اور علم نیرنج کے نتائج کو کرامات سمجھے بیٹھے ہیں)۔

پھر اس کی تفصیل کرنے کے بعد کہ آدمی طلسمی قوانین اور علوم نیرنجات کے زور سے کس کس قسم کے ''خوارق'' دکھا سکتا ہے، آخر میں فرماتے ہیں:

''واعمال جوگ کہ بعضے ملاحظات جوگیہ را خاصیتے تمام است در اشراف وکشف''۔

(اور جوگ کی بعض تدبیریں، کیونکہ جوگیوں کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو دوسرے کی حالت پر فی الجملہ اطلاع یا کشف وغیرہ سے خاص تعلق ہے)۔

جن لوگوں نے شاہ صاحب کے متعلق خیال قائم کیا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے براہمہ اور جوگیہ کے فلسفہ ویدانت اور فلسفہ یوگا کو اسلامی حقائق سے مخلوط کر کے ایک ''جدید ہندی دین'' کی بنیاد ڈالی ہے، کیا ان کی نگاہوں سے یہ اور اس قسم کی بیسیوں عبارتیں نہیں گذری ہیں،

شاہ صاحب نے صاف کھل کر لکھ دیا ہے کہ:

''بسیارے از سادہ لوحاں دیدہ ام کہ چوں ایں اعمال از شیخے فرا گرفتہ اند آں را عین کرامت می دانند''

(میں نے بہت سے سادہ لوحوں کو دیکھا ہے کہ کسی شیخ سے جب اس قسم کے عمل وغیرہ کو سیکھ چکتے ہیں تو ان باتوں کو ٹھیک کرامت قرار دیتے ہیں)۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ:

''صلاح و فجور، مقبول بودن یا مردود بودن دریں جا ہیچ فرق پیدا نمی کند''

(نیکوکار یا بدکاری اسی طرح مقبول ہونا یا مردود ہونا اس معاملہ میں اس اختلاف حال سے کوئی فرق نہیں پڑتا)

یعنی ان روحانی ورزشوں سے یہ نتائج ہر ایک میں پیدا ہوتے ہیں خواہ شقی ہو یا سعید۔

نمود وانمود کا فتنہ

خصوصاً جو زمانہ شاہ صاحب کا تھا، طرح طرح کے طریقے اور نئی نئی شکلوں میں تصوف پیش ہو رہا تھا، آپ ہی کے عہد میں دلی کا وہ مشہور مردود، معروف بہ ''نمود وانمود'' ایک خاص بھیس میں ان ہی طلسمی نیرنجاتی جوگیاتی طریقوں کو سیکھ کر نمودار ہوا تھا، جس نے ایک خاص زبان اور اس کے قواعد ایجاد کئے تھے، اور اپنے ایک ساتھی کو محرم اسرار بنا کر ''آقوزۂ مقدسہ'' نامی کتاب کے الہام کا دعوی کیا تھا، مدعی تھا کہ نبوت اور وصیت کے درمیان ایک اور لاہوتی عہدہ ہے جس کی تعبیر وہ ''بیگوکت'' کے لفظ سے کرتا تھا، کہتا کہ ہر اولوالعزم پیغمبر کے ساتھ ہمیشہ نو بیگوک ہوا کئے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ بھی نو ہی بیگوک کا پیدا ہونا ضروری ہے، پھر شیعوں کی جماعت میں تو یہ کہتا ہے کہ بیگوک اول حضرت علی کرمہ اللہ وجہہ تھے، ان کے بعد آٹھ اماموں تک یعنی حضرت علی رضا علیہ السلام تک امامت اور بیگوکت کے عہدے ایک ہی ذات میں جمع ہوتے رہے، ان کے بعد صرف امامت رہ گئی اور نواں آخری

بیگوک کا منصب مجھے حاصل ہوا ہے، مجھ ہی پر یہ عہدہ ختم بھی ہوتا ہے، اور سنیوں سے کہتا کہ چار بیگوک تو خلفائے راشدین تھے، اور باقی چار بیگوکوں کے لئے بنی امیہ اور عباسیہ کے بعض ایسے خلفاء کے نام لیتا جو گونہ نیکی اور دینی حمیت میں امتیاز رکھتے تھے اور نواں بیگوک اپنے کو ٹھہراتا، اس نے عوام کو فریب دینے کے لئے اپنے مریدوں اور لڑکوں، لڑکیوں کے خاص خاص مجہول المعنی نام رکھے تھے، مثلاً وہی محرم اسرار جو گویا اس کا خلیفہ تھا، اس کا نام ''دوجی یار'' تھا، ''نما نموذ'' اور ''فغار نموذ'' یہ اس کے لڑکوں اور ''نمانہ کلاں''، ''نمانہ خورد'' لڑکیوں کے نام تھے، مریدوں کو ''فربوذ'' کہتا تھا، اس نے پنج وقتہ نمازوں کے سوا ''دید'' نامی عبادت کا طریقہ جاری کیا تھا، جو طلوع وغروب واستواء شمس کے وقت ایک خاص طریقہ سے ادا کی جاتی تھی، علاوہ اسلامی عیدوں کے چند مزید تہواروں کا اضافہ کیا تھا، یعنی جن دنوں میں (العیاذ باللہ) وحی کی اس پر ابتداء ہوئی۔

ملعون مدعی تھا کہ اس پر بھی وحی دو طریقوں سے آتی ہے، ایک میں آفتابی قرص اس کے سامنے نمودار ہوتا ہے اور اسی پر حروف لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، اور دوسری میں آواز آتی ہے، الغرض خرافات کا ایک سیلاب تھا جو پیر و مرید نے مل کر بہایا تھا، چونکہ بعض امراء بھی اس کے معتقد ہو گئے تھے، اس لئے عوام کا میلان بھی اس کی طرف بتدریج بڑھتا جاتا تھا، حتی کہ فرخ سیر بادشاہ بھی اس کی استجابت دعا کی شہرت سن کر تنہائی میں ملا، مکار نے یہ سن کر کہ بادشاہ ملنے آ رہا ہے کمرہ کا دروازہ بند کر دیا، ہزار منت وسماجت کے بعد جب دروازہ کھلا تو بادشاہ کے سامنے اس مرگ چھالے کو پھینک کر جس پر خود بیٹھا ہوا تھا بولا:۔

''پوست تخت گدائی وشاہی ہمہ داریم آنچہ می خواہی'' (١)

بادشاہ اپنے ساتھ روپیوں اور اشرفیوں کی تھیلیاں نذر کے لئے لے گیا تھا، ٹھوکر مار کر کنارہ کر دیا، جب فرخ سیر نے بہت اصرار کیا تو خود نوشتہ قرآن دے کر اس کی اجرت کل ستر روپیہ اس نے قبول کی، بادشاہ پر اس کی مصنوعی بے نیازی واستغناء کا پورا اثر ہوا، نتیجہ یہ ہوا کہ

(١) ترجمہ: تخت بادشاہی وفقیری جو چاہو سب ہمارے پاس موجود ہے۔

اب تک تو کچھ علماء اور عام پبلک کے خوف سے اپنے مزخرافات کے اعلانیہ اظہار کی اسے جرأت نہ ہوتی تھی، لیکن بادشاہ کی عقیدت مندی کے بعد خوب کھیل کھیلا، ایک خاص قسم کی لمبی ٹوپی سر پر رکھے آگے آگے دو جھنڈوں کے ساتھ اس کے ''فربوذ'' اس کی سواری نکالتے تھے، باہم ایک دوسرے پر عنبر وگلاب چھڑکتے جاتے اور وہی مجہول المعنی اختراعی الفاظ والے منتر جپتے جاتے تھے اور اب ان کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، دلّی کی ایک بڑی مخلوق اس کی معتقد اور اس کی اصطلاح میں اس کی ''فربوذ'' ہو گئی تھی، فرخ سیر کے عہد تک اس کا یہی حال رہا، محمد شاہ کے زمانہ میں جب محمد امین خاں (١) منصب وزارت سے سرفراز ہوئے تو منجملہ اور کاموں کے اس ''نمود انموذ'' کی بھی خبر لینی چاہی، لیکن اتفاق دیکھئے، جیسا کہ طباطبائی نے لکھا ہے، ٹھیک ان ہی دنوں میں جب اس کی گرفتاری کے احکام جاری ہوئے، امین خاں جو مرض قولنج میں پہلے ہی سے مبتلا تھے انتقال کر گئے، مردود ''نمود وانموذ'' کے لئے ان کی موت استدراج کا ذریعہ بن گئی، اب کیا تھا، خوب لن ترانیوں کی لینے لگا، اگرچہ دو تین سال بعد خود بھی مر گیا اور اسی کے بعد اس کے خلیفہ اول ''دوجی یار'' اور صاحبزادے بلند اقبال ''نما نموذ'' میں ''نصف لی ونصف لك'' کے قصہ میں جھگڑا ہو گیا، دوجی یار نے آخر ایک دن جب اس کے اکثر ''فربودوں'' کا مجمع تھا کھڑے ہو کر ''سازش'' کا سارا قصہ سنا دیا، دونوں مل کر جو مسودات بناتے اور کاٹ پیٹ کر درست کرتے تھے ان کا طومار لوگوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر

''از جانب خدا می بود، حاجت بحک واصلاح ہم دیگر نداشت'' (٢)

(اگر اللہ میاں کی طرف سے یہ کتاب ہوتی تو اس میں کاٹ چھانٹ اور اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی)۔

دونوں کے حروف کے پہچاننے والے کثرت سے موجود تھے، راز کھل گیا اور بے چارے عوام کو اس کے فتنہ سے نجات میسر آئی، اگرچہ ''نما نموذ'' نے کچھ دن اپنے باپ کی

(١) حضرت آصف جاہ اول بانی سلطنت آصفیہ کے عم زاد بھائی تھے ان کے قصے آگے بھی آ رہے ہیں۔

(٢) سیر المتأخرین۔

بیگوکت کو بجائے دہلی کے ایک دیہات میں جا کر چلایا اور ''نمانمود'' کے بعد ''فغار'' صاحب دوسرے بیٹے نے بھی کچھ دن اس تحریک کو چند لوگوں میں باقی رکھا، یہاں تک کہ بالآخر ''فغار'' کے مرنے کے بعد چند بقیۃ السلف اس کے اعزہ بنگال میں پناہ گزیں ہوئے اور مشہور اشقی القوم میر جعفر کے بیٹے میرن کی سرپرستی میں کچھ دن گزارے، خدا جانے ان منحوسوں کے نام لیوا اب بھی بنگال میں پائے جاتے ہیں یا نہیں؟ تاہم ایک مدت تک خصوصاً اس زمانہ میں جس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ دلّی میں تھے، ہندوستان کے مسلمان اس خبیث فتنہ کا شکار ہو رہے تھے اور واقعہ کچھ بھی نہ تھا، عالمگیر کے عہد میں کابل کا صوبہ دار امیر خاں تھا، اس کے پاس ایران سے یہی ''نمود وانمود''، جس کا اصلی نام محمد حسین تھا، آیا اور سید ہونے کا مدعی ہوا، امیر خاں کی بیوی جو لاولد تھی اس نے ایک لڑکی پال رکھی تھی اسی سے اس کا نکاح ہو گیا، امیری سے گزرنے لگی، امیر خاں جب مر گیا تو محمد حسین جو امیر خاں کے خوشبوخانہ کا داروغہ بھی تھا، عطر وگلاب کا تحفہ لے کر دلّی چلا، لاہور میں عالمگیر کی وفات اور خانہ جنگی کی خبر ملی، امراء کے ہاتھ اسی عطر وگلاب کو بیچ کر اس نے ساٹھ ستر ہزار روپے کھرے کئے اور اسی نے ''دوجی یار'' سے سازش کر کے مکر وفریب کا یہ طلسم کھڑا کیا تھا۔(۱)

مسلمانوں کی یہ زود اعتقادیاں جو غلط تصوف کے رواج کا نتیجہ تھیں، حتی کہ بادشاہ تک ان ہی اوہام میں مبتلا تھا، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک صاحب بصیرت روح کے لئے کس درجہ سوہان روح بنی ہوئی ہونگی، اور بات کچھ اسی پر ختم نہیں ہو گئی تھی، یہ تو ایک فرقہ تھا، اور بھی اس قسم کے فرقے مختلف ناموں سے تصوف وعرفان کے بلند آہنگ دعوؤں کے ساتھ پیدا ہو رہے تھے اور مختلف شعبدوں، کرشموں سے عوام کو اپنی طرف مائل کر کے گمراہ کر رہے تھے۔

(۱) میں نے اس مردود ''نمود وانمود'' کے حالات میں ذرا زیادہ بسط سے قصداً کام لیا ہے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس زمانہ میں بھی بعض لوگ اپنے مریدوں اور عزیزوں کو جو عجیب وغریب خطابات تقسیم فرماتے ہیں یا نبوت ومسیحیت مہدویت وغیرہ کے معجون سے ''بروزی'' ''مثالی'' اور خدا جانے کس کس قسم کی نبوتیں تراش رہے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہندوستان ان تماشوں کو پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔

نجوم کے شعبدے اور کہانت کے کرشمے

شاہ صاحب خود اپنا ذاتی تجربہ بیان فرماتے ہیں:

''ما تجربہ کردہ ایم کہ ماہر در فن نجوم چوں دانست کہ الحال کدام دقیقہ است از دقائق روز، ازیں جا ذہن او منتقل می شود، بمطالع وہمہ بیوت ومواضع کواکب در خاطر حل صورت می بندد گویا صفحہ تسویۃ البیوت، مقابل او ایستادہ است، وہم چنیں ماہر در فن رمل گاہے در دل خود معین می کند کہ فلاں انگشت را لحیان قرار دادہ ام، وفلاں انگشت را فلاں شکل در ذہن صورت می بندد، ازیں اشکال کدام متولد می شود، تا اینکہ زائچہ پیش او حاضر می شود''۔

(میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ نجوم کے فن میں جن لوگوں کی مہارت ہوتی ہے، جب انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت دن کے دقیقوں میں سے کون سا دقیقہ ہے تو مطالع کے ہر ہر بیت ومقامات کواکب کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے، اور یہی حال ان لوگوں کا ہے جو فن رمل میں ماہر ہوتے ہیں، اپنے دل میں یہ خیال جماتے ہیں کہ فلاں انگلی کو میں نے لحیان قرار دیا ہے اور فلاں انگلی کو فلاں شکل، اور ان سب سے ذہن میں ایک صورت قائم کر کے سوچتے ہیں کہ ان میں ظاہری شکل وصورت میں بچہ کس کے مناسب ہوگا، اس طرح زائچہ سامنے ہو جاتا ہے)۔

اور یہ نجوم کا حال ہے، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ کہانت جس کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں کبھی جن اور ارواح کو حاضر کیا جاتا ہے، (یعنی موجودہ زمانہ کا اسپر چولزم) نیز توجہ کو کسی نقطہ پر مرکوز کر کے معمول کو متاثر کرنا جسے اب مسمریزم کہتے ہیں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''ہمت بستن برکارے وبشکل مہیب برآمدن ودل بردل کسے داشتن وطالب را مسخر کردن ہمہ از فنون نیرنج است''(۱)

(کسی کام کے متعلق ہمت کو قوی کرنا اور ڈراونی شکل میں لوگوں کے سامنے اپنے کو نمایاں کرنا، کسی کے دل پر دل رکھنا اور طالب کو مسخر کرنا یہ ساری باتیں علم نیرنگ سے تعلق رکھتی ہیں)۔

لیکن غلط تصوف نے عوام کو باور کرایا تھا کہ یہ ساری باتیں قرب ہی کے دلائل ہیں، اس زمانہ کا ''ہپناٹزم''، جس میں اپنے اوپر وجد کی حالت طاری کر کے غیبی باتیں بتائی جاتی ہیں،

(۱) وصیت نامہ ص ۴،۵۔

کچھ لوگ اس راہ سے بھی شکار پھنسا رہے ہیں، حضرت شاہ صاحب ہی کا بیان ہے:

''ہم چنیں وجد وشوق وقلق وسرایت ایں حالت در حاضر آں''

(اسی طرح وجد وشوق وبے چینی اور جو لوگ موجود ہوں ان میں اس حال کا ساری وطاری ہو جانا)۔

حالانکہ اس حال کو بھی مقبولیت حق سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ بقول حضرت:

''منشاء آں حدت قوت بہیمہ است''

(اس کا منشاء بہیمی قوت کی شدت اور تیزی ہے)۔

اور یہ تو زندہ پیروں کے کرامات شمار ہوتے تھے، وہمی تخیلات نے گزشتہ روحوں کے متعلق عجیب وغریب خیالات پیدا کر دیئے تھے، فاتحہ جو عموماً اس لئے کیا جاتا ہے کہ بزرگوں کی روح کو کچھ قرآن پڑھ کر اور غرباء ومساکین کو کھلا کر اس کو ثواب بخشا جائے، لیکن سرزمین ہند میں اس فاتحہ نے بتدریج ایصال ثواب کے مقصد کو چھوڑتے ہوئے قریب قریب وہی شکل اختیار کر لی تھی جو ہندوؤں میں چڑھاوے کی ہے، یعنی مختلف قسم کے پھل، پھول، پکوان وغیرہ دیوتاؤں اور دیویوں پر اس لئے چڑھائے جاتے ہیں کہ ان دیوتاؤں کی روحیں چڑھانے والوں کے اس تحفہ سے خود متمتع اور لذت گیر ہوتی ہیں، جاہل مسلمانوں میں اس فاتحہ کا بھی قریب قریب یہی مطلب ہو گیا تھا اور عوام ہی کیا بعض خواص تک کا یہ خیال تھا کہ جو کھانا کسی بزرگ کے نام فاتحہ دیا جاتا ہے، اس پر اس بزرگ کی روح حاضر ہوتی ہے اور اس سے لذت گیر ہوتی ہے، مولوی غلام حسین طباطبائی جنہوں نے سیر المتاخرین جیسی کتاب لکھی ہے اور جوان کے علم وفضل کی کھلی دلیل ہے خود اپنے متعلق ایک موقعہ پر اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''بعضے مردم کہ دسترخوان حضرت شاہ مرداں می نمائند، وبراں نشانے از غیب می شود، چنانچہ در ہند معمولی ومکرر مردم ہوشیار بچشم خود نشانہا را دیدہ سرمۂ اعتقاد وبصیرت در دیدۂ دلہا کشیدہ اند، وایں کرامت ازاں جناب بنظر احقر ہم الحمد للہ مکرر در آمدہ''۔(۱)

(بعض لوگ جو حضرت شاہ مرداں (یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ) کے دسترخوان کی

(۱) ص: ۲۵۰ ج: ۲۔

تقریب کرتے ہیں اور اس دسترخوان پر غیب سے آپ ہی آپ ایک نشان نمایاں ہو جاتا ہے، چنانچہ ہندوستان میں اس کا رواج ہے اور بڑے اچھے ہوش گوش والوں نے بار بار اپنی آنکھوں سے ان نشانوں کو دیکھا اور اپنی آنکھوں میں اعتقاد وبصیرت کا سرمہ لگایا، بلکہ اس (دسترخوان والی کرامت حضرت کی) کا معائنہ تو الحمد للہ متعدد بار اس احقر کو بھی ہوا ہے)۔

جس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام سے جو فاتحہ دی جاتی تھی، اس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ فاتحہ کے اس کھانے پر خود حضرت تشریف فرما ہوتے ہیں، اور اسی لئے ''قبولیت'' کی علامت اس پر بنا دیتے ہیں، بتایا جائے کہ کہاں فاتحہ کا وہ مقصد کہ بزرگوں کی روح کو اس کا ثواب بخشا جاتا ہے اور کہاں یہ اعتقاد کہ اس کھانے پر ان بزرگوں کی روح خود حاضر ہوتی ہے، یہ نشانات کس طرح بنتے تھے، اس سے تو خدا ہی واقف ہے، لیکن طباطبائی صاحب ہی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے جوان کے نزدیک خارجی العقیدہ تھا شیعوں کے علم الرغم ان غیبی نشانوں کی خبر سن کر دعویٰ کیا کہ ہم بھی یزید وغیرہ کے نام کا فاتحہ دیتے ہیں اور اسی قسم کے دسترخوان کا انتظام کرتے ہیں، چونکہ ان کی روحوں سے مجھے اخلاص ہے اس لئے وہ بھی ضرور آ کر دسترخوان پر نشان بنائیں گے، یہ ارادہ کر کے اس نے دسترخوان کا انتظام کیا اور ایک عورت کو حکم دیا کہ کمرہ میں دسترخوان بند کر کے باہر اس کی کنجی لے کر بیٹھ جائے اور تھوڑی دیر بعد دروازہ کھولے اور جب نشانات دسترخوان پر نمایاں ہوں تو مجھے خبر دے تا کہ دوسروں کو بھی اس کا تماشہ دکھایا جائے، اب طباطبائی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''زن در باطن شیعہ بود ومذہب خود مخفی داشت، بعد از ساعتے حسب الامر در را کشود، دید کہ سگے سیاہ گرگیں، دراں جائے گاہ بر سر دسترخوان نشستہ از ہر گونہ طعام اندک اندک چشیدہ، ومی چشد، از شدت شغف خود داری نہ توانست، بے اختیار دوید وبشارت رسانید کہ نشان چہ معنی دارد، خود تشریف آوردہ نوش جان می نمایند''

(وہ عورت اندر سے شیعہ مذہب اور تقیہ کئے ہوئے تھی تھوڑی دیر بعد اس نے جب دروازہ کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک کالا بھیڑیئے جیسا کتا وہاں دسترخوان پر ہر قسم کے کھانے کو تھوڑا تھوڑا چکھ چکا اور چکھ رہا ہے، عورت کو اپنے مذہب سے جو محبت تھی اس نے اپنی خودداری

پر اس کو باقی نہ رکھا اور بے اختیار ہو کر دوڑی، امیر کو اس نے بشارت پہنچائی کہ نشان کا کیا پوچھتے ہیں وہ تو خود ہی تشریف لا کر نوش جان فرما رہے ہیں)۔

ظاہر ہے کہ یہ حرکت ''زن در باطن شیعہ بود'' ہی کی تھی، بس اسی واقعہ سے ان نشانوں کے بنانے والوں کا سراغ مل سکتا ہے، آج بھی ہندوؤں میں جب مردے گنگا میں بہانے کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ان کے بہنے کے بعد دوسرے دن عموماً پنڈت یہ اعلان کرتے ہیں کہ جس گھاٹ سے مردہ بہایا گیا اس کے کنارے کی ریت پر فلاں جانور کے پاؤں کے نشانات دیکھے گئے، اور اسی سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ مرنے والے نے اسی جانور کے خون میں جنم لیا جس کے نشانات نظر آئے ہیں، مجھ سے بعض معتبر برہمنوں نے بیان کیا کہ یہ کارستانی خود ان پنڈتوں کی ہوتی ہے جو گنگا کے کنارے مردوں کے بہانے کی رسم انجام دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے، یا ممکن ہے کہ رات کو ہر قسم کے جانور چلتے ہیں ان ہی کو مردے کے قدم کا نشان فرض کر لیا جاتا ہے یا وہم کی خلاقی ہو، بہر حال طباطبائی صاحب نے کتے کا جو واقعہ نقل کیا ہے اور یہ کہ ہر قسم کے کھانوں کو ''اندک اندک'' اسے چکھتے پایا گیا، اس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ صاحب فاتحہ کے متعلق لوگوں کا عام خیال یہی تھا کہ تھوڑا تھوڑا ہر کھانے سے مردہ کی روح چکھتی ہے، گو بحمد اللہ اب بہت کم لوگ فاتحہ کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں اور عموماً اب یہی سمجھا جاتا ہے کہ مقصود بزرگوں کی روح کو ثواب پہنچانا ہے، لیکن بعض لوگ اب بھی ایسے ہیں، جنہوں نے مجھ سے خود کہا ہے کہ ''کھانے کی روح کو بزرگوں کی روح آ کر کھا جاتی ہے اور اس کے مادی وجود کو ہم لوگ کھاتے ہیں، اسی بنیاد پر ہم اس کھانے کو بزرگوں کا اُلش خیال کرتے ہیں، الغرض غلط ''تصوف'' اور جھوٹے ''تمشیخ'' کی راہوں سے اقتصادی و عملی تباہیوں کا سیلاب مختلف شکلوں میں، مختلف گوشوں میں مسلمانوں کی خالص اسلامی و دینی زندگی کے ''ایوان'' کو دھمکیاں دے رہا تھا۔

ام الفتن یعنی خانہ جنگی

اور سچ پوچھئے تو باہر کے فتنوں کو جگانے میں دراصل جو حقیقی اسباب کام کر رہے تھے،

ان کا باہر سے نہیں، بلکہ بالکلیہ تعلق ہمارے ''اندر'' ہی سے تھا، کچھ آج نہیں بلکہ جب کبھی جہاں کہیں یہ صورت پیش آئی ہے، تحلیل و تنقیر کے بعد یہی ثابت ہوا کہ جو کچھ ہوا:

"وما ظلمناهم ولكن كانوا أنفسهم يظلمون" (نہیں ظلم کیا ہم نے بلکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے) کے ازلی قانون ہی کے تحت ہوا، خصوصاً امت محمدیہ علیٰ صاحبہا صلوٰۃ وسلاماً کے متعلق تو صحیح حدیثوں میں آ چکا تھا کہ جب حضور ﷺ نے بارگاہ الٰہی میں درخواست پیش کی:

"لا تسلط عليهم عدواً من أنفسهم"

((میری امت پر) ان ہی میں سے ان پر کوئی دشمن نہ مسلط کیا جائے)۔

تو "الحكيم الغنی" کی طرف سے آپ کو جواب ملا:

"لا أسلط عليهم عدواً سوى أنفسهم يستبيح بيضتهم، ولو اجتمع عليهم من بأقطارها حتى يكون بعضهم يهلك بعضها"۔

(میں ان پر ان کے سوا کسی (بیرونی دشمن) کو مسلط نہیں کروں گا، بلکہ وہی اندرونی دشمن ان کے قلمرو میں تباہی پھیلائے گا اور خارجی دشمن مسلمانوں پر مسلط نہیں ہو سکتے، اگرچہ زمین کے کناروں سے سمٹ کر کیوں نہ وہ آ جائیں بلکہ مسلمان ہی باہم بعض بعض کو ہلاک کریں گے)۔

صحاح کی مختلف کتابوں مثلاً ابوداؤد و ترمذی میں الفاظ کی کچھ کمی بیشی کے ساتھ یہ حدیث موجود ہے اور اسلام کی تاریخ شاہد ہے، جو مصیبت مسلمانوں پر جس شکل میں بھی آئی در اصل اس کی ابتداء گھر والوں سے ہوئی، حضور ﷺ اکثر فرمایا کرتے:

"أخشىٰ عليكم الدنيا فتنافسوا فيها" (بخاری)

(میں تم پر دنیا سے ڈرتا ہوں کہ اس کے معاملہ میں باہم نفسانیت میں مبتلا ہو جاؤ گے)۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جب فارس کے اموالِ غنیمت آئے، آپ نے ان کو مسجد نبوی کے چبوتروں پر ڈلوا دیا، صبح ہوئی تو جو کچھ آیا تھا اس پر سے چادر ہٹائی گئی، راوی کا

بیان ہے:

"فنظر عمر إلى شيءٍ لم تر عيناه مثله من الجوهر واللؤلؤ والذهب والفضة فبكى"

''عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسی چیزیں دیکھیں جنہیں ان کی آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا یعنی جواہرات موتی اور سونے چاندی وغیرہ پس عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو پڑے)۔

عبدالرحمٰن بن عوف حاضر تھے، بولے:

"هذا من مواقف الشكر فما يبكيك"

(یہ تو شکر کی جگہ ہے پھر آپ کو کس خیال نے رُلایا)۔

فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا:

"أجل ولكن الله لم يعط قوماً هذا إلا ألقى بينهم العداوة والبغضاء" (۱)

(ہاں! لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو یہ چیز نہیں دی، مگر اسی کے ساتھ ان میں باہم عداوت وبغض وکینہ پیدا ہوگیا)۔

مغل حکومت بھی عہد عالمگیری کے بعد فتنوں کے جس طوفان میں گھر گئی تھی، جس کا ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا، جاننے والے جانتے ہیں کہ باہر سے جتنے سیلاب آئے ان کا سرچشمہ بھی اندر ہی تھا جس کا افسانہ طویل ہے اور عام طور سے تاریخ کی کتابوں میں مسطور ہے، میرا اشارہ اس اندرونی فتنہ کی طرف ہے جس کی تعبیر عام کتابوں میں ''سادات بارہ'' (۲) کے فتنہ سے کی جاتی ہے۔

---

(۱) کتاب الخراج لأبی یوسف۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ سید ابوالفرج واسطی اکبر کے عہد سے پہلے عراق کے مشہور شہر واسط سے ہندوستان تشریف لائے، ابتداء میں پٹیالہ (پنجاب) کے گردونواح میں آپ کی اولاد آباد ہوئی، جن گاؤں میں ان کی اولاد آباد ہوئی تھی ان کے نام چیت بانور، انجھن پور اور جگت نیر تھے، پھر سادات کا یہ خاندان آگے بڑھا، دوآبہ میں آباد ہوا، ضلع مظفر نگر میں جانسٹھ اب بھی ایک مشہور قصبہ ہے اس میں اس خاندان کے کچھ لوگ آباد ہوئے اور وہی سادات بارہ کے نام سے مشہور ہیں، یہ بارہ کہلاتے ہیں: مؤرخین اس کی توجیہہ میں......

سادات بارہ کا فتنہ

عالمگیر کے لڑکے بہادر شاہ کے انتقال کے بعد معزالدین جہاندار شاہ اور فرخ سیر میں جنگ ہوئی، اس معرکہ میں فرخ سیر کی کامیابی چونکہ بالکلیہ بارہ کے سیدوں میں دو بھائی حسین علی خاں اور حسن عالی خاں کی رہین منت تھی، اسی بنیاد پر فرخ سیر کے عہد میں حکومت پر ان ہی دو بھائیوں کا اقتدار قائم ہوگیا، اور ایسا اقتدار کہ بادشاہ بیچارہ ''شاہ شطرنج'' ہوکر رہ گیا، قدرتاً فرخ سیر کے لئے یہ صورت ناقابل برداشت بنتی چلی جارہی تھی، سید بھائیوں اور فرخ سیر میں ان بن ہوگئی اور اسی مخالفت اور معاندت نے بالآخر ان نتائج کو پیدا کیا جن کا خمیازہ آج ہندوستان کے مسلمان بھگت رہے ہیں، طباطبائی جو ہم مشربی کی وجہ سے بجائے فرخ سیر کے سید بھائیوں کے سخت ترین طرف داروں میں ہیں، ان کو لکھنا پڑا کہ یہی فساد سادات:

''بمرور تمام مملکت ہندوستان را فرا گرفتہ، اقتدار سلاطین تیموریہ بالمرہ بباد فنا رفت'' (۱)

(آہستہ آہستہ ہندوستان کی ساری مملکت کا اس نے احاطہ کرلیا اور تیموری سلاطین کا اقتدار قطعی طور سے فنا کی آندھی کے نذر ہوگیا)۔

اس فتنہ کی اصل جڑ شیعہ سنی اختلاف تھا

اگرچہ بظاہر یہ مخالفت بادشاہ اور ان سید برداران کے درمیان تھی، لیکن جو واقعات کے عالم ہیں وہ جانتے ہیں کہ ''سادات بارہ'' کے اقتدار نے دراصل اسی فتنہ کی آگ کو ہوا دے کر تیز کردیا، جس کی ابتداء ہمایوں کے عہد سے اس ملک میں شروع ہوئی تھی، سب جانتے ہیں

......مختلف ہیں لیکن ابوالفرح واسطی کی جو اولاد جگہ نیر میں آباد ہوئی تھی اور بعد کو وہ جاجیزی سادات کے نام سے مشہور ہوئی ان کا ایک سلسلہ بہار ضلع مونگیر میں پایا جاتا ہے اور چونکہ بارہ گاؤں میں یہ آباد ہیں اس لئے سادات بارہ گاواں کہلاتے ہیں، خاکسار مناظر احسن گیلانی کا تعلق بھی ان ہی جاجنیری سادات سے ہے، بارہ کی وجہ یہاں بھی ممکن ہے بارہ گاؤں ہو۔

(۱) ج:۲ ص:۴۰۷۔

کہ یہاں اسلام کا داخلہ (عربی حملوں کے بعد) ترکستانی مسلمانوں کے ذریعہ سے ہوا۔

اور یہ عجب اتفاق ہے کہ غوریوں سے لودیوں تک جتنے خانوادے دلّی کے تخت پر قابض ہوئے سب کے سب سنی حنفی مسلمان تھے، جب تک یہ دور رہا ہندوستانی مسلمان اس وقت تک بڑے خوش قسمت رہے۔

ہندوستان میں شیعیت کے قدم

لیکن مغلی عہد میں ہمایوں کو شیر شاہی حکومت کے مقابلے میں جب ایرانی حکومت کی امداد سے کامیابی حاصل ہوئی تو اس ملک میں تورانیوں کے ساتھ ایرانیوں کا اقتدار بھی بڑھنے لگا، ہمایوں اور ہمایوں کے بعد جتنے مغل بادشاہ تھے وہ بطور منت شناسی کے ایران سے آنے والوں کو بڑی قدر وعزت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لینے لگے اور اسی زمانے سے بڑے بڑے عہدوں پر حتی کہ صوبہ داریوں اور گورنریوں پر بھی ایرانی حکام کا تقرر ہونے لگا، عالمگیر کے عہد تک مغل حکومت شباب کے دور میں تھی جو زہر اندر داخل ہوگیا تھا اس کے نتائج محسوس نہیں ہوتے تھے، لیکن عالمگیر کے بعد عناصر کے اعتدال میں ضعف پیدا ہوا اور ان دو متضاد عناصر کے اندرونی تصادم نے رنگ لانا شروع کیا، سادات بارہ اگرچہ وطناً ایرانی نہ تھے لیکن ان کا مسلک وہی تھا جو ایرانیوں کا تھا، قدرتی طور پر ان کے زمانۂ اقتدار میں ایرانی امراء کو تورانی یا دوسرے لفظوں میں ''سنی'' امراء پر برتری حاصل ہونے لگی، اور اتنی برتری کہ بعض بڑے بڑے تورانی امیر تو حکومت اور حکومت کے تعلقات سے دست کش ہو کر گھر بیٹھ گئے، جن میں حضرت آصف جاہ اول بانی حکومت آصفیہ خاص طور قابل ذکر ہیں، میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

''بنابر گرمی بازار امراء جدید وکساد بازاری امراء قدیم از نوکری استعفاداده به دار الخلافه شاہجہان آباد آمده ولباس درویشانه پوشیده خانه نشین شد''۔(۱)

(نئے امیروں کی گرم بازاری اور پرانے قدیم امراء کی کساد بازاری کو دیکھ کر حضرت

(۱) ص ۱۲۔

آصف جاہ اول مغلی حکومت کی ملازمت سے مستعفی ہو کر شاہجہان آباد پہنچے اور درویشانہ لباس اختیار کر کے خانہ نشین ہو گئے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ سارے فتنوں کی بنیاد اگر سچ پوچھئے تو ہندوستان میں بھی وہی مسئلہ رہا جس سے کہ ہر جگہ حتی کہ پہلی صدی ہجری میں فتنوں کی ابتداء ہوئی، یعنی وہی شیعیت وسنیت کا جھگڑا، ابتدائے تاریخ اسلام سے جس کسی کے دل میں دنیا طلبی کی انگیٹھی سلگی اس نے دین کے اسی مسئلہ کی آڑ لے کر اپنے حرص وہوا کی جہنم روشن کی، اور آج تک یہ حال ہے کہ جس واقعہ پر اس اختلاف کی بنیاد قائم ہے، حالانکہ اس پر تیرہ سو سال گزر چکے، لیکن جس کسی کا جی چاہتا ہے، اس کو تر وتازہ کر کے اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنالیتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ اسی وقت پیش آرہا ہے، اور فریقین کو دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو ابھی طے کرنا ہے۔

اسلامی عقائد کے متعلق ایک عام غلط فہمی

کتنی عجیب بات ہے کہ قرآنی تعلیمات کے بے شمار بینات ومحکمات مثلاً یہ کہ کسی مومن کے لئے قطعاً یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے کو کسی حال میں اکیلا وتنہا خیال کرے، اس پر یہ اعتقاد حتمی طور پر واجب ہے کہ ہر حالت میں ایک لامحدود قوت کو انتہائی رحم وکرم کے ساتھ اپنے قریب یقین کرے، محسوس کرے کہ یہ قوت اس کے ظاہر وباطن اول وآخر کو محیط ہے، بغیر کسی دغدغہ کے اس واقعہ پر بھروسہ کرے کہ اس کی ایمانی صفت کی وجہ سے یہی لامحدود طاقت ہر لمحہ اور ہر حال میں اس کی طرف سے مدافعت پر آمادہ ہے، جب مومن مخلوقات کی ربوبیت پر قدم جماتا ہے تو اس کو باور کرنا چاہئے اور قطعاً بغیر کسی شک وشبہ کے باور کرنا چاہیے کہ غیبی قوتیں یعنی ملائکۃ اللہ اس پر نازل ہو رہے ہیں، اور دنیا وآخرت میں اس کی امداد واعانت ان کے فرائض میں سے ہے، علی ہذا مثلاً ہر مومن کا فرض ہے کہ اپنے ماں باپ، اموال وتجارت، گھر ودر، الغرض ہر چیز سے زیادہ اپنے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت رکھے، ظاہر ہے کہ یہ اور ایسی بیسیوں باتیں ہیں جو قرآن کے نصوص صریحہ سے بغیر کسی تاویل کے ماخوذ ہیں، اسی طرح حمد

وشکر، توکل وتفویض، توبہ واستغفار، امانت واطاعت وغیرہ وغیرہ، ان کے قرآنی حقائق ہونے میں کون شک کرسکتا ہے، بلاشبہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا انکار کرنے والا کافر ہوجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان ہی چیزوں کا نام عقائد ہے، لیکن بجائے ان کے ایسی باتیں کہ خدا کے صفات زائد برذات ہیں یا عین ذات، صفات حقیقی سات ہیں یا آٹھ پھر ہر صفت کی نوعیت کیا ہے، خصوصاً کلام کی قسمیں اور اس کے مباحث، ازیں قبیل یہ مسئلہ کہ دنیائے اسلام کے کس علاقہ کے کن باشندوں کو، اور ان باشندوں میں کس قبیلہ کو، اس قبیلہ میں سے کس بطن کو، اس بطن سے کس فخذ کو، اس فخذ سے کس گھرانے والوں کو رسول اللہ ﷺ کی جانشینی اور خلافت کا صرف استحقاق نہیں بلکہ پہلا استحقاق حاصل ہے، ان مسائل کو عقائد کی کتابوں میں مجبوراً اس لئے شریک کرنا پڑا کہ مختلف لوگوں نے مختلف زمانوں میں ان ہی مسائل کو اپنے فساد وزیغ کا ذریعہ بنایا، اگر بنی امیہ خلافت کے مباحث کا سب وشتم کے ساتھ برسرمنبر فیصلہ کرنے کی ابتداء نہ کرتے تو جو واقعہ ہوچکا تھا اور جن لوگوں کا اس سے تعلق تھا جب وہ گزر چکے تھے، پھر ان کو کوئی خواہ مخواہ کیوں چھیڑتا، لیکن چھیڑنے والوں نے ان ہی چیزوں کو زیادہ اجاگر کرکے اسلام کی طرف منسوب کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کتابوں میں آخر ان ہی مباحث کی طرف زیادہ توجہ کرنی پڑی اور قرآن کے سینکڑوں بینات ومحکمات نگاہوں سے اوجھل ہوگئے اور ایسے اوجھل کہ بجائے اعتقادیات میں شریک کرنے کے سمجھا جاتا ہے کہ اچھے مسلمان ہونے یا دوسرے لفظوں میں صوفی مسلمان ہونے کے لئے ان کی مشق ومزاولت ایک پیشہ کی حیثیت رکھتی ہے اور بس، حالانکہ ان میں ہر مسئلہ قرآن کا تھا، جس کا انکار آدمی کو اسلام کے دائرہ سے خارج کردیتا ہے، یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ عقائد کی کتابوں میں جن چیزوں کو عقائد کے ذیل میں علماء نے شریک فرمایا ہے، میں ان کو اعتقادیات قرار دینے سے انکار کررہا ہوں، بلکہ مجھے کہنا یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف اغراض سے لوگوں نے بعض خاص چیزوں پر جو زور دے دیا تو اس کا آج یہ نتیجہ ہے کہ بہت سے اعتقادی امور ان کتابوں میں شریک نہ ہوسکے جو اسی لئے لکھی گئی

ہیں کہ مسلمان کا اس کے ہر مسئلہ پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے، لوگوں کو غلط فہمی یہ ہوگئی کہ جو کچھ ان کتابوں میں نہیں گویا وہ اعتقادیات سے تعلق ہی نہیں رکھتا حالانکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ واقعہ نہیں ہے، کم از کم قرآن کی ہر تعلیم کی حیثیت تو یہی ہے کہ اس کا انکار کفر ہوجاتا ہے، خواہ وہ توکل کے سلسلے کی چیز ہو یا تسلیم ورضا وصبر وشکر کے باب کی ہو۔

شہزادہ فرخ سیر کا بیدردانہ قتل

میں اپنے مقصد سے بہت زیادہ دور ہٹتا چلا جارہا ہوں، کہہ یہ رہا تھا کہ بالآخر سادات بارہ کے زمانے میں پھر اسی پرانے مسئلہ نے ہندوستان میں سر اٹھایا اور بالآخر اس کا انجام اس پر ہوا کہ ان ہی بادشاہ گیر سید بھائیوں کے ہاتھ فرخ سیر مقتول ہوا اور انتہائی بیدردی وشقاوت قلبی میں اس کی گردن کھینچ دی گئی، حضرت آصف جاہ اول کے استاد مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی نے تاریخ لکھی:

دیدی کہ چہ بادشاہ گرامی کردند — صد جور وجفا از رہ خامی کردند
تاریخ چوں ازخرد بجستم فرمود — سادات بوئے نمک حرامی کردند
۳۳

مغل بادشاہ کا ارباب حکومت کے ہاتھ سے مارا جانا غالباً یہ پہلا واقعہ تھا، جو دلی میں پیش آیا، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت جوان ہوچکے تھے۔

شاہ عبدالرحیم کا ایک عجیب خواب

''انفاس العارفین''، میں آپ نے فرخ سیر اور سید بھائیوں کے اس تنازعہ کا ذکر فرمایا ہے اور ایک خاص بات یہ لکھی ہے کہ آپ کے والد شاہ عبدالرحیم کی خدمت میں اس جھگڑے کے قصے جب پیش ہوئے تو آپ نے فرمایا:

''در واقعہ دیدم کہ گویا مسند فرخ سیر را مردم می خواہند کہ برہم زنند''

(میں نے (کشفی) واقعی میں دیکھا کہ فرخ سیر کی مسند کو لوگ الٹ دینا چاہتے ہیں)۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ نے جو واقعہ نقل فرمایا ہے ''عقلی دنیا'' اس کے ماننے کے لئے شاید تیار نہ ہو، لیکن جیسا کہ ابدالی اور مرہٹہ کی جنگ کا غیب میں کسی اور سے تعلق تھا، فرخ سیر کا ایک زمانے تک سید بھائیوں کے حملہ سے محفوظ رہنا اس میں جس کا ہاتھ کام کر رہا تھا، وہ شاہ ولی اللہ کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں کہ میرے والد نے ان لوگوں سے جو بادشاہ کی مسند الٹنا چاہتے تھے فرمایا کہ:

''برائے من ایں راہم چنیں بگذارید'' (۱)

(میری خاطر اس بادشاہ (فرخ سیر) کو اسی حال میں چھوڑ دو (یعنی اس پر ظلم وزیادتی نہ کرو)

شاہ ولی اللہؒ کا بیان ہے کہ جب تک ان کے والد زندہ رہے فرخ سیر پر آنچ نہ آنے پائی، لیکن جونہی ان کا انتقال ہوا، کُل:

''بعد پنجاہ روز از وفات حضرت ایشاں اسیر شد''

(پچاس دن آپ کی وفات کے بعد فرخ سیر قید ہوگیا)

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، اور تاریخوں میں اس کی تفصیل لکھی ہوئی ہے کہ فرخ سیر کا ان بھائیوں کے ہاتھ سے قتل ہونا تھا کہ ملک میں ایک ایسا زلزلہ برپا ہوا کہ پھر نہ تھما، شاہ ولی اللہ اپنی چشم دید شہادت یہ درج فرماتے ہیں:

''ہرج ومرج عظیم دست داد'' (سخت کشت وخون کی گرم بازاری ہوئی)

خصوصاً تورانی امراء اپنے ہم مذہب بادشاہ کے اس دردناک مظلومانہ قتل سے سخت برہم ہوئے، جیسا کہ میں نے لکھا تھا، حضرت آصف جاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ترک دنیا کرکے اسی ''جنون ترک منصبہا'' کو اختیار فرمالیا تھا جو شاہ ولی اللہ کا مسلک تھا، لیکن اس واقعہ نے ان کی رگ حمیت میں جوش پیدا کردیا اور لباس فقیری اتار کر میدان میں اتر آئے، سادات بارہ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کو رام کرلیا جائے، لیکن دلّی چھوڑ کر وہ مالوہ اور دکن کے جنگلوں

(۱) ص:۶۲۔

میں جوش انتقام میں بھرے ہوئے شیرژیاں کی طرح ڈکارتے پھرتے تھے، مظلوم بادشاہ کی تڑپتی ہوئی لاش ان کو چین لینے نہیں دیتی تھی، مشہور ہے کہ حسین علی خاں نے ایک خط بڑی منت سماجت کا ان کو مالوہ لکھا، جواب میں صرف یہ شعر لکھ کر حضرت آصف جاہ نے بھیج دیا۔

من بے وفانیم بوفامی خورم قسم
من چوشما نیم بشمامی خورم قسم

رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کی تخت نشینی اور چند ہی روز میں ان کے انتقال کے بعد محمد شاہ کا دور دورہ

بہرحال فرخ سیر کو ختم کرکے ان بھائیوں نے پہلے رفیع الدرجات پھر رفیع الدولہ کو دلّی کے تخت پر اپنے نوکر ہونے کی حیثیت سے تخت نشین کیا، چونکہ دونوں مدقوق تھے، تین چار مہینے کے اندر اندر دونوں کا خاتمہ ہوگیا، تب سید برادران نے محمد شاہ بادشاہ کو اپنا نوکر بنا کر مغل تخت پر بٹھایا اور اسی کو حسین علی خاں اپنے ساتھ لے کر تورانیوں کے سردار آصف جاہ کو ختم کرنے کے لئے ایک فوج لے کر دکن کی طرف روانہ ہوا، جہاں آصف جاہ نے قبضہ جمالیا تھا مگر چند ہی منزل دلّی سے آگے بڑھے تھے کہ آخر جس شاہینِ بلند آشیانہ کے شکار کے لئے نکلے تھے اس کی دعاہائے نیم شبی کہیے کہ دعا کے ساتھ اس کی دوا کے بھی شکار ہوگئے، حضرت آصف جاہ کے چچازاد بھائی محمد امین خاں کے اشارہ سے میر حیدر کاشغری نے حسین علی خاں کا کام تمام کردیا، سفر میں جب حسین علی خاں کی بارگاہ لوٹی گئی تو طباطبائی کا بیان ہے کہ اس وقت خزانہ میں ایک کروڑ روپیہ تھا، اس بازو کا ٹوٹنا تھا کہ دوسرا بازو بھی ایرانیوں کا بظاہر ٹوٹ گیا، یعنی دوسرے بھائی حسن علی خاں المقلب بہ قطب الملک نے محمد شاہ کے ہاتھ گرفتار ہوکر قید خانہ میں آخری سانسیں پوری کیں، تورانی امیروں کی مغل دربار میں یہ بڑی کامیابی تھی، محمد شاہ جو شاہی کرنے کے لئے نوکر تھا اب اس کی جان میں جان آئی، کچھ دن تو محمد شاہ واقعی حضرت آصف

جاہ کو وزیر اعظم بنا کر محمد شاہ بنے رہے لیکن یاروں نے اس غریب کو بجائے تورانیوں کے پھر ایرانیوں کے زیر اثر ڈال دیا، بادشاہ نے مذہب گو نہیں بدلا لیکن مشرب بدل دیا، ابر سیاہ ان کا نقیب قرار پایا، عام حکم تھا کہ ادھر ہمالیہ کے دامن سے گھٹا اٹھے، بادل گرجے کہ میرا خیمہ، خرگاہ صحرا روانہ ہو، ہر طرف ؎

می دید صبح کلہ بستہ سحاب   الصبوح الصبوح یا اصحاب

ژالہ بارید بر رُخ لالہ!   المدام المدام یا احباب

کا شور تھا، اسی لئے بیچارہ آخر میں رنگیلے کے نام سے بدنام ہو گیا، آصف جاہ دربار کے اس رنگ کو دیکھ کر پھر دکن کی پہاڑیوں اور جنگلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔(۱)

حریف بظاہر بادشاہ سے ملے ہوئے تھے، لیکن ایرانیوں کو جو زخم تورانیوں سے پہنچا تھا، اس کی آگ اندر اندر بھڑکتی رہتی تھی، آخر وہ آگ بھڑکی اور طے کر لیا گیا کہ اب اس تورانی امیر اور اس کے ساتھیوں، ہم نواؤں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے، تاریخ میں واقعات کو بکھیر کر بیان کیا گیا ہے، لیکن تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ اندرونی کارروائی کیا ہوئی، محمد شاہ کا عہد! بذات خود وہ کچھ بھی تھا، لیکن اگر شاہ عبدالعزیز کی یہ روایت صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی چشم دید گواہی کے قریب قریب ہے کہ:

''در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند و ایں چنیں اتفاق کم می شود''(۲)

(محمد شاہ کے زمانہ میں بائیس بزرگ صاحب ارشاد سلسلہ اور طریقہ کے دلّی میں

(۱) کہا جاتا ہے کہ داڑھی رکھنے والے اس تورانی امیر پر ایرانی امراء فقرے چست کرتے تھے، قلعہ میں جب داخل ہوتے تو بڈھا بندر کا مشہور لطیفہ اس نیک دل وفادار بزرگ کی شان میں استعمال کیا جاتا، سُنا گیا ہے کہ جھلّا کر ایک دن حضرت آصف جاہ نے فرمایا کہ مجھے جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ لو لیکن میری آنکھیں اس دن کو دیکھ رہی ہیں جب لال قلعہ کی دیواروں پر بندر اچھلتے پھریں گے اور یہی فرمانے کے بعد دربار سے علاحدگی کا انہوں نے مصمم ارادہ فرما لیا۔

(۲) ملفوظات عزیزیہ ص: ۱۰۶۔

تھے، ایسا اتفاق کم ہوتا ہے)۔

ظاہر ہے کہ محض رسمی یا خاندانی پیرزادوں کے متعلق یہ بیان نہیں بلکہ شاہ صاحب کے خیال میں بھی جو واقعی ارشاد و ہدایت کے سزاوار تھے، ان کی محض دلّی میں اتنی تعداد تھی، یقیناً اس قسم کا اتفاق کم ہوا کرتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ با ایں ہمہ رندی و خراباتی محمد شاہ میں ایک دوسری لٹک بھی ضرور تھی، کہ بہر حال حکومت کی قدر دانیوں اور جوہر شناسیوں سے اس قسم کے اجتماعات کو بہت کچھ تعلق ہے۔

خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ساتھ تو اسی رنگیلے نے وہ رنگین سلوک کیا ہے کہ اگر مسلمان اس غریب کو محض اس کی اسی خدمت کی بنیاد پر بخش دیں تو وہ اس کا مستحق قرار پا سکتا ہے، اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ جن مقاصد اور خیالات کو لے کر حجاز تشریف لے گئے اور حرمین کے جن ''فیوض'' سے مالا مال ہو کر وہ پھر ہندوستان واپس ہوئے اور کچھ طے کر کے واپس ہوئے جیسا کہ ان کے اس وداعی بیان سے معلوم ہوتا ہے جو رخصت ہوتے ہوئے مدینہ منورہ میں اپنے استاد حدیث سے آپ نے ارشاد فرمایا تھا:

''ہر چہ خواندہ بودم فراموش کردم الاعلم دین (یعنی حدیث)''(۱)

(جو کچھ میں نے پڑھا تھا سب کچھ بھلا دیا، بجز علم دین یعنی حدیث کے)

اور اسی بنیاد پر جیسا کہ سب جانتے ہیں، حضرت شاہ صاحب ہی کی بدولت آج ہندوستان میں ''علم حدیث'' کا بحمد اللہ مینارہ اتنا بلند ہے کہ بلا مبالغہ اب اسلامی ممالک میں کوئی ملک اس حیثیت سے اس کی ہمسری نہیں کر سکتا، کسی معمولی آدمی کی نہیں بلکہ الازہر کے ہم وطن مشہور ناقد و بصیر عالم رشید رضا مرحوم مصری کی شہادت ہے، اور ان کو مجبوراً واقعات کی بناء پر یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ:

''ولولا عناية إخواننا علماء الهند بعلوم الحديث فى هذا العصر لقضى

(۱) ملفوظات عزیزیہ ص:۹۳۔[اس کا تذکرہ اس شعر میں بھی کیا جاتا ہے:

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم   الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم]

علیہا بالزوال" (۱)

(اگر ہمارے بھائی ہندوستان کے علماء کی توجہ اس زمانہ میں علوم حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو اس علم کے زوال اورفنا کا فیصلہ ہو چکا ہوتا)

اور ظاہر ہے کہ یہ ساری برتری براہ راست بلاشرکت غیرے حضرت ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی رہینِ منت ہے، آج ہندوستان میں جس طبقہ میں بھی جو کچھ حدیث کا چرچا پایا جاتا ہے ''ہمہ آوردۂ اوست''، شاہ عبدالعزیز صاحب اسی بنیاد پر کبھی کبھی فرماتے:

''علم حدیث پدر من از مدینہ آورد چاردہ ماہ درحرمین بودہ سند حاصل کردہ'' (۲)

(میرے والد ہی مدینہ منورہ سے علم حدیث لائے، چودہ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر آپ نے سند حاصل فرمائی تھی)۔

لیکن دنیا کو شاید یہ معلوم نہیں کہ شاہ صاحب نے مدینہ سے واپسی کے بعد جب درسِ حدیث کا افتتاح فرمایا تو اس وقت پرانی دلّی میں جہاں اب ان بزرگواروں کے مزارات ہیں، وہاں اپنے والد کے پُرانے مکان میں پڑھانے کی جو مختصر سی جگہ تھی، اسی سے کام شروع کردیا۔

محمد شاہ نے شاہ ولی اللہ کے درس حدیث کے لئے عالی شان مکان دیا!

لیکن چند ہی دنوں میں اطراف واکناف سے طلبہ کھنچ کھنچ کر جب پہنچنے لگے تو ظاہر ہے کہ شاہ عبدالرحیم کی درسگاہ، مسند الوقت کے دارالعلوم بننے کا کام کیسے انجام دے سکتی تھی، اور یہ سعادت محمد شاہ بدنام کے نام قدرت نے لکھی تھی کہ اس نے:

''مولانا کو بلاکر شہر میں ایک عالیشان مکان دے کر آپ کو اندرون شہر رکھا، قدیم جگہ غیر آباد ہوگئی'' (۳)

دلّی کے پرانے کھنڈروں کا یہ سب سے بڑا ماہر دوسری جگہ اسی محمد شاہی عطیہ کا ذکر ان

(۱) مقدمہ مفتاح کنوز السنہ ص ۲۔

(۲) ملفوظات ص: ۹۳۔

(۳) دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۲۸۶ مؤلفہ مولوی بشیر صاحب۔

لفظوں میں کرتا ہے:

''یہ مدرسہ کسی زمانہ میں نہایت عالی شان اور خوبصورت تھا، اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا''۔

ولی اللّٰہی دارالعلوم کی عمارت غدر میں برباد ہوئی

دارالعلوم کی پختگی اور استحکام کا اندازہ تو اسی سے ہوسکتا ہے کہ غدر تک وہ اپنی اصلی حالت پر قائم تھا، اگر اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش نہ آتا کہ:

''غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے کڑی، تختے تک لوگ اٹھالے گئے''

تو آج بھی وہ شاید باقی رہتا، رہی اس کی وسعت وکشادگی، کاش! مکان موجود ہوتا تو صحیح رائے قائم ہوسکتی تھی، لیکن مولوی بشیرالدین صاحب کتاب مذکور کا یہ بیان کہ:

''اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں، مگر محلّہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے آج بھی پکارا جاتا ہے''۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑی جگہ تھی، اسی لئے متفرق لوگوں کے مکانات اس میں بن سکے، بلکہ جو محلّہ ''مدرسہ شاہ عبدالعزیز'' کے نام سے مشہور ہے اگر اس کی کل آبادی اسی مدرسہ کی زمین پر قائم ہوئی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ مکان بجائے خود ایک محلّہ کی گنجائش اپنے اندر رکھتا تھا، اور یوں بھی تو سمجھنا چاہئے کہ جس مکان میں شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ اور آخر میں شاہ اسحاقؒ تک کے مشہور عظیم ترین حلقہ کے طلبہ بھی اسی میں پڑھتے رہے، خیال کیا جاتا ہے کہ محمد شاہ کا دیا ہوا یہ مکان، مکان نہیں بلکہ غالباً کوئی بڑی ڈیوڑھی یا حویلی ہوگی، جس میں اتنی گنجائش پیدا ہوسکی۔

مغلی عہد کی حویلیوں اور ڈیوڑھیوں کا اندازہ موجودہ زمانے کے ہندوستانیوں کو نہیں ہوسکتا، تھوڑے بہت اس کے نشانات اب بھی حیدرآباد میں پائے جاتے ہیں کہ ایک ایک امیر کی بعض ڈیوڑھیاں اس وقت بھی بحمداللہ شاید ایک ایک مربع میل سے کم زمین میں نہ ہوں گی،

بہر حال مولوی بشیر الدین صاحب نے کتاب مذکور ہی میں لکھا ہے کہ:

''شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے چاروں صاحبزادوں نے وہی مشغلہ (درس وتدریس کا) جاری رکھا اور اس مدرسہ نے تعلیم دینیات میں وہ نام پایا کہ ہندوستان میں شہرہ ہوگیا، جب شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق (مہاجر مکی) نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمہ دلی''۔

جو لوگ حضرت شاہ عبدالعزیز اور بالخصوص شاہ اسحاق صاحب کے حلقۂ درس کی وسعت سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ ایک زمانہ ہندوستان پر وہ بھی گزرا ہے کہ جس طرح آج ہر صوبہ اور تقریباً ہر صوبہ کے ہر ضلع اور ہر ضلع کے ہر تعلقہ (سب ڈویزن) میں دیوبند کا کوئی نہ کوئی طالب علم ضرور پایا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح حضرت شاہ اسحاق صاحب کی درسگاہ کی بھی اپنے زمانہ میں یہی نوعیت تھی، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مدرسہ کی وسعت کیا ہوگی، اس کا پتہ تو نہ چلا کہ اس مدرسہ میں طلبہ کے قیام کا بھی بندوبست تھا یا نہیں، ظاہر تو یہی ہے کہ اس زمانہ میں جب مسلمانوں نے ہر طالب علم کے لئے قیام وطعام (لاجنگ بورڈنگ) کے مسئلہ کو فری (اور مفت) کر رکھا تھا تو اسی دستور کے مطابق طلبہ مساجد اور ان مقامات میں رہتے ہوں گے، جس کا نام اس زمانہ میں جاگیر تھا، تاہم شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں ایک جگہ اپنے اسی مدرسہ کی مسجد کا حال بیان فرماتے ہوئے جو یہ فقرہ پایا جاتا ہے کہ:

''دراں ہنگام بزرگانِ بسیار و اولیاء بسیار از یاران والد ماجد معتکف مسجد بودند'' (۱)

(اس زمانہ میں بہت سے بزرگ اور بہت سے اولیاء اللہ والد ماجد کے دوستوں میں سے مسجد میں معتکف تھے)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ کی خانقاہی حیثیت بھی تھی، رمضان کے مہینہ میں بھی جو عموماً عربی تعلیم کی عطلت کا زمانہ ہے ''بزرگان بسیار و اولیاء بسیار'' اس مدرسہ کی مسجد میں معتکف ہوتے تھے تو عام واردین وصادرین کا اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۱) ص:۱۰۹۔

چوں کہ محمد شاہ کی ایک اسلامی خدمت کا اظہار مقصود تھا اس لئے قصداً میں نے ذرا طول بیانی سے کام لیا، اور اس سے گونہ شاہ صاحب کے مدرسہ کی حالت پر بھی روشنی پڑ گئی، نیز اسی مدرسہ کے کچھ حالات آخر مضمون میں بھی انشاء اللہ آئیں گے، اسی سلسلہ میں میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جب خود محمد شاہ نے حضرت شاہ صاحب کو بلوا کر یہ مدرسہ حوالہ کیا تھا تو عقل کا تقاضا ہے کہ حکومت نے ان طلبہ کے لئے بھی ضروری وظائف منظور کئے ہوں گے جو اس مدرسہ میں دور دور سے آتے تھے، کیونکہ بادشاہ تو بادشاہ عام امراء کے خزانوں سے مدد و وظائف طلبہ میں کافی رقموں کے دینے کا عام دستور تھا۔

حافظ رحمت خاں والی بریلی اور نجیب الدولہ کی خدمتِ علم دین

حافظ الملک رحمت خاں والی بریلی کے متعلق ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ماہوار سینکڑوں طالب علموں کو ان کی سرکار سے امداد ملتی تھی، نجیب الدولہ کی علم دوستی کا حال تو خود شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ:

''نزد نجیب الدولہ نہ صد عالم بود ادنی پنج روپیہ واعلیٰ پانصد روپیہ'' (۱)

(نجیب الدولہ کے پاس نوسو عالم رہتے تھے جن میں ادنی درجہ کے علماء کو پانچ روپیہ اور واعلیٰ کو پانچ سو روپیہ ملتے تھے)۔

میرا اندازہ ہے کہ یہ پانچ اور پانچ سو روپیہ ماہوار نہیں بلکہ ''یومیہ'' تھا، حیدرآباد دکن میں بحمد اللہ ان کی نشانیاں اب تک باقی ہیں اور جس زمانہ میں مسلمانوں کی دولت کا یہ حال تھا کہ زیادہ دن پہلے نہیں بلکہ انگریزوں کے تسلط سے کچھ ہی پہلے دلّی کا حال بیان کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ:

''بہ خانہ قمر الدین خاں عورات غسل اخیر از گلاب می کردند و بہ خانہ دیگر نواب سہ صد روپیہ گل و پان برائے عورت می رفت''۔

(قمر الدین خاں کے گھر میں عورتیں آخری غسل گلاب سے کرتی تھیں اور ایک

(۱) ص:۸۱۔

دوسرے نواب کے ہاں تین سو روپیہ کا صرف پھول اور پان عورتوں میں جاتا تھا)۔

اور وہی ''سید برادران''، جن کا حال ابھی گزرا، ان میں ان کے بڑے بھائی حسین علی خاں جب اورنگ آباد دکن کے صوبہ دار تھے تو میر غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ:

''مردم اورنگ آباد بالاتفاق بیان می کنند در عہد امیر الامراء اکثر مردم در خانۂ خود طعام نمی پختند، طباخان سرکار امیر الأمراء حصہ خود می فروختند وقاب پلاؤ مکلّف بہ چند پل می دادند''۔

(اورنگ آباد کے لوگ بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ امیر الأمراء (حسین علی خاں) کے زمانہ میں اکثروں کے یہاں کھانا نہیں پکتا تھا، بلکہ امیر الامراء کی سرکار کے باورچی اپنے حصہ کا کھانا بیچ دیتے تھے، پلاؤ کا ایک مکلّف قاب چند پیسوں میں دیتے تھے)۔

خیر بات بہت طویل ہوئی جاتی ہے لیکن ''فاقصص القصص'' بھی چونکہ عبادت ہے اور اس سے بھی زیادہ ''لعلھم یتفکرون'' (پہلوں کے حالات سن کر شاید پچھلوں میں چونک پیدا ہو) اس لئے اس معترضہ جملہ کے بیان کرنے میں مضائقہ محسوس نہ ہوا، اب اصل مدعا کی طرف آتا ہوں، تو قصہ یہ ہو رہا تھا کہ حجاز سے سندِ حدیث لے کر جب شاہ صاحب دلّی واپس ہوئے اور طلبہ کے عام رجحان کو دیکھ محمد شاہ نے آپ کو یہ حویلی کہیے یا اس زمانے کی زبان میں دار العلوم (کالج) قرار دیجئے حوالہ کیا تو شاہ صاحب اپنے منصوبوں کو دل میں لے کر اس کے مطابق سرگرم عمل ہوئے ہی تھی کہ اچانک ہندوستان خصوصاً دلّی پر نادر شاہ درانی کی مشہور مصیبت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔

حجاز سے واپسی پر شاہ صاحب کے اصل کام کا آغاز اور دلّی پر خون

نادر کی یلغار اور اس کے اسباب واثرات

شاہ صاحب ۱۱۴۶ھ میں حجاز سے دلّی پہنچے تھے اور ۱۱۵۰ھ میں نادر گردی کی دلّی شکار ہوئی، مؤرخین کا اس حملہ کے اسباب میں اختلاف ہے، میاں بشیر مرحوم نے تو آصف جاہ مرحوم

کو نادر کا داعی قرار دیا ہے لیکن سچ یہ ہے اور واقعات اس کے مؤید ہیں کہ ایرانیوں کی قوت کو سادات کی تباہی سے جو کمزوری ہوئی تھی اسی کی تلافی کے لئے غریب تورانیوں پر نادر شاہ اکسا کر بلایا گیا تھا، (۱) اور بالفرض یہ سب نہ بھی ہو، جب بھی واقعہ یہ ضرور پیش آیا کہ ہمایوں نے ایرانی جراثیم کے لئے جو سوراخ پیدا کر دیا تھا، نادر گردی نے اس سوراخ کو وسیع سے وسیع تر کر دیا، یعنی اب تک ہندوستانی حکومت اپنے جذبہ منت شناسی کا اعتراف ایرانیوں کو مناصب وخدمات دے کر رہی تھی، لیکن نادر شاہی اور قزلباشی افواج کے عسکری اور سیاسی تفوق نے ہندوستانی دماغوں میں مرعوبیت کی اسی کیفیت کو پیدا کر دیا جس کا مشاہدہ آج مغربی حکومت کی مرعوبیت اور اس کے نتائج کی شکل میں ہم کر رہے ہیں۔

سیاسی شکست کا لازمہ دماغی غلامی

ہمارا ظاہر و باطن واندر باہر صرف محکومیت اور تعبد کی تجلی گاہ بنا ہوا ہے، مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ ہمارا بال بال یورپ کی غلامی کے سحر سے مسحور ہے، سروں کے بال اور مونچھ ڈاڑھی کی تراش وخراش میں بھی ہماری آنکھیں اپنے مغربی آقاؤں کے چہروں کو تاکتی رہتی ہیں، اب ہم خود کچھ نہیں دیکھتے بلکہ جو یورپ دکھاتا ہے وہی دیکھتے ہیں، جو وہ سمجھاتا ہے وہی سمجھتے ہیں، جو وہ کھلاتا ہے وہی کھاتے ہیں جو کچھ وہ پلاتا ہے وہی پیتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ ہم میں کتنے ہیں جو استنجا اور قضاء حاجات کی شکلوں میں بھی آج یورپ کی راہنمائی کا اپنے کو دست نگر بنائے ہوئے ہیں، یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ وہ تماشا ہے جو حکومت کی سحر طرازیاں ہمیں اس وقت ملک کے ہر صوبہ اور ہر علاقہ بلکہ دور دست ریاستوں تک میں دکھلا رہی ہیں۔

(۱) عام تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ آصف شاہ بہادر، نادر سے دوسرے دن مقابلے کی تیاریاں کر رہے تھے، بادشاہ محمد شاہ کو آپ نے یہی مشورہ دیا تھا، لیکن برہان الملک یعنی شاہان اودھ کے مورث نے ان کے منشا کے خلاف تنہا لڑائی چھیڑ دی اور خود اپنے کو نادر کے ہاتھ گرفتار کرا کے نادر کو دلّی لے گیا اور کروڑ ہا کروڑ روپیہ تخت طاؤس کے ساتھ جو گیا سو گیا، لاکھوں انسانوں کا خون بھی بہا۔

نادری حملہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی مرعوبیت کا حال شاہ ولی اللہ کی زبانی

نادر سے ہندوستانیوں نے شکست کھائی تھی اور ایسی شکست کھائی تھی کہ جس کی نظیر کم ازکم ہندی مسلمانوں کی آنکھوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے جامع ملفوظات نے ایک موقع پر یہ نقل کیا ہے کہ شاہ صاحب نے ایک دن:

''تذکرہ قتل نادرشاہی وعزم جوہر شدن شرفاء کہنہ وجواب والد ماجد وقصہ امام علیہ السلام کرد''۔

(نادرشاہی قتل اور پرانی دلّی کے شریفوں کے اس ارادہ کا ذکر فرمایا کہ وہ ''جوہر'' کا قطعی طور پر ارادہ کر چکے تھے، پھر والد نے جو جواب ان کو دیا اور امام علیہ السلام کے قصہ کو بیان فرمایا)۔

اس ''جوہر'' کی رسم سے شاید عام لوگ واقف نہ ہوں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی ایک قدیم رسم تھی، جب دشمن کا غلبہ اور تسلط اس حد کو پہنچ جاتا تھا کہ نجات وخلاصی کی راہ مسدود ہو جاتی تھی تو پاسِ ناموس وعزت کے لئے آگ کا الاؤ جوڑ کر عورتیں، مرد، بچے سب اس میں کود جاتے تھے۔

شاہ صاحب کی اس شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ ''نادرگردی'' کی دہشت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ پرانی دلّی کے شرفاء آگ میں پھاندنے کی تیاریاں کر چکے تھے، لیکن جیسا کہ آگے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس موقعہ پر شاہ ولی اللہؒ نے جب مسلمانوں کو واقعہ کربلا اور حسین علیہ السلام کے مصائب یاد دلائے اور بتایا کہ وہاں بھی تو مال وجان کے ساتھ ساتھ اہل بیت کی عزت وناموس خطرہ کی آخری شکل میں گھر چکی تھی، لیکن حضرت امام نے ''جوہر'' کا فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ صبر ورضا کی راہ اختیار کی تو اس ارادہ سے لوگ باز آئے۔

بہرحال اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دلّی اور دلّی کے ساتھ ہندوستانیوں کی ایرانیوں سے مرعوبیت کا کیا حال ہوا ہوگا، یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ اس ''مرعوبیت'' نے ہندوستانیوں کے

اندر صرف ایرانی اعتقادات اور دینی مسلک کے میلان کے راستہ کو صاف کیا بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ''محکومیت''، ہر قسم کے انفعالات وتاثرات کو اپنے ساتھ لاتی ہے، ہمایوں کے بعد ہندوستانی مسلمان یوں بھی ایرانی شاعری، ایرانی مفکرین اور ایرانی ارباب علم ودانش سے بہت کچھ متاثر ہو چکے تھے، مغل دربار زیادہ تر ایرانی شعراء، حکماء اور فلاسفہ سے معمور تھا، جس کی تفصیل عام تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں پڑھی جا سکتی ہے، ورنہ مغل حکومت سے پہلے اگرچہ ''ولایت''، یعنی ''بیرون ہند'' سے ہر قسم کے لوگوں کا اس ملک میں تانتا بندھا ہوا تھا، اور ان میں اکثر تھوڑی کدوکاوش کے بعد اپنی اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر کسی نہ کسی عہدہ اور مرتبہ تک پہنچ ہی جاتے تھے، لیکن اس میں ان ''ولایتی ممالک'' میں سے کسی خاص ملک کی تخصیص نہ تھی، ترکستان، خراسان، ایران، عرب بلکہ روم وغیرہ تک کے لوگ آتے رہتے تھے اور اگر کچھ غلبہ حاصل تھا تو خراسانی اور تورانی ممالک کے اہل علم وفضل کو تھا اور چونکہ ان علاقوں میں زیادہ تر تصوف، فقہ واصول فقہ کا چرچا تھا، اسی لئے مغل عہد سے پہلے ہندوستان میں ان ہی علوم کا زیادہ چرچا پھیلا ہوا تھا، فلسفہ، منطق کی طرف لوگوں کا کم میلان تھا، لیکن ہمایوں کے بعد ہم بتدریج ہندوستان کے علمی مذاق میں ایک جدید تغیر محسوس کرتے ہیں یعنی آہستہ آہستہ فلسفہ اور منطق کو اہمیت حاصل ہوتی جاتی ہے، اور اس کے بعد ان دونوں ''علموں'' کے ساتھ ہمارا ملک جس شدت سے چمٹ گیا اس کا حال کس کو معلوم نہیں۔

ہندوستان کے علماء پر منطق وفلسفہ کے تسلط کی تاریخ

اس تغیر کی تاریخ یہ ہے کہ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں ایران میں خاص دل ودماغ کے کچھ لوگ پیدا ہو گئے تھے جن میں عجیب وغریب شخصیت میر باقر داماد نامی ایک ملا کی تھی۔

میر باقر داماد کا کچھ تعارف

یہ استرآباد کا رہنے والا تھا، مشہد میں تعلیم حاصل کی تھی اور اصفہان میں سکونت اختیار

کرلی تھی، شاہ عباس صفوی اس کا بڑا قدر دان تھا اور اسی قدر دانیوں نے اس کو شہرت وعزت کے اس مقام پر پہنچایا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں ہے جو ہمارے مدرسوں میں مشہور ہے کہ ''باقر داماد'' بادشاہ کا داماد تھا، اسی لئے داماد کے لقب سے مشہور ہوا، بلکہ داماد دراصل ان کے والد کا لقب تھا جن کا نام سید محمد تھا، سید محمد کی شادی اس زمانے کے ایک بڑے فقیہ شیخ علی بن عبدالعالی کی لڑکی سے ہوگئی تھی، اسی لئے لوگ سید محمد کو سید محمد داماد کہنے لگے، سید محمد کے بعد یہی لقب دامادی کا ان کے بیٹے میر باقر کو وراثت میں ملا، بہرحال باقر داماد جیسا کہ میں نے عرض کیا ایک خاص قسم کا آدمی تھا، جہاں تک میرا خیال ہے اس کو فلسفہ سے زیادہ ادب میں مہارت حاصل تھی، وہ فطرتاً شاعر تھا اور اگرچہ عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں، لیکن فارسی زبان میں وہ شاعری بھی کرتا تھا، اشراق تخلص تھا، مگر بیچارے کے لئے دشواری یہ ہوگئی تھی کہ پیدا ہوگئے تھے ملاّ گھرانے میں جس کے لئے شعروشاعری کے مشاغل کسی طرح مناسب نہ تھے، آخر ان کی فطرت نے ایک دوسری راہ بتائی، دینیات اور مذہبیات سے تو اس شخص کو کبھی دلچسپی نہ ہوئی، اگرچہ برائے نام بعض مختصر رسالے دینی موضوع پر بھی لکھے ہیں، لیکن اپنے دماغ کو فلسفۂ الٰہیات کی طرف پھیر دیا اور اس زمانہ کی ایرانی ادبیات میں الٰہیات کا جو سرمایہ تھا، خصوصاً متاخرین کے لفظی جھگڑوں نے بات کا بتنگڑ بنا کر اوہام کی جو بھول بھلیاں تیار کردی تھیں، میر باقر نے ان ہی چیزوں کو لے کر ایک خاص قسم کے ادیبانہ رنگ میں جس میں لغت کے نامانوس غریب الفاظ، عربی زبان کے ایسے مصادر جن کا عام بول چال میں کم استعمال ہوتا ہے مثلاً باب اخشیشان، اجلواذ، احر نجام، اقشعرار وغیرہ کے وزن پر زبردستی الفاظ کو تراش تراش کر لانا، نون تاکید اور باب تفضیل کی تشدید سے کلام میں زور پیدا کرنا، ایسی چیزوں کی جمع بنانا جن کی طرف بآسانی ذہن منتقل نہ ہوسکے، مثلاً عام طور سے منطقی اور کلامی طبقوں میں ''لا نسلم'' (ہم یہ نہیں مانتے) یالم لا یکون کذا (آخر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا) وغیرہ الفاظ کا استعمال بکثرت کیا جاتا ہے، خصوصاً ارباب جدل ومناظرہ کی زبانوں پر تو گویا یہ الفاظ بطور سخن تکیہ کے چڑھے رہتے ہیں، میر باقر

نے ان لوگوں کا نام ہی ''لانسلمیون'' اور لم لا یکونیون'' رکھ دیا، ظاہر ہے کہ اس جمع کو دیکھ کر بآسانی کس کا دماغ ان کے مفردات کی منتقل ہوسکتا ہے؟ بہرحال اس زمانہ کے شروح وحواشی خصوصاً دوانی اور صدر معاصر نے شرح تجرید کے حاشیوں میں قدیمہ، جدیدہ، اجد وغیرہ کے ناموں سے بے معنی مباحث کا جو طوفان پیدا کیا تھا اور اس پر مرزا جان اخوند یوسف، آقا حسین خونساری وغیرہ نے جو ''کوہ کندن کاہ برآوردن'' کی خدمتیں انجام دی تھیں، میر باقر نے ان ہی سب کو سامنے رکھ کر اپنے جدید انشاء اور ادب کا ان کو تختۂ مشق بنایا، گویا ایک قسم کی منطقی اور الٰہی ادب کی اس نے ایجاد کی، اسی کے ساتھ میر داماد نے اپنی کتابیں جن میں تقریباً ایک ہی قسم کے مضامین ہیں ان کے نام بھی عجیب وغریب قسم کے رکھے، جن کے سننے کے ساتھ ہی آدمی پر ایک رعب سا چھا جاتا ہے مثلاً ''الافق المبین''، ''الصراط المستقیم''، ''ایماضات''، ''تقدیسات''، ''قلبیات'' ازیں قبیل اور بھی چند کتابیں ہیں۔

غرض میرے نزدیک تو میر باقر پر بجائے فلسفہ اور منطق کے فی الحقیقت ادب وشعر ہی غالب تھا، اس کا اندازہ علاوہ ان تدبیروں کے اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نظامی گنجوی کی پانچ نظم کی کتابوں کا شمار فارسی شاعری کے جواہر پاروں میں تھا اور ''جواہر خمسۂ نظامی'' کے نام سے یہ مجموعہ عام طور پر مشہور ہے، میر باقر نے بھی اپنی پانچ کتابوں کو ''جواہر خمسہ'' کے نام سے ملقب کیا۔

میر باقر کے ایک شاگرد صدر شیرازی

میر باقر کے بعد ان کے شاگردوں میں ایک اور صاحب قلم (بلکہ ''صاحب قلم'' سے زیادہ ''صاحب سیاہی وروشنائی'' کا خطاب ان کو دیا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا) پیدا ہوئے یعنی ملا صدر الدین شیرازی جن کی کتاب ''شرح ہدایت الحکمۃ'' صدرا کے نام سے مدرسوں میں آج بھی مشہور ہے، یہ شخص بلا کا لکھنے والا تھا، ہزار ہا صفحات کی بیسیوں کتابیں مثلاً تعلیقات، شفاء، یا حواشی ''شرح حکمت الاشراق'' ''شواہد ربوبیت'' وغیرہ کے علاوہ ایک بسیط

کتاب اسی لفظی فلسفہ کے متعلق چار ضخیم جلدوں میں اس شخص نے تیار کی، جس کا نام ''اسفار اربعہ'' (۱) ہے، اس کے زمانہ تک لایعنی مباحث کا جو ذخیرہ جمع ہو چکا تھا سب کو تلاش کر کے اس نے اپنی کتاب میں جمع کیا اور اس کے ساتھ بعض مسائل میں اپنے خاص نظریات بھی قائم کئے، استاذ سے ان کا رنگ اس اعتبار سے جدا ہے کہ ثقیل وغریب لفظوں کے طمطراق سے ان کی کتابیں خالی ہیں، صرف اسفار کے عنوانوں میں میر باقر کی کچھ جھلک پائی جاتی ہے مثلاً ''لمعه اشراقيه'' ''حكمة عرشيه'' وغیرہ۔

بہر حال جس وقت ہندوستان میں عہد شاہجہانی وعالمگیری گزر رہا تھا، ایران کی زمین ان لفظی فلسفوں کی علمی جلالت شان کے غلغلوں سے گونج رہی تھی، اور ہندوستان وہی ہندوستان جس نے ہمایوں کی راہ سے اپنا رشتہ ایران سے جوڑ لیا تھا، اس میں ان غلغلوں کی صدائے بازگشت آ آ کر ٹکراتی تھی، اب تک کسی میدان میں اسلامی ہند نے چونکہ شکست کی رسوائی نہیں اٹھائی تھی اس لئے ایران کی ان آوازوں سے اتنا تو متاثر نہیں ہوا جتنی کوئی محکوم قوم فاتح قوم سے متاثر ہوسکتی ہے، لیکن میل ملاپ اور احسان مندی کے جذبات نے ہندوستان کو اتنا منفعل ضرور کر دیا کہ جو ملک اب تک صرف تصوف وفقہ کی جولان گاہ تھا، اب ان علوم سے ہٹ کر آہستہ آہستہ اس کا میلان ایرانیوں کے ان لفظی گورکھ دھندوں کی طرف فلسفہ اور منطق یا عقلیات کے پرشوکت ناموں سے بڑھنے لگا، زیادہ دن نہیں گزرنے پائے کہ بالآخر پرانے ذوق پر یہ جدید شوق غالب آگیا اور ایسا غالب آیا کہ عالمگیر کے عہد کے ایک مشہور عالم جو عالمگیری فوج میں ایک بڑی مذہبی خدمت یعنی فریضۂ احتساب پر ملازم تھے، جس کا براہ راست

(۱) حکومت آصفیہ کے دار الترجمہ نے فلسفہ کی اس ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ کرا دیا جس کی پہلی جلد کا ترجمہ خاکسار نے اور باقی جلدوں میں سے ایک حصہ کا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اور دوسرے حصہ کا مولوی میرک شاہ کشمیری نے کیا ہے، دنیا کی کسی زبان میں فلسفہ کی اتنی بڑی کتاب شاید ہی موجود ہوگی، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فلسفہ چونکہ نام ہی وسوسہ کا ہے مشرقی ہو یا مغربی، لیکن اگر علم اس کا نام ہے تو صدر شیرازی کا یہ ایسا کام ہے، جس میں ڈھونڈنے والے فلسفہ کے ہر مکتب خیال والوں کے خیالات تلاش کر کے نکال سکتے ہیں۔

تعلق فقہ اور فقہی مسائل کی تفصیلات ہی سے ہے، فقہ اور اس کے جزئیات سے جو پورے طور پر واقف نہ ہو، صحیح طور پر اس فریضہ کا انجام پانا اس سے مشکل ہے، میری مراد مرزا زاہد سے ہے جو اس وقت تک عربی مدارس میں اپنے ''زواہد ثلاثہ'' کی بدولت خاصی شہرت رکھتے ہیں اور منطق وفلسفہ میں حضرت شاہ ولی اللہ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم کے استاد ہیں۔

میر زاہد ہروی اور علم فقہ میں ان کی کمزوری

ان ہی میر زاہد صاحب کے متعلق جو آگرہ میں صدر محتسب عسا کر عالمگیر تھے، مولانا شاہ عبدالعزیز روای ہیں کہ:

> ''امیرے شرح وقایہ می خواند'' (ایک امیر مرزا زاہد سے شرح وقایہ پڑھتا تھا) لیکن فقہ میں میر زاہد کو اپنے اوپر چونکہ اعتماد نہ تھا، اس لئے:
>
> ''بے حضور جد بزرگوار سبق نمی فرمود'' (جب تک دادا بزرگوار (حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب) نہ آجاتے، میر صاحب سبق نہیں پڑھاتے۔)

معقولات میں مرزا صاحب کا غلو

شرح وقایہ پڑھانے میں تو محتسب صاحب کا یہ حال تھا، لیکن اسی کے مقابلہ میں معقولات سے آپ کے تعلق کی جو نوعیت تھی، شاہ عبدالعزیز ہی نے ان کا یہ دلچسپ فقرہ نقل کیا ہے کہ مرزا جان اور اخوند یوسف جن کے دوانی کے حواشی پر حواشی ہیں، ان کے متعلق مرزا زاہد کہا کرتے تھے: (۱)

(۱) مگر باوجود اتنی معقولیت کے اس زمانہ کے معقول کا یہ حال تھا کہ شاہ عبدالرحیم صاحب کی میر زاہد نے رمضان میں ایک دن دعوت کی، اس عرصہ میں ایک کبابی نے کبابوں سے بھرا ہوا خوانچہ مرزا کے پاس لا کر رکھا کہ ''برائے نیاز آوردہ ام'' (برائے نیاز لایا ہوں) مرزا نے کہا: ''اے عزیز پیر تو نہ ام، استاد تو نہ ام، نیاز چہ معنی؟'' (نہ تمہارا استاذ ہوں نہ تمہارا پیر ہوں، پھر نیاز کا کیا مطلب؟!) آخر رد وکد کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی دکان کو مرزا کے سپاہی غلط جگہ پر ہونے کی وجہ سے اٹھانا چاہتے ہیں، اسی کی رشوت میں لایا ہے، آخر دام دے کر لینا طے ہوا، لیکن ڈھائی روپے کے کباب آٹھ آنے میں دے رہا تھا، مرزا کو معلوم ہوا سخت برہم ہوئے اور پورے دام ادا کئے۔ (انفاس ص ۳۳)

''تقریر مرزا جان جانِ من است، تقریر اخوند جان جانانِ من است'' (۱)

(مرزا جان کی تقریر تو میری جان ہے اور اخوند کی تقریر میری جان جاناں ہے)۔

اور یہ اس زمانہ میں کچھ بیچارے مرزا زاہد ہی کا حال نہ تھا، تقریباً علماء کے اکثر افراد پر یہی کیفیت طاری تھی، تاہم ''حملۂ نادری'' سے پہلے ہندوستان کے علماء ایرانی فضلاء میں فانی نہیں ہوئے تھے، ان کے اعترافِ فضل ومہارت کے ساتھ اپنی کمتری کا احساس ان میں نمایاں نہ ہوا تھا، اسی لئے بجائے تقلید جامد کے ان کے انفعالی تاثرات بظاہر مقابلہ کے رنگ میں ظاہر ہوتے تھے، میر باقر نے اپنی کتاب ''الافق المبین'' کا نام قرآن سے انتخاب کیا تھا، ٹھیک اسی کے توڑ پر شاہجہاں کے عہد میں جونپور کے مشہور فلسفی ادیب ملا محمود جونپوری نے بالکل اسی طمطراقی طرز پر تو نہیں جو ملا باقر کی خصوصیت ہے، لیکن اچھے خاصے بلند انشائی رنگ میں فلسفہ کی ایک کتاب تصنیف کی، اور انہوں نے قرآن مجید ہی سے اس کا نام ''الشمس البازغۃ'' اقتباس کیا، اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں ملا محبّ اللہ بہاری نے اپنی مشہور دونوں درسی کتابوں یعنی مسلم وسلم کے نام میں بھی ایک ادیبانہ پہلو ملحوظ رکھا اور دونوں کتابوں میں ڈھلے ڈھلائے ترشے ترشائے فقرے جہاں تک میرا خیال ہے میر باقر ہی سے شعوری یا شعوری اثر پذیری کی بنیاد پر داخل کئے گئے ہیں، مگر اب تک دونوں ممالک کے فضلاء گویا ایک حد تک ''رقیبانہ'' تعلقات رکھتے تھے، مگر سچ ہے کہ غیر محسوس طور پر ایران کے تفوق کو وہ اپنے طرز عمل سے گونہ تسلیم کرتے جاتے تھے۔

نادری حملہ کے بعد یہاں کے علماء ایرانی علوم ونظریات سے بری طرح متاثر ہوئے

لیکن ''نادری حملہ'' نے تو اس نامحسوس کو محسوس اور غیر شعوری انفعال کو شعوری بنا دیا، بلکہ جیسا کہ تمام مفتوح وہزیمت خوردہ اقوام کا قاعدہ ہے، انہوں نے اپنے اس انفعال وتاثر کو سرمایہ صد افتخار اور موجب ہزار نازش وامتیاز قرار دے دیا، جس کا اندازہ ہندی علماء کی ان

(۱) ص ۸۳

کتابوں سے ہوسکتا ہے جو ''حملہ نادری'' کے بعد ہندوستان میں لکھی گئیں، میر باقر کا نام اسی کے بعد ''خیر اللاحقہ بالمہرہ'' (۱) ''سید الاذکیا'' اور خدا جانے کیا کیا ہو گیا۔ اس بحث میں ذرا زیادہ بسط سے میں نے قصداً کام لیا ہے، کیونکہ آئندہ جیسا کہ معلوم ہوگا حضرت شاہ ولی اللہؒ کے قلم نے جہاں اور کام انجام دیئے ہیں، ایران کی اس ذہنی مرعوبیت کے ردعمل میں بھی اس نے کامیاب کوشش کی ہے، حضرت کی اس خدمت کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک اس عہد کی اس ذہنی وعلمی کیفیت کا کم از کم اجمالاً حال لوگوں کو معلوم نہ ہو جس کا میں نے اس وقت ذکر کیا، اب میں پھر اصل مبحث کی طرف توجہ کرتا ہوں کہ نادر ہندستان سے لے جانے کو تو جو کچھ بھی لے گیا لیکن اسی کے ساتھ ایک مصیبت بھی چھوڑ گیا، یعنی ایران کے دینی رجحانات اور ذہنی اور دماغی میلانات میں قدرتاً مفتوح ہندوستانیوں میں جو پہلے سے بھی بہت کچھ متاثر تھے، اور بھی شدت پیدا ہوگئی۔

نادر شاہ کا بے پناہ رعب

بلکہ نادر شاہ اگر یوں ہی مار پیٹ اور تاخت وتاراج کر کے نکل بھاگتا تو شدید عداوت وبغض کی وجہ سے کوئی دوسری کیفیت پیدا ہوتی، لیکن ہوا یہ کہ ساری خواری وذلت اور بربادی وتباہی کے باوجود سہمے ہوئے بادشاہ محمد شاہ نے نادر شاہ کی باضابطہ ہفتوں مہمانی کی، دربار کے بڑے بڑے امراء نادر شاہ کی خدمت پر مقرر ہوئے، عمدۃ الملک جیسا امیر وکبیر بیچارہ نادر کو قہوہ پلانے پر مامور ہوا تھا اور یہی حال دوسرے امیروں کا ہوا تھا۔

بہر حال: ''محمد شاہ ضیافت نادر شاہ بکمال تکلف قرار داد'' (۲)۔

نادر شاہ کے لڑکے کے نکاح میں شاہجہاں کی پوتی

اور بات اسی پر ختم نہ ہوئی بلکہ اسی کے ساتھ نادر شاہ نے:

(۱) یعنی پچھلے لوگوں میں ماہرین فن کی صف میں سب سے بہتر آدمی جو شریک ہوا وہ میر باقر داماد ہے۔)

(۲) [محمد شاہ نے نادر شاہ کی بہت پر تکلف ضیافت کی]

"دختر از احفاد شاہجہاں پادشاہ در حبالہ نکاح پسر کوچک خود نصر اللہ مرزا کہ ہمراہ داشت درآورد"(۱)

(شاہجہاں بادشاہ کی پوتیوں میں سے ایک لڑکی اپنے چھوٹے لڑکے نصر اللہ مرزا کے نکاح میں دے دی جو اس کے ساتھ ایران سے ہندوستان آیا تھا)۔

ہندوستانی امراء بلکہ خود شاہی خاندان والوں سے صدیوں کے ناز ونعم نے حمیت وغیرت کی حرارت یوں بھی بجھادی تھی، اب یہ عزیز داری کا رشتہ جوشِ انتقام کو فرو کرنے کے لئے ان کے بزدل قلوب کے لئے بہانہ مل گیا اور یوں بزدلی کے رذیلہ پر جذبہ رواداری اور وسعت چشمی کی چادر اڑھادی گئی، نادر نے جو کچھ کیا دھرا تھا سب بھلا دیا گیا، "آقا خوش آمدید" کے ساتھ ہر ایرانی کا ہندوستان میں خیر مقدم ہونے لگا، ان کی کتابیں شوق سے پڑھی جانے لگیں، ان کے علماء کی باتیں دلچسپی سے لوگ سننے لگے اور اس کے جو نتائج ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

نادر شاہی کے طفیل ہندوستان میں روہیلہ پٹھانوں کا سیلاب

لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ نادر کابل وقندھار کے راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا، راستہ میں ان علاقوں کے باشندوں نے مزاحمت کی، لیکن باوجود اپنی مشہور جلادت وشجاعت کے قزلباشوں کی ضرب کی تاب نہ لاسکے، ہر جگہ ان کے پاؤں اکھڑتے چلے گئے اور نہ صرف کابل وقندھار بلکہ سرحد کے آفریدی ونہمندی ومسعودی اور دوسرے جاں باز، جان فروش قبائل بھی نادر کے ریلے کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکے، ایسا عجیب وغریب واقعہ کیسے پیش آیا، تاریخ کا یہ اہم سوال ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے تاہم بعض اشارات تورانی وایرانی تنازعات کے قصہ میں مل سکتے ہیں، غور کرنے والے شاید ان کی مدد سے صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

بہر کیف یہ واقعہ تھا کہ ہر جگہ کابل وقندھار وسرحد کے پٹھانوں کو بھی نادر کے مقابلہ

(۱) سیر ص ۴۸۵

میں زک اٹھانی پڑی اور ہر جگہ "خونی نادر" نے ان پر عافیت تنگ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہزیمت خوردہ، پراگندہ قوم اپنے علاقوں سے بھاگ بھاگ کر ہندوستان میں پناہ ڈھونڈنے لگی اور:

"جمعے ازاں قوم پراگندہ بہ ہندوستان درآمدہ، در ہر جا سکنی واکثر در سرکارات ملازم شدہ داخل سپاہ گشتند"(۱)

(اس پراگندہ پریشان قوم کا ایک حصہ ہندوستان پہنچا اور ہر جگہ انہوں نے سکونت اختیار کی اور ملک کی مختلف سرکاروں (علاقوں) میں انہوں نے ملازمت اختیار کرلی)۔

اور مختلف سرداروں کی ماتحتی میں جتھے بنا بنا کر انہوں نے چند دنوں میں اپنے مختلف مراکز قائم کر لئے، خصوصاً:

"محمد خاں معروف بہ روہیلہ مورد التفات اعتماد الدولہ گردیدہ بعضے جاگیرات وخالصہ رابطور ملکیت قابض ومتصرف بہ توجہات وزیر گشت، چوں صاحب جرات وشخص صاحب ارادہ وشعور بود ہمیں افغانان وروہیلہ ہائے گریختہ قندھار واطرافش را با خود رفتن ساختہ بنام روہیلہ اشتہار، واز اجتماع آنہا اقتدار یافت، ملک بسیارے را مثل آنولہ وسنبھل ومراد آباد وبدایوں وبریلی وغیرہ متصرف گشت"(۲)

(محمد خاں جو روہیلہ کے نام سے مشہور ہے وہ اعتماد الدولہ (امین خاں) کی نظر التفات سے سرفراز ہوا اسی وزیر کی توجہ سے بعض جاگیرداروں وخالصہ وغیرہ پر بطور مالک ہونے کے قابض ہو گیا، چونکہ محمد خاں جرأت وہمت والا آدمی تھا اور ارادہ وعزم اور تمیز وشعور کا بہرہ رکھتا تھا، اس نے قندھار اور اس کے گردونواح کے بھاگے ہوئے روہیلوں کو اپنے ساتھ کرلیا، روہیلہ کے نام سے اس کی شہرت ہوئی اور ان لوگوں کے جمع ہو جانے سے اس شخص کو اچھی خاصی قوت حاصل ہوگئی، ملک کا ایک بڑا علاقہ مثلاً آنولہ، سنبھل، مراد آباد، بدایوں، بریلی وغیرہ کو اپنے تصرف میں لے آیا)۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے پہلے اس علاقے کے باشندے ہندوستان میں نہیں پائے جاتے تھے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنے ملک کی بے سروسامانی کے ساتھ روہیلوں کی ایک

(۱) سیر ص ۴۸۰

(۲) ص ۴۸۰

بڑی تعداد دیا یک جو ہندوستان کے بالائی علاقوں اور خصوصاً دہلی میں پھیل گئی تو اس کا سبب یہی نادر اور اس کی عجیب وغریب لشکر کشی تھی، اب ہوا یہ کہ ایک طرف نادر کی وجہ سے ایرانی اور ایرانی مذہب وذہنیت رکھنے والوں کو ملک میں تفوق حاصل ہوا اور ان ہی کے ساتھ ایک جدید عنصر بالکل ان کے مدمقابل یعنی روہیلوں کا بھی اقتدار بتدریج جڑ پکڑنے لگا، تیسرا عنصر تورانیوں کا تو پہلے ہی سے موجود تھا کہ حکومت ہی تورانیوں کی قائم ہوئی تھی، جیسا کہ میں نے عرض کیا آخر زمانہ میں اورنگ زیب کے بعد تورانی اور ایرانی سوال میں کافی شدت پیدا ہوتی چلی جاتی تھی، جس کی بظاہر تعبیر تورانی وایرانی سے کی جاتی تھی، لیکن دراصل یہ مقابلہ سنیوں اور شیعوں میں تھا، سنیوں کا نام تورانی رکھا گیا تھا اور شیعوں کو کبھی ایرانی اور کبھی ''سادات'' کے نام سے خصوصاً ''سیر المتاخرین'' کے مصنف جو خود شیعی ہیں یاد کرتے ہیں، ایک موقعہ پر طباطبائی نے ان تورانی بے چاروں کے متعلق جن میں سب سے زیادہ بدنام آصف جاہ بہادر کا خاندان تھا ان کے خاص چچازاد بھائی اعتماد الدولہ کے متعلق طباطبائی لکھتے ہیں:

''اعتماد الدولہ وتورانیان کہ عداوت سادات راسرمایہ سعادت خود دانستہ''(۱)

(اعتماد الدولہ وغیرہ تورانی جو سادات کی دشمنی کو اپنی سعادت کی پونجی خیال کرتے ہیں)۔

الغرض یہ دو متقابل عناصر تو ہندوستان میں پہلے ہی سے موجود تھے اور گو طباطبائی دونوں فرقوں کی باہمی عداوتوں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے تورانی جن لوگوں کا نام رکھا گیا تھا یہ عموماً ترکستان یعنی بخارا، سمرقند، تاشقند، خیوہ، کاشغر وغیرہ کے لوگ تھے اور جن لوگوں کو ان ممالک کے حالات کا خصوصا جس زمانہ سے ہم بحث کر رہے ہیں علم ہے وہ جانتے ہیں کہ اس وقت اس ملک کے مسلمان بہ نسبت فقہاء اور علماء کے زیادہ تر حضرات صوفیہ کرام کے زیر اثر تھے اور تصوف کی لوگ جو کچھ بھی خرابیاں بیان کریں، لیکن اتنا تو ہر شخص کو ماننا پڑے گا کہ صوفیانہ مسلک رکھنے والے نفوس بجائے تنگ چشم ہونے کے وسیع

(۱) ۴۷۸۔

المشرب ضرور ہوتے ہیں، حتی کہ اسی بنیاد پر ''الصوفی لا مذهب له'' کا مقولہ مشہور ومعروف ہوگیا ہے، بلکہ بعضوں کا تو خیال ہے کہ صوفیوں اور شیعوں میں بجائے تخالف اور تصادم کے توافق کے جہات زیادہ ہیں اور اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ تصوف کا بہت کچھ میلان تشیع کی طرف رہا ہے، جس کی ایک مثال شاید خود حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات گرامی بھی ہوسکتی ہے، کہ مسئلہ خلافت کے متعلق کہاں تو آپ کی رائے یہ ہے کہ عام اشاعرہ جو:

''تقریر می کنند کہ خلافت ایشاں بہ نص نیست مطلقاً یا بہ نص جلی نیست بلکہ امر اجتہادی است کہ اہل عصر بنا بر اجتہاد برآں اتفاق نمودند''۔

(یہ کہتے ہیں کہ (حضرات خلفاء) کی خلافت مطلقاً کسی نص سے ثابت ہی نہیں ہے یا نص صریح واضح سے ثابت نہیں ہے، بلکہ ایک اجتہادی بات ہے، اس زمانہ کے لوگ اپنے اجتہاد اور غور وفکر سے ان لوگوں کی خلافت پر متفق ہوگئے)۔

تو اشاعرہ کا یہ خیال شاہ صاحب کے نزدیک درست نہیں ہے بلکہ:

''آنحضرت ﷺ ازاں علم شریف نصاً اشارۃً خبر دادند تا آنکہ تکلیف عباد باستخلاف ایں بزرگواراں عملاً واعتقاداً متحقق شد، وپردہ از روئے کار برانداختہ گشت''۔

(آنحضرت ﷺ نے اس شریف علم کی نص اور اشارہ ہر طریقہ سے خبر دی ہے حتی کہ اسی بنیاد پر اللہ کے بندے اس بات کے مکلّف ہوئے کہ ان بزرگوں کو خلیفہ مقرر کریں اور عملاً واعتقاداً یہی بات واجب ہوئی)۔

یہ اس ''ازالۃ الخفاء'' کے مصنف علام کی رائے ہے جس کو پڑھ کر وہی نہیں جو خاندان ولی اللہی کے حلقہ بگوشوں میں ہیں بلکہ وہ بھی جن کے متعلق مشہور کیا گیا کہ بجائے عقیدت ونیاز کے ہمیشہ نسلاً بعد نسل اپنے کو وہ علم کے اس سلسلہ اور خانوادہ کے حریف مقابلہ سمجھا کئے، میری مراد مولانا فضل حق خیر آبادی سے ہے، ان کے بڑے مداح شاگرد مولانا محسن بہاریؒ خود اپنی براہ راست سنی ہوئی، شہادت ادا کرتے ہیں کہ جب الور میں مولانا فضل حق سے وہ پڑھا کرتے تھے تو اسی زمانہ میں:

"وقع في يده كتاب "إزالة الخفا" فكان أولع بها، ويكثر النظر فيها أوان

فراغه من دروسه وسائر ما يشغله من شأنه، فلما وقف على شئ كثير منها قال بمحضر من الناس –وكنت فيهم–: الذى صنف هذا الكتاب لبحر زخار لا يرى له ساحل“۔ (۱)

(مولانا فضل حق کے ہاتھ ازالۃ الخفا کا ایک نسخہ کہیں سے لگا، مولانا اس کے مطالعہ کے حریص تھے اور جب درس وتدریس یا دوسرے مشاغل سے فرصت ملتی تو بکثرت اسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہتے، جب مولانا اس کتاب کے بڑے حصہ کو پڑھ کر فارغ ہوئے، تب آپ نے سب کے سامنے جن میں میں بھی شریک تھا یہ فرمایا کہ جس شخص نے یہ کتاب تصنیف کی ہے وہ تو ایک دریائے بے کراں ہے جس کے ساحل کا پتہ نہیں چلتا)۔

مگر اسی ''ازالۃ الخفاء'' کے مصنف نے فیوض الحرمین میں جو یہ لکھا کہ:

”إن طبيعتى وفكرتى إذا تركنا وأنفسنا فضلتا علياً كرم الله وجهه وأحبتاه أشد محبة“۔

(میری طبیعت اور میری فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت سے شدید محبت ہے)۔(۲)

تو کیا آپ کی طبیعت وفکر کا یہ رنگ اسی تصوف کا نتیجہ نہیں ہے جس کے آپ ''کابراً عن کابر'' وارث تھے وہ تو غنیمت ہوا کہ دربار رسالت سے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:

”الوصاة بتفضيل الشيخين“

''(حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو فضیلت دینے کی وصیت ہوئی''۔

(۱) الیانع ص ۹۳ مطبوعہ علی رجال الطحاوی۔

(۲) شاہ صاحب کی طبیعت کا یہ میلان اسی قسم کا تھا، جیسا کہ عموماً لوگوں کو اپنے روحانی بزرگوں کے اعزہ واقارب خصوصاً ان کی اولاد کی طرف ہوتا ہے جو صرف ''طبیعت'' ہی کا اقتضاء ہوتا ہے اور امور دین میں طبیعت کے اس اقتضاء کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہاں اصل چیز کتاب وسنت کے دلائل ہیں، تو چونکہ دلائل کا فیصلہ تفضیل شیخین کے حق میں تھا، جیسا کہ خود شاہ صاحب نے ہی ''ازالۃ الخفا'' اور ''قرۃ العینین'' میں پورے شرح وبسط کے ساتھ اس کو ثابت فرمایا ہے، اس لئے شاہ صاحب نے اپنی ذاتی چاہت اور طبعی میلان کے خلاف اسی کو اختیار فرمایا، پھر روحانی مکاشفہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بھی آپ کو تفضیل ہی کی وصیت ہوئی۔(مولانا منظور نعمانی مدیر الفرقان)

اس لئے فرماتے ہیں کہ یہ تفضیل شیخین کا اعتقاد:

”شئ طلب منى التعبد به خلاف المشتهى وهيهات هذه المنا قضات منى لولا أن شدة الجامعية هى التى أوقعتنى فى ذلك“. (۱)

(ایک ایسی چیز ہے کہ میری ذاتی خواہش کے خلاف مجھے اس کے ماننے اور عبادت خدا سمجھ کر ماننے کا حکم دیا گیا ہے، افسوس مجھ میں یہ کس قسم کی متناقض اور متضاد باتیں ہیں لیکن مجھ میں شدید جامعیت کا جو رنگ پایا جاتا ہے اسی نے اس حال تک مجھے پہنچایا ہے)۔

خیر یہ تو بیچ کا ایک جملہ معترضہ تھا، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمایوں کے بعد مغل دربار میں تورانیوں اور ایرانیوں یا دوسرے لفظوں میں سنیوں اور شیعوں دونوں کی آمد ہو رہی تھی، دونوں طبقوں کے امراء حکومت کی مشین میں داخل ہو ہو کر اپنی اپنی فراخوار قابلیت کے لحاظ سے پرزے بنتے چلے جاتے تھے، اور گو ان دونوں میں رقابتیں ضرور رہتی تھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ محض سنی ہونے یا شیعہ ہونے کی وجہ سے اس اختلاف نے کبھی کسی سخت خطرناک فساد کی شکل اختیار نہیں کی۔

جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے اولاً تو باہم مذہبی مناقشوں کا کوئی ایک دوسرے کو موقعہ ہی نہیں دیتا تھا، بلکہ حتی الوسع ہر ایک دوسروں کے جذبات کا عموماً خیال کرتا تھا اور گاہے بگاہے اگر کوئی ناخوشگوار گفتگو اس سلسلہ میں ہو بھی جاتی تو اسے غیر معمولی اہمیت نہیں دی جاتی تھی، اور بات وہیں رفع دفع ہو جاتی تھی اور خواہ مخواہ اس کو جماعتی جھگڑا بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی، باقی پچھلے دنوں میں ''سادات بارہ'' کا جو قضیہ نامرضیہ پیش آیا اس میں شک نہیں کہ یاروں نے اس میں ایک حد تک شیعہ سنی کے اختلاف کا رنگ ضرور بھرا، اور خوب بھرا، امیر الامراء حسین علی خاں کے قتل پر مرثیے لکھے گئے اور بڑے دردناک مرثیے لکھے گئے، گویا اس واقعہ کو کربلا ثانی ٹھہرایا گیا، میر عبدالجلیل بلگرامی کا مرثیہ تو اسی مشہور مصرعہ سے شروع ہوتا ہے:

آثار کربلاست عیاں از زمین ہند

(۱) فیوض الحرمین ص ۶۵۔

اس باب میں اتنے غلواور مبالغے سے کام لیا گیا کہ جب جانسٹھ کی جنگ میں حسین علی خاں کے ایک عزیز سیف الدین خاں لڑتے ہوئے کام آئے، تو طباطبائی جیسے روشن خیال بزرگ نے بھی اس کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن دنوں یہ واقعات پیش آئے:

''از معتمداں مسموع افتادہ کہ درآں ایام علی التواتر سرخی شفق صبح وشام بمرتبہ از دیاد واشتد اد داشت کہ گویا دامن فلک جفار کار آلودہ خون مظلوماں و دیدہ لیل ونہار بر ماتم آں ابرار خوں فشانست''۔(۱)

(معتبر لوگوں سے یہ بات سنی گئی کہ ان دنوں میں مسلسل صبح وشام شفق کی سرخی اتنی زیادہ تیز ہوجاتی تھی کہ گویا فلک کا دامن مظلوموں کے خون سے آلودہ ہورہا ہے اور دن رات کی آنکھیں ان عزیزوں کے ماتم میں خونفشاں ہیں)۔

لیکن جو اصل واقعات سے واقف ہیں اور اجمالاً میں بھی کچھ پہلے ذکر کرچکا ہوں، کیا ان کے دیکھنے والے ایک لمحہ کیلئے بھی ''سادات بارہ'' کے جھگڑوں کو واقعی کسی مذہبی سوال کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں؟ تاریخ اسلام میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، اس سے پہلے بھی مختلف مواقع پر جاہ واقتدار کے متوالوں نے اپنے اپنے ہم خیالوں میں ہمدردی کا نشہ پیدا کرنے کے لئے اپنی اپنی خواہشوں پر مذہب کا نقاب چڑھایا تھا۔(القصة بطولها)

بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ نادر شاہی تلوار کی شرر باریوں اور برق افشانیوں نے روہیلوں کی ایک بڑی تعداد کو جب اپنے اپنے علاقوں سے منتشر اور پراگندہ کرکر کے ہندوستان کی طرف ڈھکیل دیا، تو ایرانی وتورانی عناصر کے ساتھ اب ملک اور دربار دونوں میں ایک جدید موثر عناصر کا اضافہ ہوگیا اور بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی بلکہ نادرشاہ کی واپسی اور راستہ میں اچانک اس کے قتل کی وجہ سے جب شاہ ابدالی کو کابل وقندھار کے علاقوں میں تسلط حاصل ہوا، اور مختلف اسباب ووجوہ کی بنیاد پر ایک دفع نہیں بلکہ مسلسل تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ صرف روہیلوں کے جرگوں کو ساتھ لے کر شاہ ابدالی نے ہندوستان پر سات حملے کئے، جن میں

(۱) ص ۸۷۴ ج ۱۔

آخری حملہ وہی تھا جو ''پانی پت کی مرہٹہ جنگ'' کے نام سے مشہور ہے، جس کا اجمالاً ذکر میں پہلے کرچکا ہوں، اس طرح نادرشاہ کے ستائے ہوئے خانہ برباد روہیلوں کے لئے شاہ ابدالی نے زمین تیار کردی کہ وہ ہندوستان کی اس حکومت میں جس پر عالم سکرات طاری تھا اور ہر طرف طوائف الملو کی کا دور دورہ تھا اپنے لئے مواقع فراہم کریں، علی محمد روہیلہ تو پہلے ہی سے ایک مرکز تیار کرچکا تھا، اور وہی علاقہ جو آج روہیل کھنڈ کے نام سے موسوم ہے، ان کے تسلط کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، ان کے نفوذ اور اثر کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ علاقہ ان ہی کے نام سے مشہور ہوگیا اور اب تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے، خصوصاً ''مرہٹی فتنہ'' کے استیصال کے بعد شاہ ابدالی رحمۃ اللہ علیہ نے سلطنت دہلی کا جو نظم قائم کیا، یعنی شاہ عالم (جو اس وقت شاہزادہ عالی گہر کے نام سے مشہور تھے) یہ تو بادشاہ رہیں گے اور امیر الامرائی کی خدمت نجیب الدولہ روہیلہ کو اور وزارت کا چارج نواب وزیر اودھ کے سپرد ہوا، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ روہیلوں کا ملک پر ایسا اقتدار قائم ہوچکا تھا، جن سے قطع نظر ناممکن تھا، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، اب ملک میں تین عنصر پیدا ہوگئے تھے، یعنی ایرانی، تورانی، روہیلے، اسی لئے شاہ ابدالی نے بادشاہی تو تورانیوں میں رکھی کہ وہی اب تک اس کے خاندانی طور پر مستحق تھے، وزارت ایرانیوں کو کہیئے یا شیعوں کو دی گئی اور امیر الامرائی کا عہدہ ایک روہیلہ امیر نجیب الدولہ کے سپرد ہوا۔

روہیلوں کا حکومت دہلی کے ایسے جلیل منصب پر اقتدار حاصل ہونے کا لازمی نتیجہ تھا کہ روہیلے جو اب تک اپنا ماویٰ وملجا زیادہ تر روہیل کھنڈ کو بنائے ہوئے تھے، اب دلی میں بھی اقتدار وقوت کے مظہر بن بن کر اپنے وجود کو محسوس کرانے لگے، علامہ محسن البہاری الترہتی ''الیانع'' میں لکھتے ہیں:

''لما استولی أحمد الأبدالی المعرف بالدرانی أحد ملوك جبال الأفاغنة علی دهلی و كثر فی سككها جماعات من قومه، و كانوا أكثر حصی من شعرات

غنم كلب".

(جب احمد شاہ ابدالی جو درانی کے لقب سے مشہور ہیں اور افغانی کوہستانوں کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہیں ان کا تسلط دہلی پر ہوگیا اور دلی کی گلیوں میں بکثرت ان کی قوم کے لوگ بھر گئے اور یہ لوگ قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ تعداد میں تھے)۔

اسی کا اثر تھا کہ بریلی میں حافظ الملک رحمت خاں، نجیب آباد میں نجیب الدولہ اور ان کے سوا اور بھی دوسرے مقامات میں روہیلوں کی چھوٹی بڑی ریاسیں قائم ہوگئیں، حتی کہ اس وقت تک رام پور، ٹونک، بھوپال (۱) ان ہی روہیلوں کی یادگاریں نیم آزاد ریاستوں کی صورت میں موجود ہیں۔

بہرحال نادر شاہ نے دشمن بن کر اور شاہ ابدالی نے دوست بن کر ان روہیلوں کو ہندوستان خصوصاً بالائی علاقوں میں بھر دیا، ظاہر ہے کہ روہیلے عموماً صرف سنی مسلمان ہی نہیں، بلکہ پکے حنفی بھی ہوتے ہیں، اور اس کے ساتھ یہ اپنے اندر چند مخصوص قومی خصوصیات رکھتے تھے، جن کی وجہ سے یہ ان دونوں قدیم عناصر تورانی و ایرانی سے الگ نظر آتے تھے اور مختلف وجوہ و اسباب نے ایک حد تک ان کو ایک الگ عنصر کی حیثیت سے ملک میں قائم کر دیا تھا، خصوصاً ان کے مزاج میں فطرتاً جو ایک قسم کی سختی اور کرختگی پائی جاتی ہے جو نہ ایرانیوں میں تھی اور نہ تورانیوں میں اور اسی کے ساتھ باوجود سنی مسلمان ہونے کے تورانیوں اور ان میں ایک نمایاں فرق یہ تھا جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ تورانی زیادہ تر صوفی مشرب اور حضرت

---

(۱) انگریزوں کے تسلط کے بعد سنبھل کے ایک پٹھان امیر خاں نے اسی "اکثر حصی من شعرات غم کلب" کے لوگوں کو جمع کر کے جن میں مختلف امراء کے تحلیل یافتہ فوج کے سپاہی بھی شریک ہوگئے تھے، مختلف علاقوں میں خصوصاً راجپوتانہ، مالوہ کی ریاستوں پر چھاپہ مارنا شروع کیا، آخر امیر خاں سے انگریزوں نے ایک معاہدہ کرلیا اور راجپوتانہ و مالوہ کی ریاستوں سے اضلاع کاٹ کاٹ کر ایک ریاست بنا دی گئی جن کا مرکز حکومت ٹونک ہے، جاورہ کی ریاست بھی امیر خاں ہی کے ایک رفیق عبدالغفور خان کو حاصل ہوئی۔

صوفیائے کرام و اولیاء عظام کے زیر اثر تھے، (۱) ان کے برخلاف روہیلے مسلمانوں پر بجائے صوفیوں اور ارباب باطن کے زیادہ تر تنگ نظر، ظاہر بیں، ''جزئیاتی فقہاء'' کا پنجہ سختی سے جما ہوا تھا، پشتہا پشت سے وہ اپنے ان ہی مذہبی پیشواؤں کے زیر اثر جنہیں یہ ملا کہتے ہیں زندگی گزار رہے تھے، صاحب ''الیانع الجنی'' لکھتے ہیں:

"وكانوا أشد قوم عصبية لما ينتحلونه من آراء فقهائهم رحمهم الله تعالى وأشد الناس جموداً عليها"۔

''جن فقہاء رحمہم اللہ کی آراء کی پیروی کو ان لوگوں نے اپنا مشرب اور مسلک قرار دیا تھا ان کے معاملہ میں اپنے اندر سخت تعصب رکھتے ہیں، اور اس پر جمے رہتے ہیں، روہیلے سخت ترین قوموں میں ہیں''۔

یہ تو بے چارے کسی شاعر نے شاعری کی ہے کہ اس کے معشوق کی محفل میں: ع

بات پر یاں زبان کٹتی ہے

لیکن اس قوم کا یہ واقعہ ہے کہ ''کیدانی'' جیسی معمولی کتاب کی ایک فقہی روایت یعنی ''چاہئے کہ تشہد میں اہل حدیث کے مانند شہادت کی انگلی نماز نہ اٹھائے''۔ اس مسئلہ نے صدیوں بلکہ سنتے ہیں کہ اب تک یہ اہمیت حاصل کرلی ہے کہ اگر اتفاقاً نماز میں کسی کی انگلی اٹھ گئی، اسی وقت اس کی انگلی تراش دی جاتی تھی، علامہ رشید رضا مصری نے "المغنی" کے مقدمہ میں اپنا یہ بیان درج کیا ہے:

"سمعته بأذني من بعض الطلاب الأفغانيين في مسجد لاهور الجامع في الهند، وقد سألتهم عن صحة ما نقل عن بعض أهل بلادهم في ذلك، فقالوا نعم، وعللوه بأنه عقاب على مخالفة الرسول وترك سنته"۔

---

(۱) اس وقت کتاب تو میرے سامنے نہیں ہے لیکن نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مدظلہ العالی نے ظہیر الدین بابر پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں بابر کے باپ کا ایک واقعہ درج ہے کہ حضرت عبداللہ احرار کی مجلس میں ایک دن حاضر ہوا اور نوکیلی ہڈی پر اتفاق سے بیٹھ گیا، گھنٹوں یہ ہڈی چبھتی رہی لیکن ادباً اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔

"میں نے اپنے کان سے بعض افغانی طلبہ سے لاہور کی جامع مسجد میں جو ہندوستان میں واقع ہے یہ سنا ہے، میں نے دراصل اان سے دریافت کیا تھا کہ (انگلی تراشنے کا قصہ) کیا صحیح ہے؟ اس کے جواب میں ہاں کہا اور اس کی توجیہہ یہ کی کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور ترک سنت کی یہ سزا دی جاتی ہے"۔

تمباکو جیسی غیر منصوص چیز کی حرمت وحلت پر جو جھگڑا یہاں کے ملاؤں میں چھڑا، سنا جاتا ہے کہ پچھلے چند سالوں تک یہ قصہ ختم نہیں ہوا تھا، بے چارے کوٹہ ملا نے تمباکو کی حلت کا فتویٰ دے دیا تھا، پھر کیا تھا، مختلف جرگوں کے "مجاہد" دینی حمیت وغیرت کے نشہ میں چور اپنے ملاؤں کے زیر کمان باضابطہ مسلح ہو ہو کر کوٹہ ملا پر چڑھ دوڑے، راستہ میں اس "دینی جہاد" کی مہم پر جو رجز پڑھا جاتا تھا، میرے ایک دوست نے ہم سے بیان کیا تھا کہ وہ یہ تھا:

کوٹہ نہ ملا کا پردئ جو ساک شدہ ہم کا پردئ

(یعنی کوٹہ ملا کافر ہے اور جو اس کے ساتھ ہے وہ بھی کافر ہے۔)

میرے ایک اور سرحدی ہم سبق کہتے ہیں کہ تمباکو کی حرمت کے جو لوگ قائل تھے ان کا تشدد اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ جس کھیت میں تمباکو بویا جائے اس کھیت کے اطراف سے بیلوں پر غلہ لاد کر جو کوئی گزرے گا اس کا غلہ بھی حرام ہو جاتا ہے، بہرحال اس قوم کے اسی فطری "بطش شدید" اور "ملاکیشی" کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور مغلی حکومت جس میں ایرانی وتورانی اب تک گونہ رواداری اور باہمی مدارات کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے، اس میں روہیلوں کی شدید ملایانہ ذہنیت نے بتدریج تلخی اور تندی کا اضافہ کرنا شروع کر دیا، یہ تو ظاہر ہے کہ واقعی طور پر سرحدی پٹھان یا روہیلے نہ کبھی خارجی تھے نہ کبھی ہوئے اور نہ اب تک ہیں، لیکن ان کی "صوفیانہ سنیت" نہیں بلکہ شدید ملایانہ "سنیت" کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ جیسے بزرگ جو آج تک شیعوں میں اپنی مشہور کتاب "تحفہ اثناعشریہ" کی وجہ سے بدنام اور حد سے زیادہ بدنام ہیں جس دن یہ کتاب لکھی گئی ہے، نہ صرف ہندوستان بلکہ سنا گیا ہے کہ ایران میں بھی اس کے جواب دینے کی بارہا کوشش کی گئی، لکھنؤ کے مجتہد مولوی سید محمد

صاحب کے متعلق معتبر لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے بہت سی جلدوں میں اس کا جواب لکھا ہے، اور بھی بہت سے چوٹی کے مجتہدوں نے اس کے جواب لکھنے کی کوشش کی اور آج تک یہ کوششیں ہو رہی ہیں، بہر کیف شاہ صاحب کا سنیت کی حمایت میں جو شہرہ ہے وہ محتاج بیان نہیں، لیکن خود شاہ عبدالعزیز صاحب اپنا ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ روہیلہ پٹھان جن کا نام حافظ آفتاب تھا اور شاہ صاحب کے وہ شاگرد تھے، وہ "ہمیشہ حاضر درس می شوذ" (۱)، فرماتے ہیں کہ:

"روزے ذکر حضرت امیر علیہ السلام بود چنانچہ عادت ماسنیاں است کہ ہر صحابی کہ اندبجان ودل مناقب وفضائل او بیان می کنم، ہم چنیں کردم"۔

"ایک دن حضرت امیر علیہ السلام کا تذکرہ تھا، پھر جیسا کہ ہم سنی لوگوں کی عادت ہے کہ جو صحابی بھی ہوں دل وجان سے ان کے فضائل اور مناقب کو بیان کرتے ہیں، حسب دستور اس تذکرہ میں بھی میں نے یہی کیا"۔

لیکن شاہ صاحب کے اس روزانہ حاضر باش روہیلہ تلمیذ رشید کا حال سنئے کہ محض اس لئے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ اس وقت شاہ صاحب نے دوسرے اصحاب وخلفاء کے مناقب ومحامد کا چونکہ ذکر نہیں فرمایا تھا، اسی لئے باوجود سنی ہونے کے اور کسی کو نہیں بلکہ شاہ عبدالعزیزؒ کے متعلق بے تحاشہ اس نے "شیعہ" ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا، خود شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

"بندہ را شیعہ فہمیدہ" (بندہ کو اس نے شیعہ سمجھ لیا۔)

اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کی "ملائی سنیت" نے شاہ صاحب کی جانب سے ایسی شدید نفرت اس کے دل میں پیدا کر دی کہ:

"آمدنِ درس موقوف کرد" (درس میں آنا بھی اس نے بند کر دیا۔)

یہ فتوی تو "تحفہ اثناعشریہ" کے مصنف پر اس روہیلہ پٹھان نے لگایا "ازالۃ الخفاء"

(۱) ہمیشہ درس میں حاضر ہوتے تھے۔

اور ''قرۃ العینین'' وغیرہ کتابوں کے مصنف حضرت شاہ ولی اللہؒ بھی ان کے ''ناوک تعصب'' سے محفوظ نہ رہ سکے، شاہ عبدالعزیز صاحب ہی کی روایت ہے فرماتے ہیں:

''ہم چنیں شخصے از والد ماجد مسئلہ تکفیر شیعی پرسید آنحضرت اختلاف حنفیہ کہ دریں باب ست بیان کردند''۔

(یوں ہی ایک شخص نے والد ماجد سے شیعوں کے کافر قرار دینے کے متعلق فتویٰ پوچھا، حنفی فقہاء کا اس باب میں جو اختلاف ہے (والد ماجد نے) اس کو بیان فرمایا۔)

''ملاکیش'' غریب روہیلہ پہلی دفعہ تو یہ سن کر چپ ہورہا، اور پھر دہرا کر ذرا اصرار سے اپنے منشاء کو ظاہر کرتے ہوئے:

''چوں مکرر پرسید ہماں شنید'' (جب اس نے دوبارہ وہی بات پوچھی تو جواب میں پھر وہی سنا۔)

دوسری دفعہ اس کا یہ سننا تھا کہ آگ بگولا ہوگیا، جن کو وہ قطعی کافر سمجھتا تھا، ان کے کفر کے متعلق اختلاف کا سننا اور دوبارہ پوچھنے کے بعد بھی سننا ناقابل برداشت ہوگیا تھا، خود حضرت سے فتویٰ پوچھنے، لیکن الٹ کر خود مفتی بن بیٹھا، شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ:

''شنیدم می گفت ایں شیعی ست''

(میں نے سنا وہ کہتا تھا کہ یہ (یعنی شاہ ولی اللہ) شیعی ہے۔)

اور یہ حالت تو ہمارے سرحدی اور افغانی بھائیوں کی ''سنیت'' کی تھی، باقی رہی ان کی ''حنفیت'' سو اس کا کچھ انداز ''رفع سبابہ'' اور ''تنباک'' کے مذکورہ بالا مسائل ہی سے ہوسکتا ہے، "الیانع الجنی" کے مؤلف نے حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ کے ان حنفی روہیلوں کی ''حنفیت صلبہ'' یا سنگین ملایانہ حنفیت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

"فكانوا إذا قرع صماخهم ما ينابذ مقلدهم الذى استطابوا غداءً كان أحدهم يكاد يسطو بالذى خرجت منه القولة، وامتلأ عليه غيظاً قد انتفخت أوداجه واحمرت وجنتاه كأنهما ضرام العرفج"۔(۱)

(۱) (ص۸۳)

''ان کا حال یہ تھا کہ جب ان کے کان میں کوئی ایسی بات پہونچتی، جو ان کے اس تقلیدی امر کے خلاف ہوتی جسے کل وہ اچھا سمجھتے تھے تو ان میں جو کوئی ہو، قریب ہوتا کہ اس شخص پر چڑھ بیٹھے جس کے منہ سے ایسی مخالف بات نکلی ہوتی، غصہ سے اس کے مقابلہ میں بھر جاتا اس کی گردن کی رگیں پھول جاتیں، اس کے رخسار سرخ ہوجاتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ جھاؤ کی لکڑی کے انگارے ہیں''۔

ہندوستان میں رہ پڑنے کے بعد اگرچہ اب ان کی پچھلی نسلوں میں نسبتاً وہ کرختگی اور تصلب تو باقی نہیں رہا ہے، جس میں کچھ تو اس ملک کی آب وہوا کا اثر ہے، نیز اس کے سوا اور اسباب بھی ہیں جن کا کچھ ذکر شاید آئندہ آئے، ورنہ جو اب تک ان ہی پتھریلے کوہستانوں میں رہتے ہیں، ان کی دینی سختی کا حال جیسا کہ سید رشید رضا مصری نے لکھا ہے وہی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ومن ذلك أن بعض الحنفية من الأفغانيين سمع رجلاً يقرأ الفاتحة وهو بجانبه فى الصف فضربه بمجموع يده على صدره ضربة وقع بها على ظهره فكاد يموت، فبلغنى أن بعضهم كسر سبابة مصل لرفعه إياه فى التشهد"۔(۱)

''ان کی سختیوں کی داستانوں میں ایک قصہ یہ ہے جو بعض افغانی حنفیوں کے متعلق سنا جاتا ہے کہ اس نے جماعت میں اپنے برابر والے کو دیکھا کہ وہ سورۃ فاتحہ (امام کے پیچھے) پڑھ رہا ہے تو اس افغانی نے اس بیچارے فاتحہ پڑھنے والے کو سینے پر اس زور سے مارا کہ وہ بیچارہ پیٹھ کے بل زمین پر گر پڑا اور قریب تھا کہ مرجائے، اور مجھے یہ خبر بھی ملی ہے کہ ایسے ہی ایک شخص نے تشہد کی انگلی نماز میں اٹھائی تو بعض افغانوں نے اس کی انگلی توڑ دی''۔

بہرحال فتنوں والی تاریک راتوں کی جس خونی موج کے آغوش اور اسلامی ہند کے شدید طوفانی عہد کے ذکر کو میں نے ناصیۂ مضمون پر ثبت کیا ہے (۲)، غالبًا اہل نظر کے سامنے اگرچہ جیسا کہ چاہئے میں کوئی تفصیلی بیان نہ پیش کرسکا، لیکن ایک مجلّاتی مقالہ میں اس تصویر کے جتنے خط وخال کو نمایاں کیا جاسکتا ہے، اپنے محدود معلومات اور کوتاہ رسائی کی حدتک ممکنہ کوشش

(۱) ص ۱۶ مقدمہ مغنی

(۲) کتاب کے اصل عنوان کی طرف اشارہ ہے، جس نام سے یہ مبسوط مقالہ الفرقان میں شائع ہوا تھا یعنی ''آغوش موج کا درتابندہ یا اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا ایک وفادار بندہ''

کی گئی ہے، کیونکہ بغیر اس کے سچی بات یہی ہے کہ اس ''درتابندہ'' کی حقیقی قدر و قیمت قطعاً نہیں پہچانی جاسکتی، جس نے ابتلاء و امتحان کی ان ہی خونی موجوں میں پرورش پائی اور طوفان کے ان ہی ہنگاموں میں انتہائی دانائی و فرزانگی کے ساتھ وہی جس کی محبت میں وہ ہر چیز کی محبت سے دست بردار ہو چکا تھا اسی کی ملت مقدسہ اور امت مرحومہ کی کشتی کو اپنی وسعت و طاقت کی حد تک منجدھار سے نکالنے میں قطعاً کامیاب ہوا۔

فصلیٰ اللہ تعالیٰ علی نبینا ونبیہ ورسولنا وجزاہ اللہ عناوعن أمتہ خیر الجزاء۔

یہاں تک کے تاریخی مباحث کا مقصد اور حاصل

میرا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ بالا اوراق کے پڑھنے والے اب صحیح طور پر اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ جس زمانہ میں پیدا ہوئے اور جن دنوں میں وہ سرزمین ہند میں زندگی گزار رہے تھے، اس وقت ہر چار طرف سے اسلام نرغہ میں گھرا چلا جارہا تھا، شمال مغربی علاقوں میں سکھوں کی آتشیں قوت سر اٹھا رہی تھی، جنوبی ہند سے مرہٹوں کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا ملک کے ''اعزۃ'' کو ''اذلۃ'' بنانے میں بے دردی سے سرگرم تھا، دونوں قوتوں میں باہم جو کچھ بھی اختلاف ہو لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے آثار ونشانات، ان کے نام لیواؤں اور وابستوں، حلقہ بگوشوں کا بالکلیہ قلع قمع کرنے پر دونوں ادھار کھائے بیٹھے تھے، تیسری طرف خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے مغربی قوتیں بتدریج اپنا پنجہ ملک پر جماتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اور یہ تو بیرونی فتنے تھے، اندر ایرانیوں اور تورانیوں، پھر ان کے ساتھ روہیلوں کے باہمی تصادم اور مختلف اغراض ومقاصد کی کشمکش سے ''اسلامی حکومت ہند'' کی قبا تار تار ہو رہی تھی، ان سیاسی مقاصد کے ساتھ ساتھ صوفیا کے غلط تصوف اور فقہا کے غلط تفقہ، حد سے گزری ہوئی عصبیت اور جاہلی حمیت نے امت کے شیرازوں میں الگ انتشار پیدا کر رکھا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ ایرانی علماء اور شعراء وادباء کا جو دباؤ مختلف وجوہ سے ہندوستانی علماء، ارباب فکر ونظر اور تعلیم وتدریس وتصنیف وتالیف

کے نظام پر پڑ رہا تھا، اس کی وجہ سے آہستہ آہستہ یہاں کے اہل علم کا تعلق قرآن وحدیث، تحقیق فقہ واصول فقہ اور عقائد وکلام سے ہٹ کر بے معنی، لاحاصل ذہنی اور لفظی مباحث کے گھورکھ دھندوں میں الجھ الجھ کر ''خسر الدنیا والآخرۃ'' کی صورت پیدا کر رہا تھا کہ ان لاحاصل مساعی کا کوئی نتیجہ نہ ان کو دنیا میں مل سکتا تھا اور نہ آخرت میں، خصوصاً ایک ایسے زمانہ میں جب ''مغل دربار'' اور مغل دربار کے امراء جو ان لفظی نکتہ نوازیوں اور دماغی عیاشیوں کے قدردان تھے اور ان سے گونہ محظوظ بھی ہوتے تھے، خود ان غریبوں کا اقتدار ہی اندر اندر کھوکھلا ہوتا چلا جارہا تھا، ان کے تختے خود ہی الٹ رہے تھے، پھر وہ بے چارے دوسروں کی قدردانی کیا کرتے اور ملک میں جو نئی قوتیں ابھر رہی تھیں، ان کے سامنے ان ایرانی نژاد لفظی کج بحثیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

غالباً ان حالات کو سب دیکھ رہے تھے، کیونکہ سبھوں کے سامنے گزر رہا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جو کچھ انجام ہونے والا تھا وہ مشکل ہی سے کسی کو سوجھ رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے عقل وحواس کو معطل کر کے ہر ایک اسی دھارے پر بہا چلا جارہا تھا، جدھر زمانہ کے تھپیڑے انہیں بہائے لئے جارہے تھے لیکن حیرت نہ کرنی چاہیے، خصوصاً اسلامی تاریخ مطالعہ کرنے والوں کو ششدر نہ ہونا چاہیے کہ پہلی دفعہ نہیں بلکہ تیرہ سو سال سے اسلامی حدود کے جس علاقہ میں اس قسم کے واقعات پیدا ہوتے ہیں، تو کائنات کی وہی آخری قوت جس کے پیغام کا نام اسلام ہے اور جس پر خدا نے اپنی پیامبری کے سلسلوں کو ہمیشہ کیلئے مختتم فرمایا ہے، اسی کا کوئی معجزہ ضرور ایسے وقت میں ظاہر ہوا ہے، اور ان منصوبوں کو خاک میں ملا دیا ہے جو دشمن اپنے دلوں میں سوچا کرتے اور جن کا خیال کر کر کے ایمان والے سہمے جاتے تھے، یہی واقعہ ہندوستان میں بھی پیش آیا۔

فتنوں کے اس دور میں شاہ ولی اللہ کی آمد

ایک ایسے باپ سے جو مشرباً صوفی اور تعلیماً مشہور معقولی ومنطقی عالم میرزا زاہد (۱)

(۱) تقریباً دو ڈھائی سو سال سے اس ہراتی ہندی عالم کی تین کتابیں ہندوستان، بخارا، کابل وغیرہ کے مدارس میں داخل نصاب ہیں ان کتابوں کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ عالم ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جب کہ.........

ہروی صاحب ''زواہد ثلثہ'' کے رشید شاگردوں میں تھے اور کیسے رشید شاگرد کہ شاہ ولی اللہ نے خود اپنے والد کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

''ایشاں با من التفات بسیاری کردند حدی کہ اگر می گفتم کہ امروز مطالعہ نہ کردہ ام، می گفتند یک سطر یا دو سطر خوانید کہ ناغہ نشوذ''(۱)

''مرزا زاہد کی توجہ میری طرف اس حد تک مبذول تھی کہ میں کہتا کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا اس لئے نہیں پڑھوں گا تو مرزا کہتے کہ ایک یا دو سطر ہی پڑھ لو، تا کہ ناغہ تو نہ ہو''۔

مرزا زاہد کی سب سے بڑی معرکۃ الآرا تصنیف ''حواشی امور عامہ شرح مواقف'' کے متعلق شاہ ولی اللہ کا بیان ہے:

''ظاہرا تسوید حاشیہ شرح مواقف بہ تقریب قراۃ حضرت ایشاں بوذ''

''حاشیہ شرح مواقف کی مسودہ نگاری کا کام مرزا نے اسی سلسلہ میں کیا جب والدان سے یہ کتاب پڑھتے تھے''۔

بہرحال اسی معقولی فلسفی کے ایک صوفی شاگرد کے صلب مبارک سے حق تعالی نے

...........مرزا زاہد کی کتابوں میں سے کسی ایک پر یا سب پر کوئی حاشیہ نہ رکھتا ہو، مبالغہ نہیں ہے کہ ان تین کتابوں کے حواشی کی تعداد ہزاروں تک پہونچی ہوئی ہوگی، ہندوستان دراصل مرزا زاہد کے والد قاضی اسلم ہرات سے عہد جہانگیر میں آئے، بادشاہ نے قاضی القضاۃ کے عہدے پر قاضی اسلم کا تقرر کردیا تھا، قاضی اسلم ملا فاضل کے اور وہ مرزا جان شیرازی مشہور منطقی عالم کے شاگرد تھے، بہرحال ان ہی قاضی اسلم کے صاحبزادے کا نام مرزا زاہد ہے، معلوم نہیں کہ عام مدارس میں بجائے مرزا زاہد کے میر زاہد کیسے مشہور ہوگیا، غالباً تصحیفی غلطی ہے اور لوگوں نے اس غلطی پر دوسری غلطی یہ کی کہ "**قال السید الزاهد**" اور "**قال السید السند**" وغیرہ لکھنا شروع کیا، مرزا زاہد بچپن ہی سے بڑے ذہین تھے، کل تیرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے، عالمگیر کے زمانہ میں مختلف خدمتوں پر بحال ہوئے، شاہ عبدالرحیم جس زمانہ میں ان سے پڑھتے تھے آگرہ میں فوج کے محتسب تھے، علاوہ زواہد ثلثہ کے میر زاہد کا ایک حاشیہ شرح تجرید پر بھی ہے اور اشراقیوں کی کتاب "**هياكل النور**" پر بھی ایک شرح لکھی ہے، شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے ''از مشرب صافی صوفیہ غیر بہرہ تمام داشتہ اند'' [صوفیانہ مسلک سے بھی خوب مستفید ہوئے تھے۔]

(۱) انفاس ص ۳۲

محض اپنے فضل و کرم سے بڑے سخت وقت اور کٹھن گھڑی میں ہندی مسلمانوں کو وہ گرامی ہستی عطا فرمائی، جس کا نام ''حضرت سید الامام مولانا الشاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ العزیز'' ہے۔

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم کی شخصیت

اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ جو کچھ ہونے والے تھے اور ہندوستان میں جس دینی وعلمی موسم کو ان کی مخلصانہ کوششوں نے پیدا کیا، اس موسم کی بہار کی ابتدا خود ان کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ سے ہو چکی تھی، پہلی بازی جو شاہ عبدالرحیم نے جیتی وہ اس وقت کی بات ہے جب وہ طالب علم تھے اور فتاوی عالمگیری کی تدوین ہو رہی تھی، ان کے ایک ساتھی جن کا نام شیخ حامد تھا، ان کو بھی کام کا کچھ حصہ دفتر تدوین سے عطا ہوا تھا، براہ محبت و دوستی، شیخ حامد نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو شریک کار کرکے کچھ یومیہ (تنخواہ) کی امید دلائی لیکن جو کسی آنے والے سالِ نو کی بہار تھا، اس نے ملتی ہوئی تنخواہ سے انکار کردیا، اس انکار کی خبر جب شاہ عبدالرحیم کی بیوہ والدہ کو ہوئی تو برہم ہوئیں اور اصرار کرکے حکماً نوکری قبول کرنے پر مجبور کیا تو نوکر ہو گئے، مگر جب اس ملازمت کی خبر آپ کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کو ہوئی تو اب یہ برہم ہوئے اور ترک ملازمت پر قدغن شروع کیا، شاہ صاحب نے والدہ کے حکم کا عذر پیش کیا، لیکن ''پیر'' نے اپنے حکم کی پیروی کا فیصلہ صادر فرمایا، پھسل جانے کا شاید موقع تھا، لیکن شاہ عبدالرحیم سنبھل گئے اور مرشد سے عرض کیا کہ آپ ہی دعا فرمادیں کہ نوکری چھوٹ جائے، ورنہ یوں چھوڑ دوں گا تو والدہ کی سخت آزردگی کا اندیشہ ہے، حصول ملازمت کے لئے نہیں بلکہ ترک ملازمت کی دعا کرائی گئی اور کی گئی، عالمگیر کے تدوین فتاوی کے ملازموں کی فہرست وقتاً فوقتاً پیش ہوتی رہتی تھی حسب دستور پیشی کا عالمگیر نے حکم دیا اور بلاوجہ شاہ عبدالرحیم کے نام پر قلم پھیر دیا، مگر امتحان کی ایک منزل باقی تھی، اورنگ زیب نے تنخواہ بند کرکے اس سے بھی بڑا لقمہ پیش کیا، فرمان ہوا کہ:

''گر خواستہ باشد، ایں قدر زمین بد ہید'' (اگر چاہیں تو اتنی زمین ان کو دی جائے۔)

نوکری چھوٹی، جاگیردار بنائے گئے، قدرت جس کا ارادہ کچھ اور تھا اس کی توفیق نے پھر ان کے بازو تھام لئے، شاہ عبدالرحیم صاحب سے شاہی فرمان کے بموجب جب استصواب کیا گیا تو باوجود تنگی معاش اور محض بے وسیلہ ہونے کے خود فرماتے ہیں:

''قبول (۱) نہ کردم وشکرانہ بجا آوردم وحمد خدا تعالی گفتم'' (میں نے قبول نہیں کیا اور

---

(۱) شاہ عبدالرحیم کے اس قول سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اور آپ کے خاندان والوں کو جیسا کہ اس زمانہ کا عام دستور تھا حکومت سے کسی قسم کی کوئی جاگیر منصب وظیفہ، مدد معاش وغیرہ نہیں ملی تھی، شاہ ولی اللہ کے متعلق میں نے بہت تلاش کیا بجز اس حویلی کے جو مدرسہ کے لئے محمد شاہ بادشاہ نے آپ کو پیش کی تھی اور کسی حکومتی امداد کا پتہ نہیں چلا، شاہ عبدالرحیم تک تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خاندان میں قدیم سے طبابت کا پیشہ چلا آتا تھا، لیکن جیسا کہ شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات میں ہے:

''حکمت ہم در خاندان ما معمول بود، چنانچہ جد بزرگوار وعم فقیر دوامی کردند، والد ماجدِ بندہ موقوف ساختہ''۔ (میرے خاندان میں طبابت کا رواج تھا، چنانچہ فقیر کے دادا بزرگوار اور چچا دواسازی کرتے تھے، بندہ کے والد ماجد نے موقوف کردیا) ص۲۲

شاہ ولی اللہ کے بعد بھی خاندان میں کوئی جاگیر وغیرہ آئی، اس کے متعلق صرف مرحوم امیر شاہ خاں صاحب کی امیر الروایات میں ایک روایت ہے کہ ضلع بلند شہر تحصیل سکندرہ میں حسن پور نامی ایک گاؤں اس خاندان کا تھا، امیر شاہ خاں نے اس گاؤں کو خود بھی دیکھا ہے، فرماتے ہیں کہ اچھا خاصا بڑا گاؤں ہے ان ہی خاں صاحب کا بیان ہے کہ عموماً مال گزرای وغیرہ وصول کرنے کے لئے مولانا اسماعیل شہید جایا کرتے تھے، ایک دفعہ مولوی موسی بن مولانا رفیع الدین بھی گئے تھے، امیر الروایات میں دوسری جگہ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ''انگریزی عہد میں شاہ اسحاق وشاہ یعقوب سے حکومت نے یہ جاگیر ضبط کرلی، بیان کیا جاتا ہے کہ اس دن دونوں بھائی جتنے مسرور دیکھے گئے کبھی اس حال میں لوگوں نے آپ کو نہیں پایا تھا'' بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گاؤں غالباً شاہ عبدالعزیز کے زمانہ میں کسی ذریعہ سے اس خاندان میں آیا تھا، ورنہ اس سے پیشتر ان حضرات کا معاشی ذریعہ وہی توکل تھا جس پر سلفاً عن خلف عموماً اہل اللہ کا مدار رہا ہے، اگرچہ ادھر کچھ دنوں سے مغرب زدوں کے فقروں سے تنگ آکر لوگوں میں اس سے گونہ کراہیت پیدا ہوتی چلی جارہی ہے، تایید میں صحابہ کرام کو پیش کیا جاتا ہے، جن کی ظاہر ہے کہ حیثیت مریدوں کی تھی لیکن مشائخ واکابر صوفیہ جس ذات گرامی کی نمائندگی کرتے ہیں، سوال ان کے متعلق ہے کہ نبوت کے بعد اور فتوحات سے پہلے درمیانی......

شکر ادا کیا اور حق تعالی کی حمد کی۔)

نوکری چھوٹی، جاگیر سے محروم ہوئے لیکن اس پر بھی ''حمد خدا تعالی گفتم'' جس کا یہ مقام ہو، اگر اس کا اور اس کی ذریت طیبہ کا قدرت کس اہم خدمت کیلئے انتخاب کرے تو: ''لئن شکرتم لأزیدنکم'' (اگر تم شکر کروگے تو میں تمہیں بڑھاتا چلا جاؤں گا) کے وثیقہ محکمہ اور وعدہ موکدہ والے سے اور کس بات کی توقع کی جاسکتی تھی۔

زیادہ تو نہیں لیکن اتنا حال تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس امتحان سے کامیاب ہونے کے بعد شاہ عبدالرحیم کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم جو آگرہ میں رہتے تھے اور شاہ صاحب بھی ان دنوں آگرہ ہی میں تھے، خلیفہ صاحب نے شاہ صاحب کو حکم دیا کہ شاہ عظمت اللہ نامی بزرگ کے پاس جاکر حاضری دو، جو سلسلہ طریقہ چشتیہ کے ایک کہنہ سال معمر ترین بزرگ اس زمانہ میں آگرہ میں تھے، مرشد کے بار بار اصرار کے بعد آخر ایک دن شاہ عبدالرحیم عظمت اللہ شاہ صاحب کے پاس حاضر ہوئے، وہ بیمار تھے، پلنگ پر لیٹے لیٹے باتیں کرتے رہے، سلسلۂ گفتگو میں شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنا خاندانی تعلق ''شیخ عبدالعزیز شکر بار'' سے ظاہر کیا۔ (۱)

......زندگی حضور ﷺ نے جو گزاری کیا اس کے لئے آپ نے کوئی کسب اختیار فرمایا تھا، اصل یہ ہے کہ مشائخ ان فتوحات سے دینی مہمات میں کام لیتے تھے، اب اگر کوئی ان کو اپنے لذائذ نفسانی پر صرف خرچ کرتا ہے تو اس کا وہ خود ذمہ دار ہے، لیکن محض اس غلط استعمال کی وجہ سے فتوحات مشائخ کے عدم جواز کا فتوی صادر کرنا کیا صحیح ہوسکتا ہے؟ کچھ بھی ہو میرے نزدیک تو اس زمانہ کی چندہ بازیوں اور اس کی خواریوں سے پہلے زمانہ کی فتوحات سازیوں کی عزت بہرحال بہتر تھی، چند لیڈروں کی ریس میں جو مولوی یا مشائخ فتوحات سے کاسد ہیں، ''أتستبدلون الذی هو أدنی بالذی هو خیر'' کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

(۱) انفاس میں ہے کہ ''ایشاں جد اعلی حضرت والد بزرگوار انداز جہت والدہ''، یعنی ایشاں شاہ عبدالرحیم کے نانا تھے، شیخ عبدالعزیز کے والد کا نام حسن تھا، حسن کے والد کا نام طاہر تھا، شیخ طاہر اگرچہ اوچھ (ملتان) کے رہنے والے تھے لیکن شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ: ''ناحیہ پورب اقامت گاہ ایشاں شد'' (اطراف پورب میں اقامت اختیار فرمائی)، پورب سے کیا مراد ہے، صاف طور سے معلوم نہ ہوسکا، البتہ شیخ طاہر کی تعلیم اور شادی کا ذکر فرماتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ ''تحصیل علم ایشاں بہ بلدہ بہار کہ مجمع علماء بود''......

معاً عظمت اللہ شاہ صاحب سے یہ سنتے ہی پلنگ سے زمین پر آ گئے اور شاہ عبدالرحیم کو گلے سے لگایا، پھر ایک سوال کیا، جواب پایا، اس کے بعد شاہ عظمت اللہ صاحب نے یہ قصہ کہنا شروع کیا کہ ''میرے دادا صاحب کو شیخ عبدالعزیز شکر بار نے وصیت فرمائی تھی اور کچھ تبرکات دیئے تھے اور کہا تھا کہ میری اولاد میں سے اگر کوئی تمہارے پاس آ کر فلاں سوال کا جواب دے تو میرے یہ تبرکات اس تک پہونچا دینا، یہ تبرکات دادا کے زمانہ سے اس وقت تک اسی وصیت کے ساتھ محفوظ چلے آ رہے ہیں، شاہ عظمت اللہ نے فرمایا کہ چونکہ سوال کا جواب تم نے دے دیا اس لئے وصیت پوری کرنے کا وقت آ گیا، یہ کہہ کر شاہ عبدالرحیم کے سر پر انہوں نے عمامہ باندھا اور اپنے طریقہ کی اجازت بھی عطا فرمائی، جب چلنے لگے تو کچھ مٹھائی اور نقد روپے بھی ساتھ کر دیئے، شاہ عبدالرحیم صاحب وہاں سے ان سب چیزوں کو لئے ہوئے اپنے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کے پاس پہنچے اور مٹھائی، روپے خلیفہ صاحب کے آگے رکھ دیئے، ماجرا بیان کیا: ''بہ بشاشتِ قلبی تلقی کردند'' (۱)۔ اور آخر میں خلیفہ ابوالقاسم نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو یہ بشارت سنائی:

''نقد اشارت بہ جمعیت ظاہر و عمامہ اشارت بہ اجازت و جمعیت باطن''

......(تحصیل علم شہر بہار جو کہ مجمع علماء تھا) میں ہوئی اور: ''بعد فراغت قاضی بہار صبیہ خود ایشاں راداد'' (فراغت کے بعد قاضی بہار نے اپنی بچی سے آپ کا عقد کر دیا۔) شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں لکھا ہے کہ ''شیخ طاہر از ملتان بہ طلب علم بایں دیار افتاد، ومدتے در بلدہء بہار سکونت کرد، و پیش شیخ بدھ حقانی تحصیل علم نمود وہم در بہار شیخ حسن از خلوت عدم بہ مہمان سرائے وجود رسید'' (شیخ طاہر نے ملتان سے اتنے دور افتادہ علاقہ کا سفر کیا، اور بہار میں سکونت اختیار کی اور شیخ بدھ حقانی سے تعلیم حاصل کی، اور بہار ہی میں شیخ حسن عالم وجود میں آئے)۔ (صفحہ ۱۹۵) جس کے یہی معنی ہوئے کہ شاہ عبدالرحیم کے نانا کے والد بہار ہی میں پیدا ہوئے تھے اور غالباً ''قاضی بہار'' جس کی لڑکی سے شیخ طاہر کی شادی ہوئی وہ شیخ بدھ حقانی'' ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔ [شیخ عبدالعزیز شکر بار کے پوتے شیخ رفیع الدین بن قطب العالم بن عبدالعزیز حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے نانا تھے]

آخر میں شیخ عبدالعزیز اپنے مرشد قاضی ظفر آبادی کے حکم سے دلی آئے اور: ''موسس قوانین ارشاد گشت''۔

(۱) پوری بشاشت سے قبول فرمایا۔

''روپیہ تو ظاہر حال کے اطمینان اور فراغ بالی کی طرف اشارہ ہے اور عمامہ باطنی اطمینان اور فراغ بالی اور اجازت کا اشارہ ہے''۔

اس جمعیت ظاہر کی بشارت کے بعد خود شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ معاشی پراگندگی کا سوال ان کی زندگی میں سرے سے کبھی پیدا ہی نہیں ہوا، اور نہ ''جمعیت باطن'' کی اس خوشخبری کے بعد انہیں ''معادی حیات'' کے لئے کبھی دشواری اٹھانی پڑی، ''فتوحات'' کی یہی شکل کہ دل سے نکال دینے کے بعد آنکھوں کے سامنے آئے تب تو واقعی فتوحات ہیں لیکن جو لوگ بہ ظاہر ان سے آنکھیں چراتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں چوبیس گھنٹے ان ہی فتوحات کے بت براجمان ہیں، یقیناً یہ فتوحات نہیں عقوبات ہیں، قرآن کی اس آیت کا ایک مصداق اگر یہ ''فتوحات'' بھی ہوں تو کیا تعجب ہے:

''إِنَّ كَثِيراً مِّنَ الأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللّهِ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلاَ يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ، يَوْمَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَـذَا مَا كَنَزْتُمْ لأَنفُسِكُمْ فَذُوقُواْ مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ'' [سورۃ البراءۃ آیت ۳۵]

''قطعاً بہت سے احبار (علماء یہود) اور رہبان (مشائخ نصاریٰ) لوگوں کے مال باطل راہ سے کھاتے ہیں اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے، اور جو سونے چاندی کو سینت سینت کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے ایسے لوگوں کو دکھ بھرے عذاب کی بشارت سنا دو جس دن تپایا جائے گا چاندی سونے کو جہنم کی آگ پر، پھر داغی جائے گی پیشانی، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھ، یہ وہی ہے جو تم نے جمع کیا تھا اپنے لئے پس لو چکھو عذاب اس کا جو جمع کیا تم نے''۔

انفاس العارفین اور بعض دوسری کتابوں میں شاہ عبدالرحیم کی جس صاف ستھری زندگی کے پڑھنے سے دل کو راحت ملتی ہے اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''ولی اللٰہی حقیقت'' در اصل قدرت کے اس قانون کا مظہر ہے جو کسی شاعر نے کہا ہے:

كـذلك تـنشـأ لينة هـو عـرقها

وحسن نبات الأرض من كرم البذر

شاہ ولی اللہ کی ولادت سے پہلے شاہ عبدالرحیم کو ان کمالات کی بشارت

بلکہ شاہ ولی اللہ نے خود بھی اور دوسروں نے بھی لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے کمالات ومقامات کی بشارت شاہ عبدالرحیم کو پہلے سے مل چکی تھی، ایک واقعہ ''انفاس العارفین'' میں درج ہے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض شاہ ولی اللہ کی ولادت کیلئے شاہ عبدالرحیم نے کسی غیبی اشارہ کے ماتحت ہی ساٹھ سال کی عمر میں دوسری شادی کی تھی، بعض لوگوں کو اس پر اعتراض بھی ہوا کہ:

''دریں عمر کدخدائی مناسب نہ بود'' (اس عمر میں شادی مناسب نہ تھی)۔

شاہ عبدالرحیم نے سن کر فرمایا:

''مدتے دراز از عمر من باقیست وفرزندان بوجود خواہند آمد''۔

(میری عمر کا بڑا حصہ ابھی باقی ہے اور انشاء اللہ چند لڑکے ابھی اور پیدا ہونگے۔)

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس کے بعد والد سترہ سال زندہ رہے اور دو لڑکے حضرت کے تولد ہوئے، جن میں ایک خود شاہ صاحب ہیں، اسی طرح ''انفاس'' ہی میں ہے کہ تہجد کی نماز شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ صاحب کی والدہ پڑھ رہی تھیں، نماز کے بعد شاہ عبدالرحیم نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا اور بیوی صاحبہ سے آمین کہنے کے لئے کہا، دعا ہو رہی تھی اور اس وقت ہو رہی تھی کہ ابھی شاہ ولی اللہ عالم وجود میں نہیں آئے تھے، بہرحال عین دعا کی حالت میں:

''درمیان ایشاناں دو دست دیگر ظاہر شد'' (ان دونوں کے درمیان میں دو ہاتھ اور ظاہر ہوئے۔)

شاہ عبدالرحیم نے فرمایا کہ:

''ایں دو دست فرزند ما اند'' (یہ دونوں ہاتھ ہمارے لڑکے کے ہیں۔)

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ سات سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ نماز تہجد میں ٹھیک اسی شکل کے ساتھ دعا کرنے کا موقع میسر آیا'' وھذا تأویل رؤیای من قبل، قد

جعلها ربی حقاً''، شاہ ولی اللہ جس لئے پیدا ہوئے تھے اس کا اشارہ بچپن ہی میں ان کے والد نے ایک خاص طرز سے فرمادیا تھا، خود ہی لکھتے ہیں:

''ایں فقیر بہ موافقت احباء واقرباء روزے بہ تفرج بہ بستانے رفت، چوں باز آمد حضرت ایشاں فرمودند، اے فلانے دریں شبانہ روز چہ حاصل کردی کہ باتو باقی ماند''۔

''فقیر اپنے دوست احباب اور بعض عزیزوں کے ساتھ ایک دن ایک باغ کی سیر کو گیا جب واپس ہوا تو حضرت (والد) نے فرمایا: اے فلاں رات دن میں تم نے کیا چیز حاصل کی جو تمہارے ساتھ باقی رہے؟

''چہ حاصل کردی باتو باقی ماند'' والد بزرگوار کے سوال کا یہی تیر تھا جو سعادت مند فرزند کے قلب صالح میں جاکر ترازو ہو گیا، اور ایسا ترازو ہوا کہ پھر عمر بھر نہ نکلا۔

خود فرماتے ہیں:

''بجز دایں کلام دل فقیر از تفرج بوستانہا سرد شد، بازمثل ایں داعیہ بوجود نیامد''۔

''بس اتنی بات کے سننے کے ساتھ ہی فقیر کا دل باغوں کے سیر سپاٹے سے سرد ہو گیا، پھر کبھی اس قسم کی خواہش پیدا نہ ہوئی''۔

کل اکسٹھ سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ کا محیر العقول کام

اور واقعہ یہ ہے کہ کل اکسٹھ سال کی عمر میں شاہ ولی اللہؒ نے ''از تو باقی ماند'' والے جو کام کئے ہیں کم از کم ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے، لکھنے پڑھنے کے بعد ''از تو باقی ماند'' کے خدمات کا یہی ذوق تھا جس نے ان کو اس دھارے میں بہتے ہوئے نہ چھوڑا جس میں ان کے ابنائے عصر تقریباً ہر طبقہ کے بہہ رہے تھے، جس کی وجہ کچھ حضرت کے والد کی تربیت تھی، ماسوا اس کے شاہ صاحب فطرتاً ''رسم عام'' کی پابندی سے نفور تھے، حتی کہ ائمہ مجتہدین تک کی تقلید جس پر انہوں نے اپنی مختلف کتابوں میں مختلف حیثیت سے محض خوش اعتقادی کے طور پر نہیں بلکہ تحقیقی نقطہ نظر سے زور دیا ہے، لیکن بایں ہمہ اپنے فطری میلان کا حال بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"وجبلتي تأبى التقليد، وتأنف منه رأساً" (۱)۔

''تقلید سے میری جبلت اور سرشت انکار کرتی ہے اور بالکلیہ اس سے بھڑکتی ہے''۔

مگروہی آپ کی ''نسبت اویسی'' اس فطری میلان کے صحیح استعمال میں کام آئی، خود فرماتے ہیں کہ حضرت رسالت پناہی ﷺ سے مجھے براہ راست جن امور کی وصیت کی گئی (جن میں سے ایک کا ذکر پہلے کر چکا ہوں) ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ:

"التقليد بهذه المذاهب الأربعة لا أخرج منها والتوفيق ما استطعت"۔

''ان چار مذاہب مروجہ کی تقلید سے کبھی باہر قدم نہ رکھوں اور جہاں تک ممکن ہو سب میں تطبیق کی کوشش کروں''۔

پھر شاہ صاحب ترک تقلید کے متعلق اپنے نفسی میلان اور طبعی رجحان کا ذکر کرنے کے بعد اپنی مجبوری کو اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ:

"ولكن طلب مني التعبد به بخلاف نفسي"

''لیکن میں کیا کروں کہ میرے اقتضاء نفسی کے خلاف ان مذاہب اربعہ کی پابندی ہی کا مجھ سے مطالبہ ہے اور اس بارے میں مجھے سرنیاز جھکا دینے ہی کا حکم ہے''۔

آگے چل کر اپنے میلان نفس بسوئے عدم تقلید اور وصیت نبوی در بارہ اختیار تقلید کے اصل راز کے متعلق صرف اتنا فرماتے ہیں کہ:

"وههنا نكتة طويت ذكرها وقد تفطنت بحمد الله بسر هذه الجبلة وهذه الوصاة" (۲)۔

''یہاں ایک باریک راز ہے جس کے ذکر کو میں نے بالقصد قلم انداز کر دیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اپنی فطرت اور آنحضرتؐ کی اس وصیت کے اس راز کو میں نے سمجھ لیا ہے''۔

جب شاہ صاحب نے ہی اس نکتہ کا ذکر نہیں فرمایا تو میں کیا کہہ سکتا ہوں، لیکن اتنی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کے اس فطری میلان اور طبعی رجحان کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کے

(۱) فیوض الحرمین

(۱) فیوض ص ۶۵

سامنے دو چیزیں مسلسل آتی رہیں، جن سے آپ کے معاصرین غافل تھے، سب سوئے ہوئے تھے، لیکن خدا نے آپ کو بیدار رکھا، اسلام اور مسلمانوں کی جو حالت اس ملک میں ہو رہی تھی، اس کے تمام پہلوؤں پر آپ کی نظر پہونچی، دماغ نے مخلصی اور نجات کی راہ ڈھونڈنی شروع کی، یہ ہوسکتا تھا کہ کفر کے اس غلبہ واستیلا اور ارباب حکمت کی خود غرضیوں اور نااہلیوں کو دیکھ کر آپ آستین چڑھا لیتے اور ایک آستین چڑھا کر "الجهاد ثم الجهاد" کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کی کسی جماعت کو اپنے ساتھ لے کر سیاسی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے اور جب دنیا کے نام پر مختلف گوشوں سے مختلف قوتیں اپنے گرد لوگوں کو جمع کر رہی تھیں تو دین کے نام پر نیم مردہ مسلمانوں کو بھی کیوں نہ زندہ کیا جا سکتا تھا، خصوصاً جب ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شاہ صاحب کا خاندانی تعلق جس قبیلہ اور نسل سے تھا، علم وتصوف کے ساتھ اس خاندان کے لوگ فوجی کاروبار میں بھی یگانہ روزگار تھے بلکہ شاہ عبدالرحیم سے پہلے تو شاہ صاحب کے خاندان میں علم وتصوف کی محض ثانوی حیثیت تھی، اصلی کام اس خانوادہ کا جہاد ہی تھا۔

[جملہ معترضہ] شاہ صاحب کے جد امجد شاہ وجیہ الدین کی تاریخی شجاعت

آپ کے براہ راست جد امجد یعنی شیخ وجیہ الدین کے واقعات تو خود شاہ صاحب نے اپنی مختلف کتابوں میں درج کئے ہیں، جن کو سن کر حیرت ہوتی ہے، عالمگیر کی فوج جب شاہ شجاع سے نبرد آزما ہوئی اور شجاع نے ہاتھیوں سے حملہ کیا تو شاہ صاحب کے ان دادا ہی نے گھوڑے پر بیٹھ کر ان زرہ پوش ہاتھیوں پر حملے کئے اور ان کی سونڈ کاٹ ڈالی، نتیجہ یہ ہوا کہ بھگوڑے ہاتھیوں نے شجاع ہی کی فوج کو کچل کے رکھ دیا، ایک اور موقعہ پر مسلسل تین مرد میدان راجپوتوں کو ایک ایک وار سے ختم کیا، یہ تینوں راجپوت حقیقی بھائی تھے، قتل ہونے کے بعد ان کی ماں شیخ وجیہ الدین سے آکر ملی اور اپنا منہ بولا بیٹا بنایا، جسے شاہ وجیہ الدین نے بھی تسلیم کر لیا، شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے تھے کہ:

''من بارہا بخانہ او رفتم، و او را جدہ می گفتم، و وے در شفقت دقیقہ فرو نمی گزاشت بلکہ

من جده خود را ندیده بودم و در صغر نمی دانستم که مرا بجز ایں عجوزه جده دیگر بوده است''۔

''بار ہا میں اس بڑھی کے گھر جاتا تھا، اور اس کو میں دادی دادی کہتا تھا، وہ بھی مہربانی اور شفقت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتی تھی، بلکہ اپنی واقعی دادی کو چونکہ میں نے نہیں دیکھا تھا اس لئے بچپن میں اس بڑھی کے سوا میں اپنی دادی کسی اور کو نہیں جانتا تھا''۔

ایک مشہور بہادر سید شہاب الدین نے آپ سے بدمعاملگی کی، شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ میرے والد نے اسے ایک طمانچہ رسید کیا، جس سے وہ بے ہوش ہوکر گر گیا، بہرحال شیخ وجیہ الدین کا مدت العمر مشغلہ یہی فوجی خدمت تھی، اگرچہ آخر عمر میں نوکری چھوڑ دی تھی، لیکن بڑھاپے میں پھر گھوڑا خرید کر جہاد کیلئے دکن روانہ ہوئے اور راہ میں شہادت میسر آئی، بیان کیا جاتا ہے کہ جسم پر بائیس گہرے زخم تھے، سر کٹ جانے کے بعد بھی ایک غلیل کی زد تک آپ کی بے سر لاش دشمن کا تعاقب کرتی رہی، تقریباً یہی حال شاہ ولی اللہ نے اپنے پردادا معظم کا لکھا ہے اور پشت ہا پشت تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان فوجی مہمات میں نام آور اور دیدہ ور رہا ہے، شاہ ولی اللہ خود اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''ایشاں باخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت وفراست وکفایت وغیرت بوجہ اتم متصف بودند''۔

''حضرت دیگر اخلاق سلیمہ پسندیدہ کے ساتھ شجاعت، بہادری اور غیرت وغیرہ صفات سے بوجہ اتم موصوف تھے''۔

اگرچہ شاہ عبدالرحیم صاحب کو فوجی خدمت انجام دینے کا کوئی موقعہ اپنے اسلاف کے مطابق نہ ملا لیکن اس فقرہ سے ان کی شجاعت اور بہادری کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، (۱) اور

(۱) سیرت سید احمد شہید کے مقدمہ میں علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ نے شاہ عبدالرحیم صاحب ہی کے تذکرہ میں ارقام فرمایا ہے کہ:

''شاہ عبدالرحیم کے مجاہدانہ جذبات کا پتہ ان کے خطوط سے ملتا ہے، ان کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے کتب خانہ میں میری نظر سے گزرا ہے، اس میں ان کا خط نظام الملک آصف جاہ اول کے نام ہے جس میں انہوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کی ترغیب دی ہے۔ (مولانا منظور نعمانی)

خود شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق تو مشہور ہی ہے کہ ترجمہ قرآن کی بنیاد پر دلی کے بعض پرانے خیال کے مولویوں نے جب آپ سے اختلاف کیا اور اختلاف کو اس حد تک پہونچا دیا کہ عوام میں کافی بدظنی وبرہمی پیدا ہوئی، اسی سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ فتح پوری کی مسجد میں تقریباً سوسوا سولچوں اور بدمعاشوں کو لے کر بعض ملاؤں نے آپ کو گھیر لیا، شاہ صاحب کے ساتھ صرف چند رفقاء اور آپ کے ہاتھ میں صرف ایک پتلی لکڑی تھی، اس لکڑی کو لے کر اس خونی مجمع میں جو باضابطہ تلواروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح تھا:

''غیر معمولی جوش کی حالت میں اللہ اکبر کا ایک نعرہ مارا اور اس جماعت کو چیرتے پھاڑتے نکلے چلے گئے''۔(۱)۔

یوں بھی شاہ صاحب کو سیاسی مسائل اور حکومتی نظامات کے متعلق جو دلچسپی تھی، اس کا اندازہ ان کی مختلف کتابوں مثلا ازالۃ الخفا اور حجۃ اللہ وغیرہ کے سیاسی مباحث سے ہوتا ہے، سیاسیات میں ان کی رائے کتنی عمیق اور دوررس ہے، افسوس ہے کہ اس کے لئے مستقل مضمون کی ضرورت ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں، شاہ صاحب کی عام متداول کتابوں میں اس کا کافی مواد موجود ہے، کوئی چاہے تو ان کو موجودہ اصلاحات اور تعبیروں کے قالب میں ڈھال کر بیان کرسکتا ہے، ممکن ہے کہ اگر فرصت ہمدست ہوئی تو شاید اس کام کو میں ہی کبھی انجام دوں، بالفعل صرف ان کی طرف اشارہ کرکے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ باوجود ایسے ماحول اور اسباب کے شاہ صاحب نے سنائی اور سیفی مجاہدہ کی راہ کیوں اختیار نہیں کی (۲)، یہ تو قطعاً غلط ہے کہ وہ اس مسئلہ کے متعلق جس پر ''ماض إلى يوم القيامة'' (یعنی جہاد کا قانون قیامت تک کے لئے نافذ ہے) کی مہر نبوت کندہ ہے، اس قانون کو شاہ صاحب خدانخواستہ کسی خاص زمانہ تک

(۱) حیات طیبہ

(۲) حضرت شاہ صاحب نے تفہیمات الٰہیہ میں ایک جگہ ''جہاد بالسیف'' کے بارے میں بھی اپنی قابلیت کو خود ہی بیان فرمایا ہے، ملاحظہ ہو تفہیمات (ص ۱۰۷ ج ۱) اور وہیں سے یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ آپ نے یہ راہ کیوں اختیار نہیں کی۔ (مولانا منظور نعمانی)

محدود سمجھتے تھے، بلکہ اپنے اجداد کے حالات کو درج فرماتے ہوئے جہاں اپنے جد امجد کی بہادری کے واقعات لکھنے لگے ہیں، تو اس سے پہلے آپ نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ:

''چندے ازیں باب دریں کتاب می نویسم کہ تنبیہے باشد اہل ایں خاندان را''۔

''چند واقعات میں اسی لئے اس کتاب میں درج کرتا ہوں تا کہ اس خاندان کے لئے وہ بیداری کا پیغام اور سبب ہوں''۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ دوسری ہی پشت میں حضرت شاہ صاحب کے گھرانے سے جو وہ مرد غازی مولانا اسمٰعیل شہید اٹھے اور ایک مدت تک بجائے قلم کے تلوار کو کمر سے لگائے رکھا تا ایں کہ اسی راہ میں بالآخر جان عزیز بھی نذر کی، یہ شاہ صاحب کی کسی اندرونی تربیت کا نتیجہ نہ تھا، جس کا رواج ان کے خاندان میں چلا آ رہا تھا۔

خلافت ظاہرہ اور خلافت باطنہ

باوجود ان تمام باتوں کے پھر بھی میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ شاہ صاحب نے آخر یہ راہ خود کیوں اختیار نہیں فرمائی، مجھے اب تک ان کے کلام میں کوئی چیز صراحۃً نہیں ملی ہے، آئندہ اگر کوئی چیز ہاتھ آئی تو انشاء اللہ پیش کی جائے گی، بالفعل ان کے مسلک کے متعلق اس بات میں جن وجوہ تک پہونچ سکا ہوں انہیں درج کرتا ہوں، ''فیوض الحرمین'' میں شاہ صاحب نے ''تحقیق شریف'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے اگر چہ کچھ طویل ہے لیکن جب تک پورا مضمون نقل نہ کیا جائے، مطلب سمجھ میں نہیں آ سکتا، میرے نزدیک شاہ صاحب نے اس مضمون میں خدمت دین کا جذبہ رکھنے والوں کیلئے خاص ایسے وقت کے واسطے جب کہ کسی وجہ سے اعلاء کلمۃ الحق کے لئے ''جہاد بالسیف'' کا امکان نہ ہو کام کا پورا پروگرام پیش کر دیا ہے، ارقام فرماتے ہیں:

''للأمة المرحومة أسوة حسنة برسولها ﷺ، لأصحاب الخلافة الظاهرة أعنی المعتنين بإقامة الحدود واعداد أدوات الجهاد وسد الثغور واجازة الوفود

وجباية الصدقات والخراج وتفريقها على مستحقيها وفصل الأقضية والنظر فی اليتامىٰ وأوقاف المسلمين وطرقهم ومساجدهم وأشباه هذه الأمور، فمن كان مشتغلاً بهذه الأمور نسمية بالخلافة الظاهرة، لهم أسوة حسنة برسول الله ﷺ فيما سنّ فی هذا الباب بالتفصيل المذكور فی كتب الحديث، ولأصحاب الخلافة الباطنة أعنی المعتنين بتعليم الشرائع والقرآن والسنن والآمرين بالمعروف والناهين عن المنكر والذين يتصل بكلامهم نصرة الدين أما بالمجادلة كالمتكلمين أو بالموعظة كخطباء الإسلام أو بصحبتهم كمشائخ الصوفية والذين يقيمون الصلاة والحج والذين يدلون على طريق اكتساب الإحسان والمرغبون فی النسك والزهد، والقائمون بهذا الأمر هم الذين نسميهم بالخلفاء الباطنين، لهم أسوة حسنة برسول الله ﷺ فيما سنّ من هذا الباب بالتفصيل المذكور فی كتب الحديث''.

''رسول اللہ ﷺ کی زندگی امت مرحومہ کے لئے اسوہ اور نمونہ ہے''۔

پھر اس نمونہ کی تقسیم یوں کرتے ہیں:

''ظاہری خلافت والے یعنی جو شرعی حدود اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری اور سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی وحفاظت اور وفود کو اکرام وانعام دینے کی خدمت اور صدقات، محصول، مالگذاری وغیرہ کی وصولی پھر ارباب استحقاق پر ان کی تقسیم، مقدمات کے فیصلے، یتیموں کی نگرانی، مسلمانوں کے اوقاف کے انتظام، نیز راستوں، سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر اور اسی قسم کے اور کاموں کیلئے مقرر ہیں، غرض مسلمانوں میں جو ان خدمات اور مشاغل میں مصروف ہیں انہیں کو میں خلافت ظاہری والوں کے نام سے موسوم کرتا ہوں، ان لوگوں کے لئے رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں بہترین نمونے ہیں جنہیں حضور ﷺ نے ان امور کے متعلق جاری فرمایا، اور حدیث کی کتابوں میں جن کی تفصیل مذکور ہے، اور جو لوگ باطنی خلافت والے ہیں یعنی جو اس کام پر مقرر ہیں کہ شرائع اور قوانین اسلامی، قرآن اور سنن وآثار کی تعلیم دیں اور معروف یعنی اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم دیں، بری اور منکر باتوں سے روکیں، اسی طرح وہ لوگ جن کے کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے خواہ مناظرہ اور مباحثہ کی

راہ سے جیسا کہ متکلمین اسلام کا حال ہے یا وعظ و پند کے طریقہ سے جیسا کہ اسلام کے مقررین اور خطباء جس خدمت کو انجام دیتے ہیں یا وہ لوگ جو اپنی صحبت اور توجہ و ہمت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں، جیسا کہ صوفیہ کا حال ہے، اسی طرح جو نمازیں قائم کرتے ہیں، حج کراتے ہیں، اور جو احسان (دوام حضور) کے حصول کی راہ لوگوں کو بتاتے ہیں اور زہد و تقوی کی طرف لوگوں کو راغب کرتے ہیں بہر حال جو لوگ ان دینی خدمات کو انجام دیتے ہیں، ان ہی لوگوں کو ہم خلفاء باطنی کے نام سے موسوم کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ان لوگوں کیلئے بھی بہترین نمونے ہیں، یعنی اس باب میں آنحضرت ﷺ نے جو طریقہ عمل اختیار فرمایا اور حدیث کی کتابوں میں جس کی پوری تفصیل موجود ہے"۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے خلافت کی دونوں صورتوں اور ان کے لوازم و آثار سے بحث کی ہے، جس کے درج کرنے کی سر دست ضرورت نہیں ہے۔

شاہ صاحب کی مذکورہ بالا عبارت ہی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نیابت و نمائندگی اور "خلافت" کا انحصار محض سیاسی اقتدار کے مظاہر کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ حضور ﷺ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جو نمائندگی کرتے ہیں، ان کو "خلافت" کا ایک حصہ ملا ہے، جیسے سیاسی اقتدار رکھنے والوں اور حکومتی خدمات انجام دینے والوں کو بھی اس کا ایک ہی شعبہ ملتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک قدرت نے جس کسی کو جس قسم کی خلافت اور نیابت نبوت کے مظہر بننے کا موقعہ عطا فرمایا ہے وہ اسی اعتبار سے آنحضرت ﷺ کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھ کر اپنے کاروبار کی تنظیم کرے، اور اسی شعبہ کے اسوۂ نبی کو شمع راہ بنا کر اپنے فرائض خلافت کو انجام دے، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ اسلام نے امراء کو بھی مخاطب کیا ہے اور غرباء کو بھی، تندرستوں کو بھی اور بیماروں کو بھی، احرار کو بھی اور عباد و اماء کو بھی، ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان سب کے فرائض بالکل یکساں ہیں بلکہ امراء جنہیں قدرت نے مال و دولت عطا کی ہے ان ہی کے ساتھ ان احکام کا تعلق ہے جو مالیات سے متعلق ہیں، اور جو صحت کی دولت سے سرفراز ہیں ان ہی تک وہ احکام محدود رہیں گے جن کی ادائیگی

صحت کے ساتھ مشروط ہے پس اس طرح گو قرآن نے ہر قسم کے احکام کی تبلیغ کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی جامع زندگی سے تقریباً ہر حکم کے متعلق تشریح کے نمونے پیش فرمائے ہیں لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کے ہر حکم اور آنحضرت ﷺ کے ہر نمونہ کی اتباع پر مسلمان مساوی طور پر مجبور کیا گیا ہے بلکہ جو خوش بخت خلافت ظاہرہ کے اسباب وادوات سے سرفراز ہیں وہ اس بات میں مکلّف ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے طرز حکومت اور طریقۂ سیاست کو اختیار کریں اور اس کو دنیا میں سر بلند کرنے کے لئے تدابیر عمل میں لائیں، علی ہذا جس کو خلافت باطنہ کا جو حصہ عطا ہوا ہے وہ اسی پہلو میں آنحضرت ﷺ کی اتباع کرے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ "تفہیمات الٰہیہ" میں شاہ صاحب نے اپنے جس طویل خطاب سے مسلمانوں کو مخاطب فرمایا ہے (جس کا ترجمہ پہلے کر چکا ہوں) اس میں آپ نے مسلمانوں کے مختلف طبقات کو الگ الگ کر کے پکارا ہے، اور بجائے اس کے کہ ہر مسلمان پر اس عام دعوت کو پیش فرماتے خصوصیت کے ساتھ ملوک اسلام کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

"أيها الملوك! المرضى عند الملأ الأعلى فى هذا الزمان أن تسلوا السيوف ثم لا تغمدوها حتى يجعل الله فرقاناً بين المسلمين والمشركين، وحتى يلحق مردة الكفار والفساق بضعفائهم لا يستطيعون لأنفسهم شيئاً وهو قوله تعالى: وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله".

"بادشاہو! ملاء اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں تمہارے متعلق یہ ہے کہ تلواریں سونت لو، پھر انہیں نیام میں نہ کرو جب تک اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مشرکوں سے بالکل جدا نہ فرمادے اور کفار کے سرکش افراد نیز فساق کمزوروں میں جا کر شریک نہ ہو جائیں، اور خود اپنے لئے ان میں کچھ کرنے کی سکت باقی نہ رہے، یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا جنگ کرو کافروں سے اس حد تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور "دین" (قانون) صرف اللہ کے لئے مختص ہو کر رہ جائے"۔

الغرض خصوصیت کے ساتھ بجائے عام مسلمانوں کے اس خطاب میں شاہ صاحب نے ملوک یعنی ان ہی لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے سیاسی اقتدار اور عسکری

قوت کے مالک ہیں، پھر آپ نے ان کو صرف اس ''سلبی کام'' ہی کا مخاطب نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے بعد حکومت کے ایجابی احکام کا مکلّف بھی ان ہی کو قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

"فإذا ظهر الفرقان، فرضا الملأ الأعلى أن تنصبوا فى كل ناحية وفى كل سيرة ثلثة أيام وأربعة أيام أميراً عادلاً يأخذ للمظلوم حقه من الظالم، ويقيم الحدود، ويجتهد أن لا يحصل فيهم بغى ولا قتال ولا ارتداد ولا كبيرة، ويفشو الإسلام وتظهر شعائره، ويأخذ بفرائضه كل أحد ويكون لأمير كل بلد شوكة يقدر بها على إصلاح بلده، ولا يكن له شوكة يتمتع بسببها ويطغى على السلطان وينصب فى كل إقليم كبير أميراً يقلده القتال فقط، يكون جمعه اثنا عشر ألفاً من المجاهدين، لا يخافون فى الله لومة لائم، يقاتلون كل باغ وعاد، فإذا كان ذلك فرضا الملأ الأعلى أن يفتش حينئذ من النظامات المنزلية والعقود ونحوه حتى لا يكون شئ إلا موافق الشرع حتى يأمن الناس من كل وجه"(۱)۔

''جب مسلم وکافر میں اس طرح جدائی پیدا ہولے تو اس کے بعد ملأ اعلی کی رضا یہ ہے کہ تم اے بادشاہ ہو! ہر علاقہ اور تین دن یا چار دن کی ہر مسافت پر ایک صاحب عدل امیر کو مقرر کرو، جو ظالم سے مظلوم کا حق لے سکتا ہو اور شرعی حدود قائم کرسکتا ہو، اور اس کی کوشش کرے کہ ان کی طرف سے پھر سرکشی اور فساد پیدا نہ ہو اور ارتداد اور کبیرہ کا ارتکاب نہ کرسکیں، اسلام بالکل فاش اور علانیہ ہوجائے، اس کے شعائر کھلم کھلا ظاہر ہوں اور اپنے منصبی فرائض کو ہر شخص اختیار کرلے، چاہئے کہ ہر شہر کے امیر کے پاس اتنی قوت وشوکت ہو جس کے ذریعہ سے اپنے شہر کی اصلاح پر وہ قابو پاسکے، مگر اتنی شوکت وقوت اس کے پاس نہ ہو کہ ان سے خود نفع اٹھانے لگے اور بادشاہ وقت سے سرکشی کرنے لگے، چاہیے کہ ہر اقلیم (صوبہ) میں ایک بڑا امیر بھی مقرر ہو جس کے ذمہ فقط جنگ کی ذمہ داری عائد کی جائے، چاہیے کہ اس کی فوجی جمعیت ایسے بارہ ہزار مجاہدوں کی ہو جو اللہ کی راہ میں کسی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوں اور ہر سرکش باغی سے جنگ کرسکتے ہوں، جب یہ ہوچکے تب چاہیے کہ منزلی نظامات (اور معاشرتی قوانین) اور عقود ومعاملات کی جانچ پڑتال کی جائے اور اسی قسم کی دوسری باتوں کی، (پھر ایسی صورت اختیار کی جائے) کہ کوئی بات ایسی باقی نہ رہ سکے جو شریعت کے مطابق نہ ہو، تا

(۱) تفہیمات الٰہیہ ج ۱ ص ۲۱۶)

کہ لوگ ہر لحاظ سے امن وعافیت کی زندگی بسر کرنے لگیں''۔

اس قسم کے خاص خاص خطابات اور مخصوص دعوات کا ذکر شاہ صاحب کے کلام میں دوسرے مقامات پر بھی ملتا ہے، لیکن میں سردست اسی پر اکتفا کرتا ہوں، شاہ صاحب کا اس کے بعد جو مسلک منقح ہوتا ہے میں اب ان کی اس سے زیادہ تصریح نہیں کرنا چاہتا اور نہ اب مزید کی ضرورت ہے۔

سیاست اور اسلام کا واقعی تعلق شاہ صاحب کی نظر میں

آج جب دنیا کا ہر طبقہ ایک قسم کے سیاسی بحران میں مبتلا ہے اور انسانیت کے اول وآخر، ظاہر وباطن میں اب بجز سیاست کے اور کچھ نہیں رہ گیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ پیدا ہوگیا ہے جو اسلام کو صرف ''سیاست'' اور سیاست کو صرف ''اسلام'' قرار دینے پر مصر ہے، گویا ان کے غلاۃ کے نزدیک ہر شخص کے اسلام وایمان، دینی خدمات کی بھلائی وبرائی کا سارا دارومدار اسی پر رہ گیا ہے، ان کے خیال میں اب ''خیر'' بلکہ ایمان بھی صرف اس میں ہے جو موجودہ سیاسی قصوں میں اپنا کچھ نہ کچھ پارٹ ادا کرتا ہو، اور جو بیچارے کسی وجہ سے (اگرچہ آج کل کی سیاست کی گندگی ہی کی وجہ سے) ان ''سیاسی مشاغل'' سے محروم ہیں خواہ دوسرے نقطۂ نظر سے یعنی شاہ ولی اللہ کی اصطلاح میں خلافت باطنیہ کی راہ سے آنحضرت ﷺ کے اسوہ حسنہ کے بہترین نمونے کیوں نہ پیش کرتے ہوں، وہ بزدل، ناکارہ اور بعضوں کے نزدیک تو مخذول ومردود ہیں، بلکہ ان کی موت بھی ان کے خیال میں جاہلیت کی موت ہے اور ان کی زندگی بھی جاہلیت کی زندگی ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ ارباب سیاست کا یہ اجتہاد واقعی اسلامی نصوص ونبوی آثار وسنن اور فقہاءِ اسلام کے مجتہدات پر کس حد تک منطبق ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کا نقطۂ نظر جیسا کہ ان کی مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے اس باب میں جو ہے اس کو دیکھ کر کیا یہ حضرات اپنے اس طرز عمل میں کچھ تغیر فرماسکتے ہیں؟

اسی طرح جولوگ ہندوستان یا بیرون ہند کی بعض بچی کھچی ملوکی اور سیاسی قوتوں کے بالکل استیصال یا "فك كل نظام" کا مشورہ محض اس لئے دے رہے ہیں کہ ان کے یہاں مغربی نظامات اور عقود و معاملات یا دوسرے لفظوں میں بعض معاشرتی اور معاشی قوانین ایسے مروج ہیں جو شریعت اسلامیہ کے دفعات پر منطبق نہیں ہیں، اگر چہ زیادہ تر ان مشوروں کا محرک اس زمانہ میں شریعت کا درد نہیں بلکہ مغربی مکاتب خیال میں سے کسی مکتب خیال کے تاثر وانفعال کا یہ نتیجہ ہے، خواہ اس تاثر کا دماغوں کو شعور ہو یا نہ ہو، تاہم یہ مان بھی لیا جائے کہ ''انقلاب'' ''بالکل انقلاب'' کے ان نقیبوں کی چیخ وپکار کے پیچھے شریعت محمدیہ ہی کا درد اور اسی کے اعتلاء کا صادق جذبہ کارفرما ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب نے دعوت کی جو ترتیب پیش کی ہے اور یہی آنحضرت ﷺ کے طرز عمل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے عیسائی بادشاہوں اور مجوسی ملوک وعظماء کو شروع ہی میں شریعت کے منزل نظامات اور عقود و معاملات کی پابندی کی دعوت نہیں دی اور نہ ان کے جمہوری یا شخصی نظامات حکومت کی تبدیلی کا ابتداً مطالبہ کیا، بلکہ آپ کی اول دعوت توحید اور اسلام تھی، یقیناً حضور ﷺ کا یہی نقطہ نظر تھا کہ اگر وہ اسلام کو قبول کریں گے تو ان کی زمین، جائیداد، اموال وخراج سے فوری طور پر کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، البتہ بتدریج ان کے معاشرتی اور معاشی مقاصد کی اصلاح کی جائے گی، آخر نجاشی ابی سینیا کا عیسائی باشندہ، جیسا کہ کہا جاتا ہے، مسلمان ہو گیا تھا، آنحضرت ﷺ نے اس کے ساتھ جو طرز عمل اختیار فرمایا تھا، کیا اس میں ہمارے لئے کوئی اسوۂ حسنہ نہیں ہے؟ کیسی عجیب بات ہے کہ آج جن علاقوں میں مسلمانوں کی تھوڑی بہت سیاسی قوت خواہ وہ کسی حال میں باقی ہے، مسلمانوں کو ان کے متعلق مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان حکومتوں کے بعض معاشرتی اور معاشی قوانین چونکہ شرعی قوانین سے مختلف ہیں، اس لئے چاہیے کہ ان کا تختہ الٹ دیا جائے اور کوئی مسلمان ان کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی نہ رکھے، ان کا وجود وعدم برابر ہے اور پھر اسلام کے ان احکام واوامر جن کی تعمیل کیلئے خلافت ظاہرہ یا سیاسی قوت کی ضرورت ہے، پر عمل پیرا ہونے کا مطالبہ

ان غریب مسلمانوں سے کیا جائے جو بے چارے قدرتاً ان کی سرانجامی سے مجبور ہیں، گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ امراء چونکہ اپنے اموال شرعی طریقوں پر خرچ نہیں کرتے، اس لئے بجائے اس کے کہ ان کو شرعی طریقوں کی پابندی کی دعوت دی جائے، یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان کو بھی غریب بنا دیا جائے، اور پھر زکاۃ اور عشر وصدقات کے ٹیکس عائد کئے جائیں۔

اس باب کی ایک اور غلطی پر انتباہ

ایسے ہی میرے خیال میں جو لوگ آج کل یہ تعبیر پھیلا رہے ہیں کہ اسلام صرف حاکموں کا مذہب ہے، محکوم ہو کر زندہ رہنے کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے اور دلیل میں اسلام کے ان قوانین واوامر کو پیش کرتے ہیں، جو بغیر حکومت کی قوت کے سرانجام نہیں پا سکتے، ان کی مثال ایسی ہے کہ زکوٰۃ وعشر کے احکام دکھا کر اعلان کر دیا جائے کہ غریب ہو کر جینے کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں، یا روزہ حج وغیرہ کے فرائض کو دیکھ کر دعویٰ کر دیا جائے کہ بیماروں، اپاہجوں کے وجود کا اسلام روادار نہیں کیونکہ غریب اسلام کے اہم احکام مثلاً "آتوا الزكوة" کی اور بیمار "فليصمه" یا "لله على الناس حج البيت" کی تعمیل نہیں کر سکتا، میرا ہرگز اس سے یہ منشاء نہیں ہے کہ اسلام کو محکومی مطلوب ہے یا حکومت واقتدار کو اسلامی نظام میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے، نیز یہ بھی میرا مطلب نہیں ہے کہ جو مسلمان ''امراء'' اسلامی و دولی نظام اور اسلامی احکام کے پابند نہیں ہیں، ان کے اس حال کی اصلاح کی بھی ضرورت نہیں ہے، بلکہ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ دوسرے معاملات کی طرح ان چیزوں میں بھی غلو نہ کیا جائے اور مغربی احوال وتحریکات سے متاثر ہونے اور ان کے طریق کا اتباع کرنے کے بجائے ''اسوۂ حسنۂ نبوی'' ہی کو ان کاموں میں بھی شمع راہ بنایا جائے، میں یہاں ان معاملات میں اپنی کوئی خاص رائے پیش نہیں کر رہا ہوں، اور سچی بات یہ ہے کہ ان امور میں کسی رائے کے قائم کرنے کا مجھے مقام بھی حاصل نہیں، بلکہ میں تو حضرت شاہ صاحبؒ کے کلام سے جو بات سمجھ میں آ رہی

ہے، صرف بطور تشریح اس کا اظہار کر رہا ہوں، اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ اب تک اس کے خلاف مجھے ان کی کتابوں میں کوئی دوسری چیز نہیں ملی ہے اور خود آپ کی زندگی میں بھی اس کے سوا کسی دوسرے پہلو کی شہادت نہیں ملتی، ممکن ہے کہ یہ میرے محدود معلومات اور قلت فکر ونظر کا نتیجہ ہو، لیکن میں اب تک یہی سمجھے ہوئے ہوں کہ ''اسوۂ حسنہ نبوت کبریٰ'' کی پیروی کو شاہ صاحب صرف ''خلافت ظاہرہ'' اور اسکے مظاہر وآثار کے ساتھ وابستہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسی کے ساتھ ان کے نزدیک اسوۂ حسنہ کی پیروی کی ایک دوسری راہ ''خلافت باطنہ'' کے ذریعہ سے بھی تھی، اور انہوں نے اپنے گردوپیش کے واقعات، اپنے ماحول، خود اپنی اندرونی اور بیرونی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کرکے بجائے ''خلافت ظاہرہ'' کے میدان میں اترنے کے ''خلافت باطنہ'' ہی کی راہ سے اسوۂ حسنہ کی پیروی کے امکانات اپنے لئے پیدا کئے، اور ان ہی طریقوں سے اپنی وسعت وطاقت کی حد تک وہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کیلئے آستین چڑھا کر حق تعالیٰ کی غیبی نصرتوں کے بھروسہ پر تیار ہوگئے، پھر اس سلسلہ میں ان کے متوازن دماغ اور معتدل مزاج نے اس کی اجازت نہیں دی کہ خلافت باطنہ کے جتنے شعبے ابتداء تاریخ اسلام سے ان کے زمانہ تک کھلے ہوئے تھے اور جن میں سے ہر ایک کا اسوہ ''حقیقت جامعہ محمدیہ'' (علی صاحبہا ألف سلام وتحیۃ) میں پایا جاتا تھا، ان میں سے کسی شعبہ کی واقعی قدر وقیمت کا انہوں نے انکار کیا ہو اور جیسا کہ عموماً ہر طبقہ کے غلاۃ اور تشدد پسندوں کا عام شیوہ ہے کہ اپنے دہی کے سوا ہر ایک کے دوغ کی ترشی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں، متکلم، صوفی کو خشک دماغ، مبتلائے مالیخولیا قرار دیتا ہے، صوفی متکلم کو حقائق واسرار کی دنیا سے اندھا ومحروم ٹھہراتا ہے، فقیہ، محدث پر تیوریاں چڑھاتا ہے، ایسے ہی محدث، فقیہ پر تنگ نظری اور تقلید جامد کا الزام لگاتا ہے، مگر حضرت شاہ صاحب سب کی تصحیح فرماتے ہیں، ہر ایک کو آنحضرت ﷺ کی باطنی خلافت کا حصہ دار سمجھتے ہیں۔

شاہ صاحب کی جامعیت

اور یہ شاہ صاحب کی ''اسی جامعیت'' اور ہمہ گیر فطرت کا ثمرہ ہے جو خدائے بخشندہ

نے ان کو بخشی تھی جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے یعنی:

''هيهات هذه المناقضات مني لولا أن شدة الجامعية أو قعتني في ذلك''(۱)۔

''اوہ! کہ میری فطرت میں یہ متضاد ومتناقض امور پائے جاتے ہیں لیکن کیا کروں میری ہمہ گیر جامعیت نے مجھے اس حال میں مبتلا کیا ہے''۔

شاہ عبدالرحیم کی جامعیت

غالباً یہ ہر جہتی مناسبت شاہ صاحب کو اپنے والد سے ترکہ میں ملی تھی، ''انفاس العارفین'' میں ایک موقعہ پر حضرت شاہ عبدالرحیم کے متعلق ارقام فرماتے ہیں:

''از علم بہرہ معتد بہ داشتند، و بہ ترک مناسبت بفنے از فنون طبع ایشاں رضا نمی داد''(۲)۔

''ہر علم سے کافی مقدار کے حصہ دار تھے، اور فنون میں سے کسی فن کے متعلق مناسبت ترک کرنے پر آپ کی طبیعت راضی نہ تھی''۔

شاہ عبدالعزیز کی جامعیت

سنا جاتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ تک جامعیت کا یہ ذوق اس خاندان میں باقی رہا، ملفوظات عزیزیہ کے جامع نے تو براہ راست شاہ عبدالعزیزؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک کتاب کا ذکر ہو رہا تھا، اس وقت حضرت نے ارشاد فرمایا:

''علمے کہ دیدہ ام و یاد ہم بقدر خود دارم یک صد و پنجاہ علم است''

''جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور اپنی وسعت بھر مجھے یاد بھی ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے''۔

پھر اس میں دینی علوم کی خصوصیت نہ تھی، خود شاہ صاحب کی زبانی اس کی تشریح منقول ہے کہ:

---

(۱) فیوض الحرمین

(۲) ص۴۴

''نصف آں مردمان سابق ونصفش دریں امت تصنیف شدہ''۔

''ان علوم میں سے آدھے تو ایسے علوم ہیں جو گزشتہ امتوں اور قوموں میں پیدا ہوئے اورنصف وہ ہیں جو اسلامی امت کی تصنیف ہیں''۔

طلب علم کا دائرہ کتنا وسیع تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے جو جامع ملفوظات نے نقل کیا ہے، یعنی حسب دستور شاہ صاحب پیادہ پا ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے، کسی مکان سے گانے کی آواز آرہی تھی، فرمایا ''دھنا سری'' ہے، (یہ ہندی راگ کی کوئی قسم ہے)، آگے ایمن ملتانی وغیرہ راگوں اور گیتوں کا ذکر فرماتے جاتے تھے، اور آخر میں ارشا ہوا کہ:

''سابق مرا دریں فن دخلے بسیار بود، چنانچہ ناموران ایں فن برائے تحقیق می آمدند، حالانکہ موقوف کردم لیکن می آئند، حالا مرا ضرر می کند، قلب جوش می کند وبعد ازاں مرض ہم حائل گرد''۔

''پچھلے دنوں میں اس فن (موسیقی) میں مجھے بڑا دخل تھا، چنانچہ اس فن کے نامور لوگ اس فن کے مسائل کی تحقیق کیلئے میرے پاس آتے تھے، لیکن اب میں نے اس سلسلہ کو موقوف کردیا ہے مگر پھر بھی لوگ میرے پاس آتے ہیں، مگر اب مجھے اس کا اشتغال ضرر پہنچاتا ہے، یعنی دل میں جوش پیدا ہوجاتا ہے اوراس کے بعد بیماری بھی حائل ہوجاتی ہے''۔(۱)

---

(۱) غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ شاہ صاحب اپنی زندگی کے کسی دور میں العیاذ باللہ ان مکروہات شرعیہ میں مبتلا تھے، ملفوظات میں ہے کہ کسی نے دریافت کیا، ''میل حرام گاہے فرمودہ اند'' (کیا حضرت نے اس ناجائز عمل کی طرف توجہ فرمائی ہے؟) جواب میں ارشاد فرمایا گیا: ''آرے دوبار آنچہ بود کہ در جوانی شنیدم کہ قصہ خوانے خوش گو آمدہ است، بہ ترغیب احباء قصد کردم، ناگاہ آواز مزامیر ورقص در گوش رسید، خواستم کہ زیر دیوار نشستہ شنیدہ راہی مقصد شوم، بہ مجرد نشستن خواب غلبہ کرد، چوں چشم باز کردم صبح بود، باز دگر ہمیں ماجرا پیش آمد (البتہ ایک بار ایسا ہوا کہ جوانی میں میں نے سنا کہ ایک خوش الحان گویا آیا ہوا ہے، احباب ورفقاء کی ترغیب پر حاضری کا قصد کیا، اچانک کان میں مزامیر کی (باجہ) اور رقص کی آواز آئی، چاہا کہ دیوار کے نیچے بیٹھ کر ہی سن لوں تاکہ آنے کا مقصد پورا ہوجائے، بیٹھتے ہی نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ جب آنکھ کھلی تو صبح ہوچکی تھی، دوسری بار بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا)۔ص ۹۹

اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ رقص وسرود کی مجلس میں نہیں بلکہ سرود ہمسایہ کے طور پر بھی آپ......

غرض ''ایں خانہ تمام آفتاب است'' کا مصداق فضل وعلم کا یہ گھرانہ بنا رہا ہے، سچ یہ ہے کہ اس کی نظیر ہند میں کیا، بیرون ہند کی اسلامی دنیا میں بھی مشکل سے میسر سے آسکتی ہے، طوالت جواب حد سے زیادہ متجاوز ہورہی ہے اس کا خوف نہ ہوتا تو کچھ دوسروں کا بھی اس سلسلہ میں ذکر کرتا۔

بہرحال میں گفتگو شاہ صاحب کے توازن صادق اور اعتدال صحیح کے متعلق کر رہا تھا کہ اسی کی بدولت اسلام کے علمی ودینی خادموں کے ہر طبقہ کی صحیح قیمت وہ پہچان سکے، دوسروں کی طرح انہوں نے اپنے طبقہ کے سوا اوروں کو ناکارہ نہیں ٹھہرایا، ان کے نزدیک فقیہ وصوفی اور محدث ومتکلم سب کے سب آنحضرت ﷺ کے باطنی خلفاء ہیں، البتہ اسی کے ساتھ ''طول آمد'' کی وجہ سے قدرتاً دلوں میں جو ایک قسم کی بے حرمتی یا قساوت پیدا ہوجاتی ہے، اس نے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے اسلامی خطوں میں بھی ہر شعبہ کو ''اسوۂ حسنہ'' کے حدود سے بہت آگے نکال دیا تھا اور اس کی شکایت شاہ صاحب کو ہر طبقہ سے ہے جس کی کچھ مثالیں میں اوپر بیان کرآیا ہوں۔

علماء دین میں شاہ ولی اللہ کی امتیازی شان اور آپ کے خاص کارنامے

اب تک میں جو کچھ لکھ چکا ہوں، ان میں متفرق ومنتشر امور نے میرے دل میں اس

......اس میں شریک نہ ہوئے، اسی ملفوظ سے پہلے شاہ صاحب کا ایک فتویٰ یہ بھی ہے: ''از وقت شباب از رقص وغیرہ ممنوعات نفرت طبعی داشتم'' (جوانی سے ہی رقص اور دیگر ممنوعات سے مجھے نفرت طبعی ہے۔) ص ۹۹۔

لہذا مطلب یہ ہے کہ فن موسیقی کو شاہ صاحب علمی طور پر جانتے ہیں۔

وہابیت کے سلسلہ میں علماء کو جو غلط فہمی تھی شاید اسی کے زیر اثر اس قسم کی تحریریں ان کے قلم سے نکلی ہیں، حضرت مصنف کو بھی شاید یہاں یہی مغالطہ ہوا، اب دلائل کی روشنی میں ان الزامات کی تردید ہوچکی ہے، تفصیل کے لئے مولانا مسعود عالم ندویؒ کی کتاب ''محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔ مولانا منظور نعمانی نے اس جملہ پر حسب ذیل حاشیہ تحریر کیا ہے۔ ''میرے نزدیک مولانا کا یہ بالکل جدید ''انکشاف'' ہے، میرے معلومات اس بارے میں ان کے بالکل برعکس ہیں۔

خیال کو پیدا کیا ہے کہ عام اہل علم یا ارباب درس وتدریس وتالیف وتصنیف کے مساعی کی جو نوعیت ہوتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ کے علمی خدمات کی نوعیت ان سے مختلف ہے، میں نے تمہید ہی میں عرض کر دیا تھا کہ شاہ صاحب کی علمی سرگرمیوں خصوصاً ان کے تصنیفی کاروبار کے پیچھے بعض اہم مقاصد اور اغراض کم از کم مجھے چھپے ہوئے نظر آتے ہیں، یہ مقاصد اور منصوبے ان کے دل میں جن اسباب وعلل سے پیدا ہو سکتے تھے، دراصل اس وقت تک اجمالاً ان ہی کا ذکر کیا گیا، اب میں شاہ صاحب کے ''ہر منصوبے'' اور اس منصوبہ یا نصب العین کے لحاظ سے جو کام کر کے وہ چلے گئے ہیں ترتیب کے ساتھ ان سب سے بحث کرنا چاہتا ہوں، لیکن یہ بحث کوئی واقعی تفصیلی بحث نہ ہوگی کہ اس کا یہاں نہ موقع ہے اور نہ گنجائش محض ان کی ایک اجمالی فہرست پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ فقہی اختلافات میں نقطۂ عدل

آپ کی کتابوں میں ایک بڑا ذخیرہ تالیفات کا تو وہ ہے جن سے آپ کو مکروہ خانہ جنگی کو ختم کرانا مقصود ہے، جو پچھلے چند دنوں سے ہر مذہب کے متصلب ومتقشف فقہاء کی بدولت ملک میں شدت اختیار کرتی جا رہی تھی، اگرچہ یہ تو صحیح نہیں ہے جیسا کہ اس زمانہ میں مشہور کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالیوں کی زیادہ تر ذمہ داری ان ہی فروعی اختلافات کی طرف عائد ہوتی ہے، سمجھا جا رہا ہے کہ حنفیت، شافعیت، مالکیت وحنبلیت کے اختلافات کی نوعیت اسی قسم کی ہے، جیسے یورپ میں صدیوں کلیسا اور عوام کے باہمی مذہبی اختلافات کی رہی، حالانکہ ع

''چہ نسبت خاک را باعالم پاک''

کہاں یورپ کی وہ مذہبی خانہ جنگیاں جن میں کہا جاتا ہے کہ تقریباً دس لاکھ آدمی مختلف ظالمانہ طریقوں سے موت کے گھاٹ اتارے گئے، ہزاروں کو پھانسیاں دی گئیں،

لاکھوں زندہ جلائے گئے، فرانس کے بارتھلمی ہنگامہ میں رومن کیتھولک والوں نے پروٹسٹوں پر جو مظالم توڑے ہیں، ان کی داستان سن کر اس وقت تک انسانیت کا کلیجہ پھٹتا ہے، مسیح علیہ السلام کی ان مسکین بھیڑوں نے زندہ بچوں کو ماؤں کے پیٹ سے چاک کر کر کے نکالا اور اپنے کتوں کو کھلایا، نو دن تک پیرس کی گلیوں میں صرف خون بہتا رہا، دریائے سین کا پانی ان ہی کے لہو سے سرخ ہو گیا تھا، (القصہ بطولھا)۔

یورپ اگر اپنے مذہب کے ان ہی نمونوں سے ڈر کر سرے سے مذہب ہی کے نام سے پناہ مانگنے لگا، تو واقعہ یہ ہے کہ شاید یہ کچھ بیجا بھی نہیں ہے، اور موجودہ مغربی الحاد وزندقہ کی پیدائش میں مسکین سائنس اور بدنام کیمیاء سے زیادہ دخل سچ پوچھئے تو مذہبی نمائندوں کے ان ہی خونچکاں کارناموں کو ہے، اگرچہ مسلم عوام کو دھوکا دیا جا رہا ہے کہ سائنس نے یورپ میں مذہب کی چولیں ڈھیلی کر دیں، حالانکہ اس دھوکہ کے وہی شکار ہوتے اور ہو رہے ہیں جو نہ سائنس سے واقف ہیں اور نہ مذہب سے، ورنہ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یورپ کی موجودہ بے ایمانیوں یا ہٹ دھرمیوں کے پیچھے ان کے مذہب اور مذہبی پیشواؤں کی وہ چیرہ دستیاں چھپی ہوئی ہیں، جن کے نیچے صدیوں یورپ کے عوام سسکتے رہے ہیں، کتنے افسوس کی بات ہے کہ یورپ کی ان ہی مذہبی خانہ جنگیوں کو بلاوجہ اسلام کے ان فروعی اختلافات پر منطبق کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اسلام زمین کے کرہ پر آج چودہ صدیاں گزار چکا ہے، کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ محض حنفی اور شافعی ہونے کے اختلافات نے ہر جگہ نہیں تو اسلامی ممالک کے کسی خاص خطہ میں بھی کبھی اس قسم کی خوفناک شکل اختیار کی ہے، زیادہ سے زیادہ شخصی حملوں سے کبھی بڑھا ہے، شیعیت اور سنیت کے جھگڑوں سے اس وقت بحث نہیں کہ اس کا معاملہ ہی دوسرا ہے، میری گفتگو کا تعلق صرف ان فروعی اختلافات تک محدود ہے، جن کی حنفیت اور شافعیت وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے، انشاء اللہ تعالیٰ اسلامی تاریخ کے اس طویل زمانہ میں کوئی ایسا اہم واقعہ ان اختلافات کی بنیاد پر پیش نہیں آیا ہے جیسے یورپ کی ان خونی داستانوں کے مقابلہ میں سامنے لایا جا سکتا ہو۔

مگر جو کچھ بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدیوں میں بعض خاص حالات خصوصاً اسلام کے اصلی سرچشموں یعنی قرآن وحدیث کی تعلیم سے اسلامی مدارس جس حد تک بیگانے ہوتے چلے گئے، بتدریج یہ اختلافات بہت غلط صورت اختیار کرتے چلے جاتے تھے، خصوصاً ماوراء النہر (ترکستان وخراسان) کے حنفی فقہاء کا غلو اس باب میں آہستہ آہستہ بہت آگے بڑھ گیا تھا اور ہندوستان میں وطن بنانے کیلئے اسلام جس راستہ سے آیا، چونکہ وہ ان ہی ممالک کے علماء کی ذہنیت سے متاثر تھی، پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا، نادری اور ابدالی حملوں نے جب اس ملک میں روہیلوں کے جدید عنصر کا اضافہ کر دیا تو تشدد وتصلب کی یہ شرارت دو آتشہ ہو چکی تھی۔

شاہ صاحب نے بڑی دانشمندی اور گہرے مطالعہ کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی بنیاد سے پردہ ہٹایا، ائمۂ مجتہدین اور ان کے اجتہادات کا جو صحیح مقام تھا اسے واضح فرمایا، بعضوں کو تو شاہ صاحب سے شکایت ہے کہ ہندوستان میں غیر مقلدیت کی ابتدا آپ ہی سے ہوئی، اور خود غیر مقلدوں کا طبقہ اس باب میں گونہ آپ کو پیشوا مانتا ہے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر امت یا کم از کم ہندی مسلمانوں کے ہاتھ میں اس وقت وہ معلومات نہ ہوتے جنہیں شاہ ولی اللہ کی عرق ریزیوں نے وقف عام کیا ہے تو سرزمین نجد اور نجد سے آگے بڑھ کر حجاز میں جو تحریک ''وہابیت'' کے نام سے چل پڑی تھی اور یورپ والوں نے اپنے خاص اغراض کے تحت اس تحریک اور تحریک کے چلانے والوں کو مختلف طریقوں سے اچھالنا شروع کیا تھا(۱)، واقعہ یہ ہے کہ غلامی کے ان دنوں میں جن میں ایسے کم ہیں جو اپنی زبان سے اپنی بات ادا کرتے ہوں اور اپنے دماغ سے اپنے خیالات سوچتے ہوں، مشکل ہی سے غلام ہندوستان میں اس وقت کوئی حنفی نظر آتا، اس میں شک نہیں کہ اندرونی طور پر مغربی دجل وکید نے جو دام بچھایا تھا اور ذم کی صورتوں میں اس تحریک کی مدح کا جو گیت مختلف لہجوں میں گایا جاتا تھا جس کا افسانہ طویل ہے، اس میں بے چارے کچھ سادہ لوح ابتدا میں پھنس گئے، لیکن اہل علم کو معلوم ہے کہ شاہ ولی

(۱) میرے نزدیک مولانا کا یہ بالکل جدید ''اکتشاف'' ہے، میرے معلومات اس بارے میں ان کے بالکل برعکس ہیں (مولانا منظور نعمانی) [تفصیل کے لئے دیکھئے محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح از مولانا مسعود عالم ندوی]

اللہ کے تحقیقی طرز عمل نے اس تحریک کو ہندوستان میں زیادہ پھلنے پھولنے نہیں دیا، ولی اللہی مکتب خیال کے علماء کی کوششوں کا آج یہ نتیجہ ہے کہ ''شیٔ من صدر قلیل'' کے سوا اب عمل بالحدیث کے مدعیوں کی آبادیاں اپنے اندر اور کچھ نہیں رکھتیں۔

اس سلسلہ میں حضرت کی کتابیں ''انصاف''، ''عقید الجید''، ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے بعض ابواب، ''تفہیمات''، ''ازالۃ الخفاء'' کی بعض ضمنی چیزیں اور سب سے زیادہ موطا کی شرحوں نے حدیث فہمی کا جو معیار پیش کیا ہے، اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی جو راہیں اشاروں اشاروں میں شاہ صاحب نے اہل فہم کے سامنے کھول دی ہیں، سچی بات یہ ہے کہ آج حنفیت ''علی بصیرۃ من ربہ'' ان ہی بنیادوں پر قائم ہے۔(۱)

ایک بڑی دانشمندی شاہ صاحب نے یہ بھی فرمائی کہ حنفی فقہ کے ساتھ ساتھ آپ نے درسی طور پر شافعی فقہ کے مطالعہ کو بھی ضروری قرار دیا ہے، اپنے مسلک کی تشریح میں ایک موقع پر اپنے کو ''الشافعی درساً'' جو فرمایا ہے اس کا یہی مطلب ہے، جو جانتے ہیں کہ حنفی اور مالکی فقہ کی حیثیت اسلامی قوانین کے سلسلہ میں تعمیری فقہ کی ہے اور شافعی وحنبلی فقہ کی زیادہ تر نوعیت ایک تنقیدی فقہ کی ہے، حنفیوں کی فقہ کو مشرق میں اور مالکیوں کی فقہ کو مغرب میں چونکہ عموماً حکومتوں کے دستور العمل کی حیثیت سے تقریباً ہزار سال سے زیادہ مدت تک استعمال کیا گیا اس لئے قدرتاً ان مکاتیب خیال کے علماء کی توجہ زیادہ تر جدید حوادث وجزئیات وتفریعات کے ادھیڑ بن میں مشغول رہی، بخلاف شوافع اور حنابلہ کے کہ بہ نسبت حکومت کے ان کا تعلق زیادہ تر تعلیم وتعلم، درس وتدریس اور تالیف وتصنیف سے رہا، اس لئے عموماً تحقیق وتنقید کا وقت ان کو زیادہ ملتا رہا، بہرحال یہ افسانہ تو دراز ہے، مجھے کہنا یہ ہے کہ فقہ اور اسلامی قوانین کا تعلق ان کے سرچشموں یعنی کتاب وسنت سے ہے، جو چاہتے ہیں کہ یہ تعلق زیادہ تر وتازہ حالت میں

(۱) اس موقع پر ناظرین سے میں سفارش کروں گا، کہ جناب مفتی عبداللطیف رحمانی سابق صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ وحال صدر شعبہ اسلامیات جامعہ اسلامیہ علیگڑھ کی کتاب ''تذکرہ اعظم'' کا مطالعہ کریں، مفتی صاحب نے شاہ صاحب کی چیزوں کو اس میں بڑے سلیقہ سے جمع کر دیا ہے۔

رہے، ان کے لئے شاہ صاحب کا یہ طریقۂ عمل کہ شوافع اور حنابلہ کی فقہ اور ان کے ادبیات کا بھی مطالعہ جاری رکھیں، بہت کچھ مفید ثابت ہوسکتا ہے، یا کم از کم حدیث کے درس میں خصوصیت کے ساتھ فقہاء امصار کے خلافیات اور ان کے وجوہ ودلائل کے بیان کرنے میں مسائل فقہ میں زندگی باقی رہتی ہے، ہر مذہب کا پیرو ان علل واسباب سے واقف رہتا ہے جن کی روشنی میں اس کے امام نے اپنی رائے قائم فرمائی ہے، نیز چونکہ اس کے ساتھ دوسرے ائمہ مجتہدین کے دلائل ووجوہ بھی اس کے سامنے آتے رہتے ہیں، اس لئے قدرتی طور پر ''جاہلی حمیت'' کا زہر ان میں پیدا ہونے نہیں پاتا، ''عقد الجید'' میں شاہ صاحب نے ائمہ مجتہدین کے قیاسی نتائج کے متعلق بجائے اس نظریہ کے کہ حق ان میں سے ایک ہی ہوسکتا ہے، اس خیال کو جو ترجیح دی ہے کہ سب ہی حق پر ہیں تو فروعی اختلافات کی اہمیت کے سارے قصہ کو ختم فرمادیا ہے، اس باب میں شاہ صاحب کے مباحث قابل دید ہیں، جس قسم کا اجمال میرے پیش نظر ہے، اس کے لحاظ سے گنجائش نہیں، ورنہ ان چیزوں کا ذکر کرنا چاہیے کہ لوگ اس کا عام طور پر مطالعہ کریں، اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔

۲۔ صوفیا عصر اور تصوف کی اصلاح

دوسرا ذخیرہ آپ کی کتابوں کا وہ ہے جس میں مشائخ زمانہ اور صوفیہ عصر کو آپ نے چونکانے کی کوشش کی ہے، تصوف کا کتنا حصہ خالص اسلامی ہے اور زمانہ کی ضرورتوں سے جس طرح متکلمین اسلام نے وقتاً فوقتاً غیروں کی چیزوں کو اپنی کتابوں میں شریک کرلیا تھا حتی کہ ''شرح مقاصد'' و ''مواقف'' میں ''عنصریات'' و ''کائنات الجو'' تک کے مباحث درج ہوگئے ہیں، اسی طرح تصوف میں بھی اجنبی عناصر کا اضافہ مختلف وجوہ سے جو ہوتا رہا ہے، اپنی مختلف کتابوں خصوصاً ''الطاف القدس''، ''ہمعات''، ''سطعات''، وغیرہ میں اسی کی آپ نے تفصیل بیان فرمائی ہے، تصوف کے متعلق بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے ہندوستان میں اس کے خلاف شاہ ولی اللہ ہی نے علم بغاوت اٹھایا، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، آج جب کہ یورپ تحقیق

وریسرچ کے نام سے اسلامی چیزوں کو غیروں کی طرف مختلف شاطرانہ چابک دستیوں سے منسوب کرنے میں منہمک ہے، اگر شاہ ولی اللہؒ کی تحقیقی کتابیں اس وقت ہمارے پاس نہ ہوتیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس دجالی ہنگامہ میں تصوف کا اسلام سے دور کا بھی رشتہ باقی رہ سکتا تھا؟

یورپ زدوں کا ایک بڑا گروہ باوجود اس کے بھی جاہلوں کو جو بہکا رہا ہے کہ اسلامی صوفیہ کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے بلکہ صرف اشراقیوں، عیسائیوں، صابیوں، ایرانیوں اور آخر میں ہندوستانی یوگیوں سے مختلف چیزیں لے لے کر مسلمان صوفیوں نے تصوف کی عمارت کھڑی کی ہے۔

خدا جزائے خیر دے شاہ ولی اللہؒ کو، کہ مختلف کتابوں میں مختلف پیرایوں سے آپ نے اسلام کے حقیقی تصوف اور اجنبی اجزاء کو جدا کرکے دکھایا ہے اور اس سلسلہ میں تو آپ نے اتنا کام کیا ہے کہ جن جن چیزوں کا تصوف سے محض برائے نام تعلق تھا مثلاً جھاڑ پھونک، تعویذ وغیرہ اس کے متعلق بھی آپ نے مستقل کتابیں تالیف فرمائیں، ''القول الجمیل'' اور ''حزب البحر'' کی شرح وغیرہ اسی سلسلہ کی چیزیں ہیں، اس طرز عمل کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ جس طرح نمبر ایک کی کتابوں سے حنفی وشافعی اختلافات کی شدت کم ہوتی ہے، ان کتابوں سے ملا اور صوفی کے جھگڑوں کا بشرطیکہ انصاف سے کام لیا جائے خاتمہ ہوجاتا ہے، شاہ ولی اللہ نے تصوف کے مسائل کو خالص اسلامی تعبیروں میں پیش کرکے ''مولویوں'' کی اس بھڑک کو مٹا دیا ہے جو ان بے چاروں میں صوفی وصوفیت کے متعلق پائی جاتی ہے۔

۳۔ شیعہ سنی نزاع کے متعلق شاہ صاحب کا کام

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ہندوستان میں پہلے تورانی سنی، پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشدد سنی روہیلوں کی شکل میں داخل ہوئے، ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنن وتشیع کے سلسلہ میں عجب افراط وتفریط کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں بھی بڑا کام کیا، بڑی محنت سے ہزارہا صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات

"ازالۃ الخفاء" میں ایسے دل نشیں طریقہ سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجاتا ہے تو اسی کے ساتھ ان غالی سنیوں کی شدت وتیزی میں بھی کمی پیدا ہوجاتی ہے، جو محض اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہ کے مناقب کیوں بیان کئے یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہاء حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا، ان پر بھی شیعیت کا فتوی صادر کردیتے ہیں، اور اسکے سوا بجائے مناظرے اور مجادلے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی، جس سے بہت سے فتنوں کا سد باب ہوگیا۔

۴۔ یونانی فلسفہ کے بجائے ایمانی فلسفہ

اسی سلسلہ میں شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کے ان معقولی علماء کی اصلاح کو بھی پیش نظر رکھا ہے جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں کہ وہ لفظی گورکھ دھندوں میں مبتلا تھے، آپ نے بجائے اوہام وخرافات کے قرآن وحدیث کے کلیات سے خود ایک فلسفہ تیار کیا اور جو لوگ ذہنی تمرین وتشحیذ کے لئے لایعنی خیالات میں وقت ضائع کرتے تھے، ان کے لئے شاہ صاحب نے فکروغور کا ایک بڑا میدان پیش کردیا، اس سلسلہ میں آپ کی سب سے بہتر کتاب "الخیر الکثیر" ہے، نیز "حجۃ اللہ" اور "البدور البازغہ" کے اکثر مباحث کا رخ بھی اسی نصب العین کی طرف ہے، اس سلسلہ میں شاہ صاحب کے سامنے ہندوستان کی وہ مرعوب طبائع بھی ہیں جو میر باقر داماد اور صدر شیرازی وغیرہ ایرانی لفاظوں کے بقبقوں اور شقشقوں سے متاثر ہوکر اپنی جگہ پر گویا کانپ رہے تھے، شاہ صاحب کی بعض کتابوں میں میر باقر وغیرہ کی عبارتوں کی جو جھلک نظر آتی ہے تو میں اس کو کوئی اتفاقی واقعہ نہیں سمجھتا، بلکہ میرا خیال ہے کہ آپ نے قصداً اس طرز عمل کو اختیار کیا ہے اور مقصود وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔

۵۔ مغربی الحاد کے زہر کا تریاق اور امروزہ شبہات کا پیشگی جواب

پانچویں چیز جو مجھے شاہ صاحب کے خدمات میں نظر آتی ہے، ممکن ہے کہ لوگوں کو اس

بات میں مجھ سے اختلاف ہو، لیکن بہرحال میں یہ سمجھتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے بعد ہندوستان میں مذہب اور مذہبی امور کے متعلق شک وارتیاب کا جو دور آنے والا تھا شاہ صاحب کے کاموں کا ایک بڑا حصہ اس سے بھی تعلق رکھتا ہے، خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سوالات آئندہ پیدا ہونے والے ہیں، ان کا جواب پہلے سے تیار کرکے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے مسلمانوں کو سپرد کررہے ہیں، جیسا کہ میں خود لکھ چکا ہوں شاہ صاحب کے زمانہ تک انگریزی حکومت کا اثر دلی تک نہیں پہنچا تھا، لیکن جب بنگال اور مدراس میں ان کے قدم جم چکے تھے اور اپنے اسی اقتدار واختیار کی قوت کو محسوس کرکے عیسائی مذہب کے پوپ اور بطارقہ مغربی خیالات کو کسی نہ کسی شکل میں ملک میں پھیلانے کی تیاریاں کررہے تھے، عوام کو ان کا احساس نہ ہوا ہو، لیکن کوئی تعجب نہیں کہ شاہ صاحب تک اس کی لہریں پہنچی ہوں، ماسوا اس کے جب حجۃ اللہ کے دیباچہ میں وہ خود یہ فرماتے ہیں کہ:

"بینا أنا جالس ذات یوم بعد صلاة العصر متوجهاً إلی الله ظهرت روح النبی ﷺ وغشیتنی من فوقی بشئ خیل إلیّ أنه ثوب ألقی علیّ ونفث فی روعی فی تلك الحالة أنه إشارة إلیٰ نوع بیان للدین ووجدت عند ذلك فی صدری نوراً لم یزل یتفسح کل حین".

"اس حال میں کہ ایک دن عصر کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرکے بیٹھا ہوا تھا، اچانک نبی ﷺ کی روح مبارک ظاہر ہوئی اور مجھے اوپر سے اس نے ڈھانک لیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجھ پر کوئی کپڑا اڑھا دیا گیا ہے، اسی کیفیت میں میرے اندر یہ بات پھونکی گئی کہ دین کی تشریح کے ایک خاص طریقہ کی طرف مجھے اشارہ کیا جارہا ہے، میں نے اپنے اندر اس حال میں ایک روشنی پائی جو لمحہ بہ لمحہ پھیلتی چلی جاتی تھی"۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد کا جو یہ فقرہ ہے کہ شاہ صاحب کو یہ محسوس ہوا کہ:

"إن الشریعة المصطفویة أشرفت فی هذا الزمان علی أن تبرز فی قمص سابغة من البرهان".

"مصطفوی شریعت کے لئے وقت آگیا کہ برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس

کر کے اسے میدان میں لایا جائے''۔

آئندہ انگریزی عہد میں وساوس واوہام اور شکوک وشبہات کے جو سیاہ بادل امنڈ نے والے تھے، اگر انکی طرف اس میں اشارہ نہیں ہے تو بتایا جائے کہ ''حجۃ اللہ'' کی تصنیف کے بعد انگریزی عہد کے سوا ایسا کون سا دور آیا جس میں ضرورت تھی کہ اسلامی شریعت کو ''دلیل وبرہان'' کے پیراہنوں میں آراستہ کر کے پیش کیا جائے، بہر حال میرا خیال ہے اور یہ خیال شاہ صاحب کی کتابوں سے پیدا ہوا ہے کہ جو کچھ ہونے والا تھا اور مسلمانان ہند پر جو افتاد پیش آنے والی تھی، کسی نہ کسی ذریعہ سے شاہ صاحب کو اس کی اطلاع ہو چکی تھی اور اپنے تصنیفی کاروبار میں ان کے سامنے جہاں اور مقاصد واغراض تھے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آنے والے خطرات کے انسداد کی بھی انہوں نے اپنی کتابوں میں پوری کوشش کی ہے اور میں سمجھتا ہوں وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں، جوں جوں نئی روشنی کی تاریکی بڑھتی چلی جارہی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ کی جلائی ہوئی علمی شمع کی قیمت اسی نسبت سے بڑھ رہی ہے، مغربی الحاد وزندقہ کے زہر کا تریاق شاہ ولی اللہ کا کلام ہے، اب یہ ایک ایسی مسلم بات ہوگئی ہے کہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ مصر اور اب تو عرب وترکی، ایران وافغانستان سب ہی کو اس کا احساس ہو رہا ہے اور بحمد للہ ان تمام اسلامی ممالک میں شاہ صاحب کی کتابیں کافی مقبولیت حاصل کر رہی ہیں، چونکہ میں سردست صرف ولی اللّٰہی کارناموں کی ایک اجمالی فہرست بتا رہا ہوں، اس لئے مزید گفتگو کی گنجائش نہیں، انشاء اللہ اگر تفصیل کا موقعہ کبھی ملا تو یہ دکھایا جاسکتا ہے کہ آج جو کچھ پوچھا جارہا ہے سب کے جواب سے ولی اللہ القطب الحکیم کا قلم مدت ہوئی کہ فارغ ہو چکا ہے۔

۶۔ قرآن وحدیث کے تراجم کی بیناد

اور سب سے بڑا کام کم از کم میرے ناچیز خیال میں شاہ صاحب کا یہ ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہندوستان میں قرآن وحدیث کے ترجمہ کی بنیاد بڑی جرأت اور ہمت سے کام لے کر بالآخر ڈال دی تھی، اگرچہ خود انہوں نے فارسی میں قرآن کا بھی ترجمہ کیا، اور حدیث کی

قدیم ترین کتاب موطا مالک کا بھی ترجمہ فارسی ہی میں کیا، کہ ان کے زمانہ تک غالباً اردو عام طور سے لکھنے پڑھنے کی زبان نہیں بنی تھی، جو بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے، وہ فارسی ہی میں لکھتے پڑھتے تھے، لیکن جوں ہی کہ اردو نے قدم آگے بڑھایا اور اس راہ میں اس نے بڑی تیزی دکھائی، تو محض اس لئے کہ شاہ صاحب کا نمونہ فارسی میں موجود تھا، آپ کے صاحبزادوں میں سے حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے بامحاورہ اردو میں اور شاہ رفیع الدین صاحب نے لفظی ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل فرمائی۔

یہ بات کہ ان حضرات کو ترجمہ کرنے کا خیال اپنے والد کے ترجمہ ہی کی بنیاد پر ہوا، ''موضح القرآن'' میں اس کے متعلق شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں:

> ''بندے عاجز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب بڑے حضرت شیخ ولی عبدالرحیم صاحب کے بیٹے، سب حدیثیں جاننے والے، ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی زبان میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے ہیں، اسی طرح اس عاجز نے ہندی زبان میں قرآن شریف کے معنی لکھے''۔ ص۲

اور ان دونوں حضرات کے بعد پھر اس وقت تک اردو میں قرآن بلکہ حدیث کے بھی جتنے ترجمے ہوئے یا آئندہ ہوں گے، کم از کم ہندوستان کی حد تک اس سنت حسنہ کے تسنن کا سہرا حضرت شاہ ولی اللہؒ ہی کے سر بندھتا ہے، قرآن وحدیث کے ترجمہ سے مسلمانوں کو خصوصاً ایسے زمانے میں جب اس سے ان کا وہ ملوکی اور حکومتی تعلق باقی نہیں رہا، جس کی وجہ سے مسلمان تو مسلمان، نامسلم بھی اسلامی زندگی کی اتباع میں فخر محسوس کرتا تھا، ایسے زمانہ میں ان ترجموں نے ہم مسلمانوں کے اسلام وایمان کی حفاظت میں کیا کام کیا ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنا آسان نہیں ہے، اور خواہ میری یہ خوش اعتقادی قرار دی جائے یا جو کچھ بھی سمجھا جائے، میں تو ایسا سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں بھی شاہ صاحب کو ''اس مصیبت'' کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ ہو چکا تھا، جس میں انقلاب حکومت کے بعد بیچارے مولوی اور مشائخ مبتلا ہونے والے تھے۔

میرا اشارہ اس طریقہ عمل کی طرف ہے جسے زمانہ کے ارباب تشکیک وارتداد نے

اسلام کے خلاف بڑی چالاکی سے اختیار کیا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی کسی تعلیم کا انکار کریں، لیکن ڈرتے ہیں کہ عام مسلمانوں میں سے اس سے برہمی پیدا ہوگی یا کم از کم صاف انکار اگر کر دیا جائے گا تو عوام ہمارے قبضہ سے نکل جائیں گے، اس لئے ''مولوی کا مذہب'' ایک لفظ تراشا گیا ہے، اور ہر وہ چیز جو واقعی قرآن یا حدیث کی ہوتی ہے، مولوی کی طرف منسوب کر کے اس کا انکار کر دیا جاتا ہے، کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم نے مولوی کے خیال کا انکار کیا ہے، قرآن کا انکار نہیں کیا ہے، حد یہ ہے کہ آج جنت و دوزخ، حور و ملائکہ، شیاطین وغیرہ ایسے حقائق کا اعلانیہ انکار کیا جارہا ہے جن کے ذکر سے قرآن معمور ہے، لیکن سادہ لوحوں کو کتنی دیدہ دلیری سے یہ باور کرا دیا جاتا ہے کہ ان چیزوں کا ثبوت کہیں بھی قرآن میں نہیں، بلکہ غبی، کند فطرت مولوی ان کا قائل ہے، الغرض اس پردہ میں قرآن کے جس عقیدے سے چاہا جاتا ہے انکار کر دیا جاتا ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اگر اس وقت شاہ ولی اللہ قرآن وحدیث کے ترجمہ کی بنیاد ڈال کر نہ چلے جاتے اور اس وقت بھی قرآن عوام کی دسترس سے عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے بالکل باہر ہی ہوتا تو بے چارہ ''مولوی'' اس مغالطہ کا کیا جواب دے سکتا تھا، صبر وسکون کے ساتھ الحاد و بے دینی کے ان طمانچوں کو برداشت کرتا رہتا اس کے لئے اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا۔

لیکن بحمد للہ شاہ ولی اللہ ایک ایسا کام کر کے چلے گئے ہیں کہ جو نہیں سمجھنا چاہتے ان سے تو بحث نہیں لیکن واقعی جو حقیقت کے طالب ہیں ان کے لئے ... ''مولوی کے مذہب'' .... کا پرانا جال اب بیکار ہو چکا ہے، قرآن تمہاری زبان میں بہ شکل ترجمہ موجود ہے، خود پڑھ جاؤ، اور پڑھنے کے بعد خود انصاف کر سکتے ہو کہ مثلاً آج جس جنت و دوزخ، حور و غلمان، اشجار و انہار کا دار آخرت میں انکار کیا جارہا ہے، یہ کسی غریب مولوی کی بات کا انکار ہے یا براہ راست قرآن کا انکار ہے۔

غرض یہ ایک بڑی پرفریب دجالیت تھی جس کا قلع قمع کم از کم انصاف پسندوں کی حد تک ہو چکا ہے، اور سچ پوچھئے تو انحطاط و ناقدری کے اس زمانہ میں بے چارے مولویوں کے لئے بھی قرآن و حدیث کے یہ تراجم اکسیر کا کام دے رہے ہیں، عربی مدارس میں ٹوٹی پھوٹی یہ ہمتوں والے طلبہ آج جو کچھ پڑھتے ہیں، یہ واقعہ ہے کہ ان میں ایسے بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو بغیر ترجمہ کی مدد کے قرآن یا حدیث کا پورا مطلب خود سمجھ سکتے ہوں، اگر یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ نوے (۹۰) فیصدی مولویوں کی آبرو محض ان ہی ترجموں کی بدولت بچی ہوئی ہے، اور سچی بات یہ ہے کہ بعض زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اللہ کے بندے اپنے مالک کے براہ راست مخاطب بننے کی سعادت سے محروم تھے یا براہ راست اپنے رسولؐ کے ملفوظات وارشادات کے سمجھنے سے معذور تھے، اس نعمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان تراجم کی بدولت اب بھی وہ اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہوگئے اور خود ان آنکھوں سے بغیر کسی مولوی، عالم کے واسطہ کے اپنے پیغمبر ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کر رہے ہیں اور جیسا کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے کہ:

> ''بتانے والے بہتیرا بتائیں، جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے، ویسا کوئی نہیں بتا سکتا، اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے، کسی کے کلام میں نہیں''(۱)۔

درحقیقت جو منافع ان کے تراجم کے پڑھنے سے پڑھنے والوں کو حاصل ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں، وہ لاکھ مولوی ملا کی زبان سے ہم سنیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتے، بلکہ ترجمہ پڑھنے والے عوام میں ایسے کتنے ہیں جنہوں نے انہی ترجموں کی مزاولت سے آہستہ آہستہ عربی زبان سے ایسا لگاؤ پیدا کر لیا کہ براہ راست خود کلام اللہ ان کی سمجھ میں آرہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے کارناموں میں ترجمہ کی خدمت کو میں سب سے بڑی خدمت قرار دیتا ہوں۔

اس وقت چونکہ سرسری فہرست کی حیثیت سے اس کا تذکرہ مقصود ہے، اس لئے

(۱) مقدمہ موضح القرآن از شاہ عبدالقادرؒ

بالفعل اسی پر بس کرتا ہوں، انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں آپ کی ان شش گانہ خدمات قیمہ پر الگ الگ مقالہ میں چاہتا ہوں کہ بحث کروں اور اس سلسلہ میں ایک مقالہ تراجم کا بھی ہوگا، خود شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ کے متعلق کیا ارقام فرمایا ہے اور کن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اس کام کو آپ نے انجام دیا، نیز ترجمہ کے ساتھ قرآن کے حاشیہ پر بزبان فارسی آپ نے مختصر لفظوں میں جو جواہر پارے بکھیرے ہیں اور ''الفوز الکبیر'' وغیرہ رسائل میں تفسیر کے جو اصول آپ نے وضع فرمائے ہیں، ان سب کا تذکرہ تراجم ہی کے اس مقالہ میں انشاء اللہ کیا جائے گا۔

شاہ صاحب کے اُن شش جہتی کارناموں پر اجمالی نظر

واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کی حیرت انگیز فقید النظر کوششوں کی جو نوعیت ان شش جہتی کارناموں میں نظر آتی ہے، ان میں ہر ایک بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے کہ ایک کیا اگر علماء کی کوئی جماعت بھی ان سے عہدہ برآ ہونا چاہتی تو جتنی کامیابی حضرت شاہ صاحب کو ان میں سے ہر ایک شعبہ میں ہوئی ہے کسی ایک شعبہ میں بھی اتنا کامیاب ہونا آسان نہیں تھا، انہوں نے قرآنی آیات کی جن مشکلات کو حل کیا ہے، قرآن فہمی کے متعلق جن کلیات کی انہوں نے خود تاسیس فرمائی ہے، حدیث وفقہ کے باہمی تعلقات کو صحیح تاریخی وثائق کی روشنی میں جس طرح انہوں نے حل فرمایا ہے پھر خصوصیت کے ساتھ ''علم اسرار الدین'' کے سلسلہ میں حدیث اور فقہ کے تقریباً تمام ابواب میں جن حقائق ورموز کو انہوں نے بے نقاب کیا ہے، اس باب میں واقعہ یہ ہے کہ ان کے اس دعوی کی کوئی تردید نہیں کرسکتا کہ:

''اسرار حدیث ومصالح احکام وترغیبات وسائر آنچہ حضرت پیغمبر ﷺ از خدائے تعالی آوردہ اند، وتعلیم فرمودہ اندو آں فنے است کہ پیش از فقیر مضبوط تر از سخن ایں فقیر کسے آنرا نہ کردہ است باوجود جلالت آں فن، اگر کسے را دریں حرف شبہ باشد گو کتاب ''قواعد'' بیں کہ شیخ عزالدین آنچہ جہد ہا کردہ بعشر عشیر ایں فن فائز نہ شدہ''۔(۱)

''حدیث کے اسرار اور اسلامی احکام وقوانین کی مصلحتیں اور ترغیبات کی حکمت اور

(۱) أنفاس العارفین ص ۱۹۶

وہ ساری باتیں جو پیغمبر خدا ﷺ اللہ کی طرف سے لائے ہیں اور جن کی آپ نے تعلیم دی ہے ان سب کے اسرار ورموز کا بیان کرنا دراصل ایک مستقل فن ہے، اس فقیر سے پہلے (جتنی پختہ بات اس نے کہی ہے) کسی سے یہ نہ بن آیا، اس فن کی بلندی مقام کے باوجود اگر کسی کو میرے بیان میں شبہ ہے تو چاہئے کہ کتاب ''قواعد'' کو دیکھے، شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اس میں کیا کچھ کوشش نہیں فرمائی ہے مگر اس فن کے عشر عشیر تک ان کی رسائی نہ ہوسکی''۔

اسی طرح فن معارف وحقائق اور تصوف کے متعلق جن تحقیقی مباحث تک وہ پہنچے ہیں، نیز اہل سنت والجماعت کے عقائد کی تشریح اور تطبیق منقول بر معقول کے سلسلہ میں انہوں نے جو خدمتیں انجام دی ہیں جیسا کہ خود ارشاد فرماتے ہیں:

''عقائد قدماء اہل سنت بدلائل وحجج اثبات کرد، وآں را از خس وخاشاک معقولیاں پاک ساخت، وبوجہے مقرر نمود کہ محل بحث نہ ماند''۔

''قدماء اہل سنت کے عقائد کو دلائل وبراہین کی روشنی میں جس طرح ثابت کیا گیا ہے اور معقولیوں کے خس وخاشاک سے جیسا ان کو پاک کیا ہے، اور ایسے طریقہ سے ان کی بنیاد قائم کی ہے کہ اب بحث ومباحثہ کی ان میں گنجائش ہی باقی نہ رہی''۔

ماسوا اس کے انہوں نے قرآنی نصوص اور نبوی ارشادات کی روشنی میں دو مستقل فن جو ایجاد کئے ہیں، جن کی تعبیر ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

یعنی ایک تو ''علم کمالات اربعہ یعنی ابداع وخلق وتدبیر وتدلی با ایں عرض وطول''(۱)، اور دوسرا علم ان ہی کی اصطلاح میں:

''علم استعداد نفوس انسانیہ بجمیعہا وکمال ومآل ہر کسے''۔

شاہ صاحب کا ان دونوں علوم کے متعلق دعوی ہے اور بجا دعویٰ ہے کہ:

''ایں ہر دو علم جلیل اند کہ پیش ازیں فقیر کسے بر دگرداں نہ گشتہ''(۲)۔

نیز شاہ صاحب نے علم کلام اور تصوف کے نظری حصہ کے مباحث کو مخلوط کر کے ایک

(۱) نفوس انسانیہ کی استعداد کا مکمل نظام اور ہر ایک کا کمال اور نظام

(۲) یہ دونوں علم اتنے جلیل القدر ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کسی اور کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئے۔

نیا ''فلسفہ'' تیار کیا اور ایسا فلسفہ جس کو ''فلسفہ'' قرار دینا میرے خیال میں اس کی تحقیر ہے، کیونکہ اس باب میں ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ایسی کسی چیز کو اسلامی کلام اور اسلامی تصوف میں وہ دیکھنا نہیں چاہتے جس کی تائید قرآن وحدیث اور آثار صحابہ وسلف صالح کی شہادتوں سے نہ ہوتی ہو، خود فرماتے ہیں کہ اس قسم کے تمام مسائل میں حق تعالیٰ نے ان کو:

''توفیق تشید آں بہ کتاب وسنت وآثار صحابہ دادند وبر تمیز آنچہ علم دین ست منقول از حضرت پیغمبر ﷺ وآنچہ مدخول است ومحرف، وآنچہ سنت است، وآنچہ ہر فرقہ بدعت کردہ است افادہ ساختند'' (۱)۔

''اس بات کی توفیق دی کہ کتاب وسنت وآثار صحابہ سے اس کی بنیادوں کو مستحکم کریں، نیز وہ علم دین جو آنحضرت ﷺ سے منقول ہے اور جو دین میں باہر سے چیزیں داخل ہوگئی ہیں ان دونوں میں تمیز کا جو سلیقہ اور یہ کہ ان میں کون سی باتیں تحریفی ہیں، کون کون سی چیز سنت ہے اور اسلام کے مختلف فرقوں نے کن نئی بدعتوں کو شریک کیا۔

ان تمام امور کا انکشاف جیسا کہ شاہ صاحب نے کیا شاید ہی کسی نے کیا ہو۔

الغرض اس قسم کے مختلف الاطراف والجوانب مباحث مہمہ کو انہوں نے اپنی چھوٹی بڑی کتابوں اور رسالوں میں جو جمع کیا ہے جن کی تعداد ''حیات ولی'' کے مصنف نے ۱۵/ر بتائی ہے، اگرچہ اسی کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے:

''آپ کی تالیفات کے سلسلہ میں اور بھی بہت سی کتابیں ہیں جو قدیم کتب خانوں میں موجود ہیں مگر ہم نے صرف ان ہی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو مطبوع ہو کر شرق سے غرب تک نہایت وقعت کے ساتھ مشہور ہو چکی ہیں''۔

شاہ صاحب کے طرز انشاء میں زبان نبوتؐ کی جھلک

اور پھر یہی نہیں کہ ان کی توجہ اپنی ان کتابوں میں محض معنی پر رہی ہے، بلکہ عربی زبان میں انہوں نے جتنی کتابیں لکھیں ہیں، ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی جو ان کا مخصوص

(۱) انفاس العارفین

اسلوب ہے پوری پابندی کی ہے، شاہ صاحب نے عربی انشاء وادب کا جو نیا قالب تیار کیا ہے، یہی نہیں کہ ہندوستانی مصنفین میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی بلکہ جہاں تک میری محدود رسائی کا تعلق ہے میں نہیں جانتا کہ آغاز اسلام سے اس وقت تک کسی اسلامی علاقہ کے ارباب تصنیف نے اس کو اختیار کیا ہے، شاہ صاحب کے اس ''اسلوب بدیع'' کی کیا خصوصیتیں ہیں اس کے لئے بھی ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے لیکن مختصر لفظوں میں شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر صاحب ''جوامع الکلم'' ''النبی الخاتم'' ﷺ کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے، حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار ان ہی لغات اور ان ہی محاوروں میں کریں جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں اور اس میں خدا نے ان کو خاص مہارت عطا فرمائی ہے، ان سے پہلے تو کسی کو عبارت کے اس ڈھنگ کی طرف توجہ ہی نہیں ہوئی لیکن ان کے بعد بھی اس کی تقلید آسان نہیں ہے، حدیث کے بعد ان کی عبارت میں قرآنی طرز تکلم کا بھی اثر ہے، لیکن قرآن سے زیادہ اس باب میں وہ حدیث ہی کے متبع نظر آتے ہیں اور اسی چیز نے ان کی کتابوں کے رنگ کو عربی زبان کے تمام دوسرے مصنفین سے ممتاز کر دیا ہے، فارسی میں شاہ صاحب نے اگرچہ کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے کم از کم اس میں ان علماء کے لئے درس عبرت ہے جو اپنے زمانہ کے عام طریقہ انشاء وکتابت میں لکھنے پڑھنے کو اپنی علمی شان سے ایک گری ہوئی بات خیال کرتے ہیں، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز کی کتابوں کو پڑھئے اور اس زمانہ کے بڑے بڑے ارباب انشاء کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیجئے، مشکل ہی سے ان حضرات کی عبارات ان سے دب سکتی ہیں۔

شاہ صاحب کے اس سارے کام کی مدت

لیکن یہ سارا کام کتنی مدت میں انجام پایا، شاید ہی کسی نے اس پر غور کیا ہو واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سفر حج سے پہلے کا جو حصہ ہے، اس میں تصنیف

وتالیف کا بظاہر آپ نے کچھ کام نہیں کیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کو اس کا خیال بھی نہ تھا۔

والد ماجد یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی وفات کے وقت آپ سترہ سال کے تھے، اسی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہو چکے تھے، ان کی وفات کے بعد اپنے والد کے پرانے مدرسہ رحیمیہ میں درس وتدریس کا کام تقریباً ایک قرن تک انجام دیتے رہے، خود فرماتے ہیں کہ:

''بعد از وفات حضرت ایشاں دوازدہ سال کم وبیش بدرس کتب دینیہ وعقلیہ نمودہ ودر ہر علمے خوض واقع شد''(۱)۔

''حضرت والد کے انتقال کے بعد کم وبیش بارہ سال تک دینی اور عقلی علوم کی کتابوں کا درس دیتا رہا اور ہر علم میں غور فکر کا مذاق پیدا ہوا''۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ قریب قریب انتیس سال کی عمر تک شاہ صاحبؒ کا بجائے تالیف وتصنیف زیادہ تر درس وتدریس سے ہی تعلق رہا، اسی زمانہ میں یکا یک سفر حجاز کا سودا سر میں سمایا، فرماتے ہیں:

''بعد ازاں دوازدہ سال شوق زیارت حرمین محترمین درسرافتاد''۔

''اس بارہ سال کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق سر میں سمایا''۔

۱۱۴۳ء ۱۱۴۴ء ۱۱۴۵ء یہ تین سال اسی سفر کی نذر ہوئے، جس میں تقریباً چودہ مہینے حرمین شریفین میں قیام کا موقعہ میسر آیا، شاہ عبدالعزیزؒ کا بیان گزر چکا ہے کہ:

''والد ماجد چہار دہ ماہ در حرمین بودند''(۲)۔(والد ماجد چودہ مہینے حرمین میں رہے)۔ اور باقی مدت آمد ورفت میں صرف ہوئی، اس سلسلہ میں شاہ صاحب کو دو حج ملے، ایک اس وقت جب حجاز پہنچے اور دوسرا اس وقت جب واپسی کے قصد سے عرب سے روانہ

(۱) انفاس

(۲) ملفوظات ص۹۳

ہونے والے تھے۔ اس حساب سے حضرت کی عمر کے تینتیس (۳۳)، چونتیس (۳۴) سال ان ہی مشغلوں میں ختم ہو گئے۔

شاہ صاحب کی عمر کے بارے میں اختلاف

آپ کی پوری عمر کتنی ہوئی، اس میں اگرچہ تھوڑا سا اختلاف ہے، ''حیات ولی'' کے مصنف نے گو یہ لکھا ہے کہ:

''جناب شاہ ولی اللہ عمر کے تریسٹھ سال کے مرحلے طے کر چکے تو چند روزہ خفیف سی بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۷۶۲ء میں عازم سفر آخرت ہوئے''(۱)۔

لیکن اس کے برخلاف ''ملفوظات عزیزیہ'' کے جامع نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''عمر شریف شصت ویک (۶۱) سال وچہار ماہ شد، چہارم شوال تولد گشت ودر بست ونہم محرم وفات یافت، تاریخ تولد چہارم ماہ شوال، چہار شنبہ ۱۱۱۴ء بود، تاریخ وفات ''او بود امام اعظم دیں'' ودیگر تاریخ۔

''ہائے دل روزگار رفت بست نہم محرم وقت ظہر''(۲)

تاریخوں کے ملانے سے جیسا کہ ہونا بھی چاہیے، شاہ عبدالعزیز ہی کے بیان کی توثیق ہوتی ہے، بہر کیف میرا مقصد تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کی عمر جب کل اکسٹھ سال چار مہینے مانی جائے تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اس اکسٹھ میں تقریباً تینتیس (۳۳)، چونتیس (۳۴) ان ہی مشغولیتوں میں بسر ہو گئے، اب کل ستائیس اٹھائیس سال کی مدت رہ جاتی ہے جس میں وہ سارا کام انجام پایا ہے، جسے دنیا شاہ ولی اللہ کا کام سمجھتی ہے، بلکہ اسی کے ساتھ مرحوم حضرت امیر شاہ خاں صاحب جو ولی اللہی خانوادہ کے گویا ''راویہ'' تھے، اگر ان کے اس

(۱) ص ۳۱۸

(۲) ملفوظات عزیزیہ ص ۴۰ [آپ کی عمر شریف اکسٹھ سال چار ماہ ہوئی، چار شوال کو پیدائش ہوئی اور ۲۹ محرم کو وفات پائی، تاریخ ولادت ۴ شوال ۱۱۱۴ھ بروز چہار شنبہ ہے، تاریخ وفات ''بود امام اعظم دیں'' ہے]۔

بیان کا بھی اضافہ کرلیا جائے کہ:

''دہلی میں نجف علی خاں کا تسلط تھا جس نے شاہ ولی اللہ صاحب کے پہنچے اتروا کر ہاتھ بیکار کردئے تھے تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون نہ تحریر کرسکیں'' (۱)۔

اگرچہ اب تک اس واقعہ کی تاریخی شہادت مجھے میسر نہیں آئی ،لیکن امیر شاہ کا بیان کم ازکم میرے نزدیک خود ایک زندہ شہادت ہے، پھر چونکہ یہ نہیں معلوم کہ ناگوار سانحہ حضرت کے ساتھ کس وقت پیش آیا اس لئے کوئی معین مدت تو مقرر نہیں کی جاسکتی، لیکن بقیہ ستائیس اٹھائیس سال والی مدت لامحالہ اس بنیاد پر اور گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

اتنی قلیل مدت میں ایسے عجیب وغریب گوناگوں کام کیسے شاہ صاحبؒ سے بن آئے؟ یہ یقیناً محل حیرت ہے، کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بہت کچھ دخل ان کے خداداد فطرت اور خاص دل ودماغ کو بھی ہے، بھلا جس شخص کی ختنہ اور جس کا ختم قرآن ساتھ ساتھ ہوا ہو جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

''درسال ہفتم حضرت والد بزرگوار برنماز ایستادہ کردند وبروزہ داشتن فرمودند، وتطہر نیز درہمیں سال واقع شد، وچناں درخاطر ماندہ کہ آخر ہمیں سال قرآن عظیم ختم کردم'' (۲)۔

''عمر کے ساتویں سال میں والد بزرگوار نے مجھے نماز پر کھڑا کیا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا، اور ختنہ بھی اسی سال میں واقع ہوئی، اور خیال ایسا ہوتا ہے کہ اسی سال کے آخر میں قرآن مجید بھی میں نے ختم کیا''۔

اور دس سال کی عمر میں جو شرح ملا تک پہونچ گیا ہو، اور کس طرح پہونچا ہو کہ مطالعہ کی قوت بھی پیدا ہوچکی ہو، فرماتے ہیں:

''درسال دہم شرح ملامی خواندم وراہ مطالعہ فی الجملہ کشادہ شد''۔

''میں دسویں سال شرح ملا پڑھ چکا تھا، فی الجملہ اسی وقت سے مطالعہ کی راہ مجھ پر کھلی''۔

(۱) امیر الروایات ص۴۴

(۲) انفاس ص۱۹۴

اور ٹھیک عمر کے پندرہویں سال میں باضابطہ دستار فضیلت جس کے سر پر بندھ گئی ہو، جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے کہ:

''بالجملہ از فنون متعارفہ بحسب رسم ایں دیار (در) پانزدہم فراغ حاصل شد''

''خلاصہ یہ ہے کہ تمام متداول علوم اس کے درس میں جن کا رواج ہے ان سے پندرہویں سال فراغت حاصل ہوگئی''۔

ان علوم متداولہ میں صرف درس نظامیہ کی کتابیں ہی داخل نہیں ہیں، بلکہ ان عام کتابوں کے سوا طب اور تصوف کی ایک نہیں متعدد کتابیں چھوٹی بڑی بھی شریک ہیں، بلکہ شاید علم خواص الاسماء وغیرہ کے طرز کی بعض چیزیں بھی اپنے والد سے آپ نے پڑھ لی تھیں اور پھر سترہ سال کی عمر میں ہر قسم کے علوم وفنون عقلی ونقلی کا درس دینا شروع کردیا تھا، ظاہر ہے کہ یہ باتیں ان کی خاص دماغی اور ذہنی قابلیت پر دلالت کرتی ہیں۔

عرب بھی جو وہ گئے تو اس میں شک نہیں کہ وہاں کے علم وفضل کی صحبتوں سے کافی فائدہ ان کو پہنچا، اور سب سے بڑی چیز جو وہاں سے لائے وہ حدیث کی سند تھی، کیونکہ گو ہندوستان میں بھی قبل سفر حجاز کے اپنے والد سے پوری مشکوٰۃ اور بخاری کا کچھ حصہ پڑھ چکے تھے لیکن صحاح اور صحاح کے سوا دوسری حدیث کی کتابوں کی سند آپ کو عرب ہی سے حاصل ہوئی، لیکن خود ان کے بعض جلیل القدر اساتذہ بلکہ آپ کے سب سے بڑے استاذ حدیث علامہ طاہر بن ابراہیم کردی ہی فرماتے تھے:

"يسند عني اللفظ وكنت أسمع المعنى منه"(۱)۔

''مجھ سے وہ لفظوں کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے حدیث کے معنی کی تصحیح کرتا ہوں''۔

بلاشبہ یہ ساری باتیں ان کی فطری ذہانت وذکاوت پر دلالت کرتی ہیں اور شاہ عبدالعزیز صاحب سے منقول بھی ہے، فرمایا کرتے تھے ''مثل والد ماجد شخصے کم نظر آئد'' حافظہ

(۱) الیانع الجنی

کے متعلق ان ہی کی شہادت ہے کہ ''مثل والد ماجد حافظہ ندیدہ ام'' (۱)، ایک اور خاص بات شاہ عبدالعزیز ان کے متعلق یہ بھی بیان کی ہے کہ... ''مریض ہم کم می شدند'' (۲)، بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ صاحب کی ان علمی خدمات و مجتہدات میں ان کی فطری خصوصیتوں کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔

لیکن جو کام جتنی قلیل مدت میں ان سے بن پڑا ہے اور ایسا کام جس کے اکثر حصہ کے وہ موجد ہیں، ان کی کتابوں سے اگر ان ''باکورات'' و ''بدائع'' کا انتخاب کیا جائے جن کے ابتداع و ابتکار کا فخر صرف ان کے نوک خامہ کو حاصل ہے تو بلا مبالغہ ہزار ہا ہزار سے وہ متجاوز ہو سکتے ہیں، تو کیا شاہ صاحب کی اس عبقریت اور نابغیت میں صرف ان کے دل و دماغ کو دخل ہے، ممکن ہے کہ لوگ ایسا ہی خیال کرتے ہوں، خصوصاً اس زمانہ میں ''جینیس'' کا ایک لفظ تراش لیا گیا ہے اور جب کسی شخص کے کام کے متعلق اس قسم کی مدہوش کن اور حیرت انگیز اعجوبہ طرازیوں کا تجربہ ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس ''فن'' کا فلاں شخص ''جینیس'' ہے، اگر شاہ صاحب کے متعلق کوئی وثیقہ مجھے نہ ملا ہوتا تو شاید میں بھی کچھ اسی قسم کی بات کہہ کر یا سن کر چپ ہو جاتا، لیکن الحمدللہ کہ سفر حجاز سے پہلے اور سفر حجاز کے بعد کی شاہ صاحب کی دونوں زندگیوں اور ان کے کارناموں میں جو نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے، اس کی تہہ میں جو حقیقی سبب کارفرما ہے وہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے جو سمجھا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدائے مضمون میں عرض کیا تھا کہ حجاز پہنچ کر شاہ صاحب نے ایک خواب دیکھا تھا اور ایسا خواب کہ اگر اس کی تعبیر پوری نہ ہوتی تو آج ہندوستان کی تاریخ وہ نہ ہوتی جو اس وقت ہے، تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ اس خواب میں شاہ صاحب کو حضرت السلطان الغازی الابدالی اور ان کی فیصلہ کن جنگ جو مرہٹوں سے ہوئی اس کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔

---

(۱) والد ماجد کی طرح بہت کم لوگ نظر آتے ہیں، والد صاحب کی طرح میں نے کسی اور کا حافظہ نہیں دیکھا۔ (ص ۱۱)

(۲) بیمار بھی کم ہوتے تھے (ص ۴۰)۔

شاہ صاحب کی ان محیر العقول علمی خدمات کا اصل راز

ساری دنیا جانتی ہے کہ ''پانی پت'' کے میدان میں اگر اس دن قدرت ابدالی کے حق میں فیصلہ نہ کرتی تو یقیناً ہندوستان میں مرہٹوں کی حکومت قائم ہو چکی ہوتی اور مرہٹوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کا جو انجام ہوتا وہ یوں بھی ظاہر ہے، پیشتر اس قوم کے جن نصب العینوں کا تھوڑا بہت ذکر آ چکا ہے ان سے بھی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے، لوگ کچھ بھی خیال کریں لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ ان ہی مرہٹوں کے مظالم سے تنگ آ کر جو حجاز بھاگا تھا اس کو اس فتنہ کے قلع قمع کی بشارت اس خواب کے ذریعہ سے دی گئی تھی، اور جس طرح کفر کے اس استیصال کی خبر سے وہ مبشر ہوئے ٹھیک اسی سفر میں ان کو ایک اور مژدہ اور کامیابی کی خوش خبری سے سرفراز فرمایا گیا تھا جس کا ذکر شاہ صاحب نے حالانکہ اپنی ایک نہیں بلکہ متعدد کتابوں میں کیا ہے، لیکن لوگ اس کو پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، حالانکہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، شاہ صاحب کی ساری انقلابی زندگی اور حجاز سے واپسی کے بعد ان سے اسلام کی جو عظیم خدمتیں بن آئیں ان سب کا قصہ اسی وقت ختم کر دیا گیا تھا، واقعہ اسی وقت ہو چکا تھا صرف اس کا ظہور ہندوستان آ کر ہوا، میرا اشارہ صاحب کے اس مشہور خواب کی طرف ہے جس کا ذکر حجة الله البالغه کے دیباچہ میں بھی کیا گیا ہے، اور فیوض الحرمین ودر ثمین دونوں کتابوں میں بھی ہے، میں پہلے اس خواب کو ''در ثمین'' سے بجنسہ ان ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں فرماتے ہیں:

"كان الحسين والحسن عليهما السلام نزلا في بيتي، وبيد الحسن رضى الله تعالى عنه قلم قد انكسر لسانه وبسط اليّ يده ليعطيني وقال هذا قلم جدى رسول الله ﷺ، ثم قال حتى يصلحه الحسين، فليس ما أصلحه الحسين كما لم يصلحه، فأخذ الحسين رضى الله تعالى منه وأصلحه، ثم ناولينه فسررت به، ثم جيء برداء مخطط فيه خط أخضر وخط أبيض، فوضع بين يديهما فرفعه الحسين

رضی الله تعالی عنه وقال هذا رداء جدی رسول الله ﷺ ثم ألبسني فوضعته على رأسي تعظيماً وحمدت الله تعالى".

"گویا حسین اور حسن علیہما السلام میرے گھر تشریف لائے ہیں اور حسن علیہ السلام کے دست مبارک میں ایک قلم ہے جس کی زبان (نوک) ٹوٹی ہوئی ہے، حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا، تاکہ وہ قلم مجھے عطا فرمائیں اور فرمایا کہ یہ قلم میرے نانا رسول اللہ ﷺ کا ہے، مگر پھر آپ بولے کہ حسین اسے درست کر لیں (تب دوں گا)، اور فرمایا کہ حسین جیسا درست کر سکتے ہیں کوئی دوسرا اتنا درست نہیں کر سکتا، پھر حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس قلم کو لے لیا اور درست فرمایا، میں اس (انعام) سے بہت مسرور ہوا، پھر ایک چادر لائی گئی جس پر دھاریاں بنی ہوئی تھیں، ایک دھاری سبز ایک سفید، پہلے یہ چادر ان دونوں حضرات کے سامنے رکھی گئی پھر حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے اٹھایا اور فرمایا کہ یہ چادر میرے نانا رسول اللہ ﷺ کی ہے پھر وہ چادر مجھے اڑھا دی گئی، تب میں نے تعظیماً اس کو اپنے سر پر رکھ لیا اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا"۔

شاہ صاحب کے اس خواب کی تشریح

شاہ صاحب نے یہ کیا خواب دیکھا؟ ظاہر ہے کہ اس خواب میں چند اجزاء ہیں (۱) حسنین رضی اللہ عنہما کا تشریف لانا۔ (۲) حسن علیہ السلام کے ہاتھ میں ایک ایسے قلم کا ہونا جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ (۳) شاہ صاحب کو دینے کا ارادہ فرمانا مگر پھر حضرت حسین علیہ السلام سے اس قلم کو بنوانا۔ (۴) اور یہ فرمانا کہ "فليس ما أصلحه الحسين كما لو يصلحه"، یعنی جیسا قلم حسین علیہ السلام بنا سکتے ہیں وہ قلم اور جو اِن کا درست کیا ہوا نہ ہو، برابر نہیں ہو سکتے۔ (۵) وہ بن جانے کے بعد اس قلم کو شاہ صاحب کو سپرد فرمانا۔ (۶) اس قلم کو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب فرمانا۔ (۷) پھر شاہ صاحب کو ایک چادر جو "برد یمانی" کی صفات سے موصوف ہے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہے عطا فرمانا۔ (۸) اس کو اڑھا دینا۔

حضرت حسینؓ کی زندگیوں کا انطباق شاہ صاحب کی زندگی پر

میں نے ہر جز کو الگ الگ کر کے اس لئے لکھ دیا ہے تاکہ غور کرنے میں آسانی ہو، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس خواب سے میری سمجھ میں جو کچھ آیا ہے وہی اس کی واقعی تعبیر بھی ہے، لیکن بہرحال میرا ذہن اس خواب سے جن امور کی طرف منتقل ہوا ہے اب اسے عرض کرتا ہوں۔

حضرت حسنین علیہ السلام کی اصل خصوصیت یہی ہے کہ ملت اسلامیہ جب شدید نرغہ میں آئی تو ان میں بڑے صاحب نے اپنی صلح کی روش سے اور چھوٹے صاحب نے مقابلہ اور مقاتلہ کے طریقہ سے اس فتنہ کا مقابلہ کیا، پھر کیوں نہ سمجھا جائے کہ اس وقت ہندوستان میں اسلام جن نرغوں میں گھر گیا تھا، اسی کے مقابلہ کے لئے شاہ صاحب کا انتخاب کیا گیا، اشارہ ادھر تھا کہ شاہ صاحب سے جس مقابلہ کا کام لیا جائے، اس میں صلح و جنگ دونوں طریقوں کو دخل ہوگا، شاہ ولی اللہ نے آنے والے خطرات کے مقابلہ میں مذکورہ بالا جن شش جہتی کارناموں کو پیش کیا، بہ ظاہر تو اس کی صورت جنگ کی نہیں بلکہ ایک مصلحانہ مقابلہ کی تھی، کیونکہ یہ تلوار سے نہیں بلکہ قلم کی جنگ تھی، لیکن اس جہاد میں شاہ صاحب اور ان کے خاندان والوں کو دشمنوں کی جانب سے جو اذیتیں برداشت کرنی پڑیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں کربلائی قربانیوں کے نشانات نہ تھے، ابھی گزر چکا کہ نجف خاں نے شاہ صاحب کے پہونچے اتروا دیئے تھے، صاحب "الیانع" علامہ محسن البہاریؒ لکھتے ہیں کہ "جس وقت شاہ صاحب نے فقہ وحدیث کے صحیح تعلقات کی تنقیح فرما کر کتابیں شائع کیں، جن میں ظاہر ہے کہ "اس تقلید جامد" کی مخالفت کی گئی تھی، جس میں عموماً سرحدی پٹھان اور روہیلے مبتلا تھے، تو قدرتاً ان پر شاہ صاحب کی باتیں سخت شاق گزرتی تھیں"، دلی اس وقت ان ہی لوگوں سے بھری ہوئی تھی، بقول مولانا محسن (۱) کے کہ "غنم کلب" کے بالوں سے زیادہ ان کی تعداد تھی یہ لوگ ہر طرح

(۱) یہ مولانا محسن بہار کے شمالی حصہ ترہت کے رہنے والے تھے، خضر چک ضلع مونگیر میں ان کا عجب کتب خانہ اب تک موجود ہے، اگرچہ بڑا حصہ اس کا بقرعید کی قربانی کے جھگڑے میں ہندوؤں کے ہاتھ...........

سے شاہ صاحب کے درپئے آزار ہوئے، وہ لکھتے ہیں:

"لم يصده شئ من ذلك مما كان عليه من ترجيح ما وافق من أقوال الفقهاء ظواهر السنن والآثار ومن بيان ما صفا مورده من ذلك عما ترنّق، فكان يصرح بها بين ظهرانيهم نصحا للأمة ووفاء بعهد الله الذى واثق به العلماء"(۱).

"ان لوگوں کی مخالفتیں شاہ صاحب کو اس طرز عمل سے نہ روک سکیں، جو ظاہر سنن و آثار کے مطابق فقہاء کے اقوال کو ترجیح دینے کا تھا، اور اس سلسلہ میں جو مسلک صاف ستھرا تھا اس کو مکدر طریقہ سے وہ جدا کرتے تھے، شاہ ولی اللہ ان متصلب سخت پٹھانوں کے درمیان اپنے اس مسلک کا اظہار فرماتے تھے، مقصد امت کی بہی خواہی تھی اور خدا کے اس عہد کو پورا کرنا تھا جس کا علماء سے وعدہ لیا گیا ہے"۔

فتح پوری کی مسجد میں قتل کے ارادہ سے شاہ صاحب کا جو محاصرہ کیا گیا اس کا ذکر بھی گزر چکا، پھر اس کے بعد آپ کے خاندان پر جو مظالم توڑے گئے اس کا اندازہ شاہ عبدالعزیز کی بعض روایتوں سے ہوتا ہے، مثلاً ملفوظات میں ہے:

"چوں در شہر کہنہ بودم بسیار از رفضاء وفساق وبرادران حسود تکلیفہا می کشیدم"

"جب ہم پرانی دلی میں تھے، تو رافضیوں اور فاسقوں اور حسد کرنے والے بھائیوں سے بہت تکلیفیں میں نے اٹھائیں"۔

پھر ان "تکلیفہا" میں سے ایک تکلیف کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"بعضے قریب خانہ ما تعزیہ برسقف می کردند، وتبرا وسب ہم می نمودند"۔

(بعض لوگ میرے گھر کے پاس اپنے کوٹھے اور بالاخانوں پر تعزیہ رکھتے اور تبرا بکتے (اور خلفاء ثلاثہ کو) گالیاں دیتے" (اور اس طرح مجھے ایذا پہنچاتے)۔

یہ تو خیر شیعوں کا سلوک تھا، "فساق" کا برتاؤ کیا تھا، اس کی مثال یہ ہے کہ:

"روزے فاجرہ شراب خوردہ در وقت تراویح در عین قرأت قرآن شعر حافظ شیراز:

......برباد ہوگیا، مولانا محسن نے ہندوستان میں تحصیل علم کے بعد حجاز اور دوسرے اسلامی ممالک میں بھی کچھ پڑھا تھا، خاکسار کو آپ سے اور آپ کے خاندان سے قرابت قریبہ کے تعلقات ہیں۔

(۱) الیانع

در کوئے نیک نامی مارا گذر ندادند
گرتو نمی پسندی تغییر کن قضارا

خواند، وبعضے دفہا وآوازہا می زدند کہ قرات مشتبہ شود"۔

"ایک دن ایک فاحشہ عورت نے شراب پی کر تراویح کے عین قرأت قرآن کے درمیان حافظ شیرازی کا یہ شعر گانا شروع کردیا:

در کوئے نیک نامی مارا گذر نداوند
گرتو نمی پسندی تغییرکن قضارا

اور بعض لوگ ڈھول تاشے بجاتے اور شور پکار بلند کرتے تاکہ میری قرأت میں گڑبڑ پیدا ہو"۔

شاہ صاحب کے خاندان پر کربلائی مصائب

اور یہ تو خیر معمولی باتیں ہیں، حضرت قبلہ امیر شاہ خاں صاحبؒ نے تو جس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے سن کر کلیجہ دہل جاتا ہے، فرماتے ہیں کہ وہی نجف خاں (۱) جس نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروائے تھے اسی نے:

"شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو اپنے قلمرو سے نکال دیا تھا، اور یہ ہر دو صاحبان مع عورتوں کے شاہدرہ تک پیدل آئے تھے"۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی مستورات کے ساتھ میدان کربلا میں جو فاضحات ناگفتہ بہ پیش آئے تھے کیا اسکی جھلک اس واقعہ میں نہیں پائی جاری ہے، شاہ ولی اللہ کی بہوئیں اور پوتیاں اس بے سروسامانی کے ساتھ دلّی سے پیادہ پا آئی ہیں، پھر انہی کا بیان ہے کہ شاہدرہ سے عورتوں کی سواری کا نظم تو حضرت مولانا فخر الدینؒ کی سفارش سے ہوگیا لیکن:

(۱) مغل دربار کا آخری امیر تھا، جس کے بعد ہی لال قلعہ پر غیروں کا قبضہ ہوگیا، دراصل یہ شروع میں نواب وزیر اودھ کی وزارت کا دلی میں نائب تھا، لیکن بعد کو خود مستقل بن بیٹھا اور آخری ہانڈی حکومت کی اسی کے سر پھوٹی۔

"شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو سواری بھی نہ ملی تھی، اور شاہ رفیع الدین صاحب تو پیدل لکھنؤ چلے گئے تھے، اور شاہ عبدالعزیز صاحب پیدل جون پور چلے گئے تھے"۔

سیدنا حسینؓ کے صاحبزادے امام زین العابدین "بیمار" کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا تھا کیا اسی کا ظل ولی اللہ کے بیمار صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحب میں نہیں ہے، ملفوظات میں ہے کہ شاہ صاحب کو بائیس قسم کی بیماریاں تھیں، لیکن ظالموں نے رحم نہیں کیا اور دلی سے پیدل جون پور دوڑا دیا، دونوں بھائی سفر میں ساتھ ہوتے تو شاید گونہ تسلی ہوتی، لیکن امیر شاہ خاں صاحب کا بیان ہے کہ:

"ان دونوں کو نہ سوار ہونے کا حکم تھا اور نہ ساتھ رہنے کا"۔

خاں صاحب نے اسی سلسلہ میں یہ بھی بیان کیا کہ:

"دو دفعہ روافض نے شاہ عبدالعزیز صاحب کو زہر دیا تھا اور چھپکلی کا ابٹن ملوایا دیا تھا جس سے شاہ صاحب کو برص کا مرض ہو گیا تھا"۔

مجھے یاد آتا ہے کہ امیر شاہ (۱) خاں صاحب ہی سے میں نے یہ بھی سنا تھا کہ جس وقت شاہ عبدالعزیز پیدل جونپور بھیجے گئے، یہ موسم ٹھیک جیٹھ کا تھا، سخت لو کے دن تھے، امیر الروایات میں بھی اتنا موجود ہے کہ:

"جونپور کے سفر میں شاہ صاحب کو لو بھی لگ گئی تھی، جس سے مزاج میں سخت حدت پیدا ہو گئی تھی اور جوانی ہی میں بینائی جاتی رہی تھی، اور ہمیشہ سخت بے چین رہتے تھے" (۲)۔

اور آخر میں تو شاہ ولی اللہ کے پوتے مولانا اسمٰعیل صاحب اور اسی خاندان کے تربیت یافتہ بزرگ حضرت سید احمد بریلویؒ نے بالاکوٹ میں جس واقعہ کی تصویر پیش کی، اس پر تو کربلا کی ظلیت کا خاتمہ ہی ہو جاتا ہے۔

(۱) دارالعلوم دیوبند کے متوسلین میں شاید ہی کوئی ہوگا، جو حضرت امیر شاہ خاں سے واقف نہ ہوگا، خاکسار پر بڑی نظر عنایت تھی، بلکہ ولی اللٰہی خاندان سے خاص نیاز خاں صاحب ہی کی بدولت ابتدا میں حاصل ہوا اور حضرت شیخ الہندؒ کی غلامی و بیعت سے سرفرازی بھی انہیں کی بدولت حاصل ہوئی۔

(۲) ص ۴۳

بہرحال اس خواب میں حسنین علیہما السلام کے دیدار سے شاہ صاحب کا مشرف ہونا، محض اتفاقی واقعہ نہ تھا، اس کے بعد حضرت حسن علیہ السلام کے دست مبارک میں ٹوٹے ہوئے قلم کا ہونا جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت سے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں بھی قابل ذکر مصنف پیدا نہیں ہوا تھا، تصنیف کا ذوق وشوق تو باقی تھا لیکن کتابوں میں صرف لفظوں کی بھرمار ہوتی تھی، انتہا یہ تھی کہ تاریخ جس کا سرمایہ صرف واقعات ہیں اس کی کتابوں میں بھی ادھر دو تین صدیوں سے یہ آفت آئی ہوئی تھی کہ محض لفظوں کی دھڑا بندی کی جاتی تھی، علماء اسلام کے جو تذکرے ادھر تیار ہوئے ان میں دیکھیے، بقول نواب علامہ حبیب الرحمان شروانی سوئے "البحر العلام والبحر القمقام" کے ہم قافیہ الفاظ کے سوانح حالات کی ایک سطر نہیں ملتی، بے مائیگی میں یہی حال دوسرے علوم وفنون کی کتابوں کا بھی تھا، تو میرے خیال میں گویا اسی کی طرف ٹوٹے ہوئے قلم سے اشارہ کیا گیا تھا، اور اب یہ "قلم" شاہ ولی اللہ کے سپرد ہو رہا تھا، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اصلاح کی راہ میں شاہ صاحب کو جو قلم دیا جا رہا تھا اس میں اشارہ کر دیا گیا تھا کہ حسنی رنگ کے ساتھ ساتھ حسینی واقعات کے تجربے پیش آئیں گے، اور یہ جو امام حسن علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "حسین جیسا بناتے ہیں ویسا دوسرا نہیں بنا سکتا" تو اس میں گویا اشارہ تھا کہ ہر چیز سے بے پروا ہو کر صرف حق کی حمایت میں میدان میں کود جانا چاہیے، اور میں بیان کر چکا کہ شاہ صاحب نے اس راہ میں کیسی جرأت دکھائی، اپنی تصوف کی کتابوں میں جب مشائخ عصر پر وہ تنقید فرماتے ہیں، جانتے ہیں کہ ملک ان ہی لوگوں کے زیر اثر ہے، ان کا ایک اشارہ فتنہ کی آگ کو روشن کر دینے کیلئے کافی ہے، لیکن متعدد مقامات پر یہ ارقام فرماتے جاتے ہیں:

"ہر چند ایں سخن بر بسیارے از صوفیان زمان دشوار خواہد بود، اما مرا کارے فرمودہ اند برحسب آں می گویم، بازید وعمرو کارے نیست" (۱)۔

"ہر چند میری یہ بات اس زمانہ کے صوفیوں پر گراں گزرے گی لیکن مجھے ایک کام کا

(۱) وصیت نامہ ص ۸

حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق کہہ رہا ہوں، مجھے زید وعمرو سے کوئی سروکار نہیں"۔

آخر میں شاہ صاحب کو بُرد یمانی کے نیچے دونوں حضرات لے آتے ہیں، یعنی یہ فرماتے ہوئے کہ:

"هذا رداء رسول الله ﷺ" (یہ میرے نانا رسول اللہ ﷺ کی چادر ہے)۔

وہ چادر حضرت شاہ ولی اللہ کو اڑھا دیتے ہیں، غالباً یہ ادھر اشارہ تھا کہ سب کچھ ہوگا، مخالفین بھی ہوں گے، دشمن ستائیں گے بھی، لیکن زیر سایہ عاطفت نبوت کبریٰ علی صاحبہا الف سلام وتحیہ چونکہ شاہ صاحب کی زندگی گزرے گی، اس لئے ردائے محمدیؐ کے سایہ میں پناہ لینے والوں پر انشاء اللہ مخالفین کی کچھ پیش نہ جائے گی اور ان کو خائب وخاسر ہوکر واپس ہونا پڑے گا، اور شاہ صاحب کے قلمی آثار کو دنیا میں فروغ ہوگا، بلکہ "ٹوٹے ہوئے قلم" کے بعد اسلامی دنیا میں ایک نیا دور تصنیف وتالیف کا شروع ہوگا، جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ یہی ہوا، خود شاہ ولی اللہ صاحب نے "الدر الثمین" میں جہاں اس خواب کو نقل فرمایا ہے اس کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

"فمن يومئذ انشرح صدري للتصنيف في العلوم الشرعية" (ص ۲۰)

(اسی دن سے میرا سینہ شرعی علوم میں تصنیف کے لئے کھل گیا)۔

جس کا صاف اور کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ شاہ صاحب کی آئندہ زندگی میں تصنیفی کوششوں کا جو سلسلہ شروع ہوا، اور وہ بڑھا اور اس حد تک بڑھا، کہ اب نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر، ترکی، حجاز اور کابل تک کے جامعات ومدارس میں آپ کی کتابیں داخل درس ہیں، اور ان ہی ممالک کے مطابع سے آپ کی کتابیں چھپ چھپ کر ہندوستان آرہی ہیں، ان تمام کوششوں کی تہہ میں "حقیقی مؤثر" ترغیب کی یہی قوت تھی۔

شاہ صاحب کے تجدیدی کارناموں میں فیض روح القدس کا دخل

بے شک شاہ صاحب بچپن ہی سے غیر معمولی طبیعت وفطرت کے مالک تھے، لیکن آپ کے ان حکیمانہ ومجددانہ کارناموں میں صرف آپ کی طبیعت ہی کو دخل نہیں ہے اور نہ آپ

کے والد ماجد ودیگر اساتذہ کی تعلیم وتربیت ہی کا اس کو نتیجہ کہا جاسکتا ہے بلکہ نگاہ انتخاب نے اب شاہ ولی اللہ کو وہ ولی اللہ باقی نہیں رکھا تھا، اب شاہ صاحب کی زبان پر کوئی اور بول رہا تھا اور ان کی انگلیوں میں اب کسی اور کا قلم چل رہا تھا۔

سالے کہ نکوست از بہارش پیدا ست

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب ایک دن اپنے والد کے اس خواب کا تذکرہ فرما رہے تھے، جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ آخر میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد:

"حال نسبت وعلم تقریر دگرگوں شد" (نسبت وتقریر اور علم کی حالت دگرگوں ہوگئی تھی)

چنانچہ شاہ ولی اللہؒ کا رنگ اس کے بعد اتنا بدل گیا تھا کہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ ان کے والد کے جو پرانے شاگرد تھے وہ سفر حجاز سے واپسی کے بعد آپ کی حالت کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے تھے کہ پہلی بات ان کی باقی نہیں رہی ہے، شاہ عبدالعزیز کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"چنانچہ مستفیضان سابق ہرگز نسبت سابق نمی کردند"

(چنانچہ جن لوگوں نے شاہ صاحب سے پہلے فیض پایا تھا، (یعنی شاگرد ومرید) وہ پہلی نسبت کا آپ میں بالکل احساس نہیں کرتے تھے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک مصیبت زدہ مسافر حجاز پہونچا تھا، اخلاص وصداقت کے ساتھ پہنچا تھا جو رنگ لاکر رہا، خود شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ جب مدینہ منورہ کی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تو:

"دراں میاں بروضہ منورہ حضرات سید البشر علیہ افضل الصلوات واتم التحیات متوجہ شد وفیضہا یافت" (انفاس)

"اس عرصہ میں حضرت سید البشر (علیہ افضل الصلوات واتم التحیات) کے روضۂ منورہ کی طرف متوجہ رہتا تھا اور اس سے بڑے بڑے فیض حاصل کئے"۔

ان ہی "فیضہا" کی شرح وتفصیل میں شاہ صاحب نے ایک مستقل کتاب "فیوض الحرمین" ارقام فرمائی ہے، شاہ صاحب کے ساتھ کیا کیا نوازشیں ہوئی ہیں، ان کی تفصیل اسی

کتاب میں پڑھنا چاہیے، مجھے تو اس وقت صرف یہ کہنا کہ مرہٹوں کے فتنہ کا ازالہ اورآئندہ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق جوسوالات پیدا ہوئے تھے اور پیدا ہونے والے تھے ان کے جوابات اوران مشکلات کا جوحل شاہ ولی اللہ کے قلم نے پیش کیا یہ درحقیقت انہی مدنی ''مفیضہا'' کا کرشمہ تھا....اورشاہ صاحب نے اسی ''فیوض الحرمین'' میں اپنے متعلق جویہ دعوی کیا کہ:

"سلكني رسول الله ﷺ ...... وربانی بیده فأنا أو يسيّه وتلميذه بلا واسطة بيني وبينه"(۱)۔

''مجھے رسول اللہ ﷺ نے خودسلوک کا راستہ طے کرایا اوراپنے دست مبارک سے میری تربیت فرمائی، اسلئے میں آپ کا اویسی ہوں اور حضور ﷺ کا بالواسطہ شاگرد ہوں''، تو اس کی حقیقت بھی ان فیوض پرغور کرنے سے کھل جاتی ہے۔

سفرحجاز کے بعدشاہ صاحب کی زندگی کا خاص دور

بہرحال شاہ صاحب میں جونشہ حجاز میں بھرا گیا تھا، اس سے مست ہوکر جب وہ ہندوستان واپس ہونے لگے ہیں، اس وقت ان کے دل میں کن کن ولولوں کا زور تھا اور کن حوصلوں کو لے کر چلے تھے، انفاس العارفین کے ایک واقعہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے، اپنے سب سے بڑے شیخ الحدیث علامہ ابوطاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی سے جب آخری دفعہ رخصت ہونے کے لئے ملنے تشریف لے گئے تو خودفرماتے ہیں:

''ایں فقیر برائے وداع نزدیک شیخ ابوطاہر رفت ایں بیت برخواندم''
''فقیر رخصت ہوتے وقت شیخ ابوطاہر کے پاس حاضر ہوااور یہ شعرمیں نے پڑھا:

نسيت كل طريق كنت أعرفه
إلا طريقاً يوديني إلى ربعكم

''ہرراہ میں بھول گیا بجزاس راہ کے جوتمہارے گھر تک مجھے پہنچائے''،
کسی ایسے حال سے معمور ہوکر شاہ صاحب نے یہ شعر پڑھا کہ:

(۱) فیوض الحرمین ص۴۴

''بہ مجرد شنیدن آں بکا برشیخ غالب آمد وبغایت متاثر شد''
''سننے کے ساتھ شیخ پرگریہ طاری ہوااور بہت زیادہ متاثر ہوئے''۔

الغرض ہر چیز سے دست بردار ہوکرصرف ایک ''نصب العین'' کوسامنے رکھ کرانہوں نے ہندوستان کی زمین پرقدم رکھا، وہ سالہا سال کا پرانا اورموروثی ذوق درس وتدریس قطعاً غائب ہوچکا تھا، مدرسہ چونکہ باقی تھا اوراس کو باقی رکھنا چاہتے تھے، آپ کے نام پرطلبہ آیا کرتے تھے لیکن اب جوکام پیش نظرتھا اس کے ساتھ ''معلم الصبیانی'' کی زق زق، بق بق کی گنجائش نہ تھی، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ بجائے خود پڑھانے کے:

''والد ماجداز ہر یک فن شخصے تیار کردہ بودند وطالب ہرفن باوے می سپرند''
''والد ماجد نے ہرفن کے لئے ایک شخص تیار کرلیا تھا، جس فن کا جوطالب ہوتا اس کو اسی فن کے استاد کے سپرد فرمادیتے''۔

غالباً ''دوازدہ سالہ تدریس'' کے یہ تیار کئے ہوئے لوگ تھے، اب مدرسہ ان ہی کے سپرد تھا اورخوداپنے لئے کیا مشغلہ باقی رکھا تھا؟ کل تین چیزیں، جیسا کہ شاہ عبدالعزیزؒ کا بیان ہے:

''خودمشغول معارف گوئی ونویسی بودند، حدیث می خوانیدند''
''خودمعارف کے بیان کرنے اورلکھنے کا کام کرتے اورصرف حدیث پڑھاتے''۔

کس ذوق، کس شوق، کس اہتمام واستغراق کے ساتھ حجاز سے واپسی کے بعد ان تین مشغلوں میں شاہ صاحب نے زندگی گزاری، اس کے متعلق بھی شاہ عبدالعزیز صاحب کی عجیب وغریب شہادت ہے، فرماتے ہیں:

''بعد اشراق کہ می نشست تا دوپہر زانو بدل نمی کرد، وخارش نمی نمود وآب دہن نمی انداخت''(۱)۔
''اشراق کے بعد جوبیٹھ جاتے، تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے، نہ کھجلاتے، نہ دہن مبارک سے تھوک پھینکتے''۔

(۱) ص۴۳

ولی اللہی فیوض کی وسعت ونوعیت

شاہ صاحب ۱۱۴۶ھ میں حجاز سے ہندوستان واپس ہوئے اور اپنے کام میں مشغول ہوئے، ٹھیک چار سال بعد دلی کی زمین پر نادر گری کا وہ آسمان ٹوٹا، جس کے خونی افسانوں سے اب تک ملک کے کوچہ وبزرن معمور ہیں، لیکن شاہ صاحب پر جو دھن سوار تھی اس حادثہ کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں پڑا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نادرہی کے چلے جانے کے بعد محمد شاہ نے طلباء کے ہجوم وکثرت یا کسی اور سبب سے بجائے پرانی دلی کے نئے شہر میں خود بلا کر مدرسہ کیلئے وہ حویلی عطا کی جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، اور اسی مدرسہ سے علم کا وہ سیل جرار جاری ہوا کہ آج عرب وعجم میں کم ازکم علم حدیث کا جوزور وشور ہے، بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کی انتہا حضرت شاہ ولی اللہ ہی کے مخلصانہ مجاہدوں پر ختم ہوتی ہے۔

ایک یمنی محدث کی شہادت

مولانا محمد قاسمؒ سے امیر شاہ خاں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ سفر حج میں حضرت کا جہاز یمن کے ساحل کے کسی بندرگاہ پر ٹھہر گیا، معلوم ہوا کہ ابھی چند دن رکا رہے گا، حضرت نانوتوی کو کسی نے خبر دی کہ اس بندرگاہ کے شہر میں ایک کہنہ سال معمر بزرگ محدث رہتے ہیں، ان کی ملاقات کو حضرت تشریف لے گئے، مل کر مولانا نانوتوی ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور درخواست کی کہ حدیث کی سند اجازت عطا ہو، اس پر محدث صاحب نے پوچھا تم کس کے شاگرد ہو؟ انہوں نے اپنے استاد مولانا عبدالغنی مجددی کا نام لیا، محدث صاحب ناواقف تھے، پوچھا عبدالغنی کس کے شاگرد تھے؟ جواب ملا شاہ اسحاق کے، شاہ اسحاق سے بھی وہ ناواقف تھے، پوچھا وہ کس کے شاگرد تھے؟ کہا شاہ عبدالعزیز صاحب کے، شاہ عبدالعزیز کا نام سن کر محدث صاحب رکے، بولے ان کو میں جانتا ہوں اور اس کے بعد فرمایا:

’’شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں

جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں وہاں جنت نہیں ہے، یوں ہی جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں ہے وہاں جنت نہیں ہے‘‘(۱)۔

اور یہ تو یمن کے ایک گمنام محدث کی شہادت ہے، اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ پھر الازہر کے ہم وطن علامہ رشید رضا مصری مرحوم کا قول ذرا زیادہ تفصیل سے نقل کروں، اس سے اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ حضرت حسن علیہ السلام کے دست مبارک میں جو ٹوٹا ہوا قلم تھا اس کا کیا مطلب تھا، علم خصوصاً علم نبوت کی حالت اسلامی ممالک میں کیا ہو رہی تھی۔

علامہ رشید رضا مصری کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں علم حدیث صرف ہندوستانی علماء کی توجہ سے زندہ ہے۔

”ولولاعناية إخواننا علماء الهند بعلوم الحديث فى هذا العصر لقضى عليها بالزوال من أمصار الشرق، فقد ضعفت فى مصر والشام والعراق والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة حتى بلغت منتهى الضعف أوائل هذا القرن الرابع عشر، واننى لما هاجرت إلى مصر سنة ۱۳۱ هـ رأيت خطباء الجامع الأزهر وغيره يذكرون الأحاديث فى خطبهم غيرمخرجة، ومنها الضعيف والمنكر والموضوع، ومثلهم فى هذالوعظ والمدرسون ومصنفوا الكتب فكنت أنكر ذلك عليهم، كما بدأت بانكار مثله على أهل بلدى طرابلس قبلهم“.

’’ہمارے ہندوستانی بھائیوں میں جو علماء ہیں اگر حدیث کے علوم کے ساتھ اس زمانہ میں ان کی توجہ نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا، کیونکہ مصر، شام، عراق، حجاز میں دسویں صدی ہجری سے یہ علم ضعف کا شکار ہو چکا تھا اور چودھویں صدی کے اوائل تک ضعف کی آخری منزل پر پہونچ گیا تھا، میں نے جب ۱۳۱۵ھ ہجری میں مصر ہجرت کی تو ازہر کی مسجدوں کے خطیبوں کو اور دوسری مسجدوں کے خطیبوں کو دیکھا، کہ اپنے خطبوں میں ایسی حدیثیں پڑھتے ہیں جن کا پتہ نہیں، ان میں ضعیف، منکر اور موضوع جعلی روایتیں بھی ہوتی ہیں اور یہی حال واعظوں، مصنفوں، مدرسوں سب کا تھا، میں ان کو ٹوکتا تھا جیسا کہ اپنے وطن طرابلس میں بھی یہی کرتا‘‘ (مقدمہ مفتاح کنوز السنة)

(۱) ص ۱۵۰

یہ مصر کے ایک فاضل جلیل اور چودھویں صدی کے ایک ناقد بصیر کی گواہی ہے جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ کسی ایک ملک میں نہیں بلکہ مصر، شام، عراق، حجاز جو اسلام کے گہوارے ہیں ان سب میں دسویں صدی سے مسلمانوں کا یہی حال ہو گیا تھا اور کسی ایک طبقہ ہی میں جہل کی حکومت قائم نہیں تھی بلکہ دین وعلم کے جو جو گروہ خادم تھے یعنی واعظ، خطیب، مدرسین ومعلمین حتی کہ مصنفین ومؤلفین سب ہی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ نبوت کے علم سے بے پروا ہو چکے تھے، غلط سلط غیر معتبر اور گڑھی ہوئی حدیثوں پر لوگوں کا دارومدار رہ گیا تھا، شاہ ولی اللہ صاحب کو علم نبوت (حدیث) کے اسی حال کا تمثیل اگر ایسے قلم کی شکل میں ہوا جس کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی تھی، اور جب مصر وحجاز، عراق وشام جیسے ممالک علم حدیث سے دسویں صدی ہجری تک بے تعلق سے ہو گئے تھے تو پھر خراسان، ترکستان، ایران وغیرہ جہاں ایک مدت سے اس ''علم'' کا چرچا مٹ چکا تھا ان کی جو حالت ہو گی وہ ظاہر ہے۔

علامہ رشید کا یہ اقرار کہ ''اگر علماء ہند کی توجہ اس علم کی طرف نہ ہوتی تو اس علم کا مشرقی ممالک میں خاتمہ ہو جاتا''، سب جانتے ہیں کہ یہ علماء ہند کی نہیں بلکہ براہ راست حضرت شاہ ولی اللہؒ کی خدمت کا اعتراف ہے، اس لئے کہ ہندوستان میں حدیث کا جو کچھ بھی چرچا پچھلے دنوں ہوا سب کی انتہا بالآخر حضرت شاہ صاحب ہی کے وجود باوجود پر ہوتی ہے، گویا شاہ صاحب کو حسنین علیہما السلام نے جو قلم عطا فرمایا تھا یہ دراصل اسی قلم کے کارناموں کا اقرار ہے، کیونکہ شاہ صاحب کے وہ سارے علمی مجاہدات جن کے اثر سے بالآخر اس ملک میں حدیث کے فن کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ان کا تعلق اسی قلم سے ہے، انہوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا اسی قلم کے ملنے کے بعد کیا، بلکہ عوام تو شاید خواب کے اس قلم کو خواب وخیال والا قلم خیال کرتے ہوں گے، لیکن جس شخص کا خود ذاتی مشاہدہ تھا کہ ان کے والد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کو خواب ہی میں دربار رسالت پناہی سے محاسن (ڈاڑھی مبارک) کے دو بال عطا ہوئے تھے، شاہ

ولی اللہ کا بیان ہے کہ حالت بیداری میں یہ دونوں موئے مبارک ان کے والد کو ملے جو ایک مدت تک خود ان ہی کے پاس رہے اور جب تبرکات تقسیم ہونے لگے تو:

''یکے ازاں دو موئے بکاتب حروف عنایت فرمودند''۔ (انفاس ص ٤١)

''تو ان دو موئے مبارک میں سے ایک موئے مبارک کاتب حروف کو عنایت فرمایا''۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیف کی ایک خاص خصوصیت ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے جو یہ بیان فرمائی کہ:

''بعد مراقبہ ہر چہ بکشف می رسید می نگاشتند'' (ملفوظات ص ٤٠

''مراقبہ کے بعد جو چیز کشفی طور پر آپ کو معلوم ہوتی اسے ارقام فرماتے تھے''۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اس ''مراقبہ'' میں شاہ صاحب کا رخ کس طرف ہوتا تھا اور اس سے کیا مقصود تھا، ان تصانیف کے لیے آپ کو جس مقام سے قلم ملا تھا، اسی طرف توجہ کر کے بیٹھ جاتے یا خواب والے قلم کو پھر اپنے اندر بیدار کرتے تھے یا اس کے سوا کوئی اور چیز آپ کے پیش نظر تھی، بہرحال اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی کتابوں کا ڈھنگ جو نرالا معلوم ہوتا ہے اس میں ان کی تصنیف وتالیف کی ان خاص خصوصیتوں کو بھی ضرور دخل ہے بلکہ شاہ صاحب کی عبارت میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ''جوامع الکلم'' کی جھلک جو نظر آتی ہے اس میں بھی قصد سے زیادہ ان کے اسی طریقۂ عمل کو شاید دخل ہو۔

الغرض سفر حجاز سے واپس ہونے کے بعد جیسا کہ اپنے استاد سے رخصت ہوتے وقت فرمایا تھا اور غالباً اسی کا ترجمہ شاہ عبدالعزیز نے یہ فرمایا ہے جو ان کے ملفوظات میں منقول ہے کہ:

''پدر من وقت رخصت از مدینہ از استاد خود عرض کرد، واو خوش می شد کہ ہر چہ خواند بودم فراموش کردم الا علم دین یعنی حدیث'' (١)۔

''کہ میرے والد نے مدینہ منورہ سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے استاد سے عرض کیا اور استاد کو اس سے بہت خوش ہوئی کہ میں نے جو کچھ پڑھا تھا بجز علم دین یعنی حدیث کے بھلا دیا''۔

(١) ص ٩٣

من آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم — الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

گویا.....:

جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے — سو وہ ایک دم میں بھلا دیا(۱)

اب ان کا مشغلہ صرف یہی رہ گیا تھا کہ متوسلین وتلامذہ کے سامنے اسرار وحقائق پر تقریر فرماتے رہتے تھے یا حدیث کا درس دیا کرتے تھے یا لکھتے رہتے ،اوراس شان کے ساتھ لکھتے رہتے تھے کہ ہر مسئلہ ''مراقبہ'' کے بعد درج کتاب ہوتا، حدیث کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کے درس کا ایک جزء اور بھی تھا، جس کا ذکر شاہ عبدالعزیز نے دوسرے مقام پر فرمایا ہے،فرماتے ہیں کہ:

''معمول والد ماجد آں بود کہ بعد ختم قرآن حدیث می شد''(۲)۔

''والد ماجد کا معمول یہ تھا کہ ختم قرآن کے بعد حدیث کا دورہ شروع کراتے''۔

جس سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحاح کا درس جس کا نام اس زمانہ میں ''دورۂ حدیث'' پڑ گیا تھا، اس سے پہلے شاہ صاحب قرآن کا دورہ بھی کرالیا کرتے تھے، اور بغیر تفسیر کے مجرد متن قرآن پڑھانے کی ترویج کم از کم ہندوستان میں شاہ ولی اللہؒ ہی کی ایجاد ہے(۳)، اگرچہ افسوس ہے کہ اب مدارس خصوصاً ولی اللٰہی مدارس میں بھی یہ طریقہ ترک کردیا گیا ہے ،اورمحض ان حلقوں تک جن میں عامی شریک ہوتے ہیں ،بعض شہروں کی مساجد تک حضرت کی یہ ''سنت'' باقی رہ گئی ہے۔

متن قرآن کے درس کے متعلق شاہ صاحب کی ہدایت

آپ نے وصیت نامہ میں طریقہ تعلیم کے متعلق جو ایک ''نظام نامہ'' مرتب فرمایا ہے،

(۱) اصل مصرعہ ہے: جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے — اسے صاف دل سے بھلا دیا

(۲) ص ۷

(۳) ''الجزء اللطیف''، میں شاہ صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد آپ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیمؒ ڈال چکے تھے۔(مولانا منظور نعمانی)۔

اس میں فرماتے ہیں کہ:

''قرآن عظیم درس گویند بآں صفت کہ صرف قرآن بخوانند بغیر تفسیر وترجمہ گوید، ودر آنچہ مشکل باشد درنحو یا درشان نزول متوقف شود، وبحث نمائند، بعد فراغ از درس تفسیر جلالین رابقدر درس بخوانند، دریں طریق فیضہاست''

''قرآن عظیم کا درس دینا چاہیے اس طریقہ سے کہ صرف قرآن پڑھا جائے یعنی تفسیر کے بغیر صرف متن قرآن اور ترجمہ پڑھا جائے، پھر قرآن کے متن کے متعلق جو دشواری پیش آئے مثلاً نحو کے متعلق یا شان نزول کے متعلق تو رک جانا چاہیے کہ اس کی تحقیق کی جائے، پھر جب قرآن ختم ہوجائے تب نصاب تک جلالین پڑھائی جائے اس طریقہ میں بڑے بڑے فیض ہیں''۔

واقعہ ہے کہ آج جتنا زور عربی مدارس کے قدیم سلسلوں میں حمد اللہ اور میر زاہد کی عبارتوں کے حل پر دیا جاتا ہے یا نئے مدرسوں میں ادب وانشاء وغیرہ میں سر مارا جاتا ہے اگر اسی وقت کو قرآنی آیات کے حل ہی میں صرف کیا جائے تو جو کتاب صرف مغز ہی مغز ہے اس سے علماء اور طلباء کو کیسے کچھ فیوض پہنچ سکتے ہیں، تفسیروں کے درس میں عموماً آدمی حق تعالیٰ کے کلام سے ہٹ کر پھر اپنے ہی جیسے انسانوں کی تعبیروں میں الجھ جاتا ہے اور اسی کے مشکلات میں اتنا وقت صرف ہوجاتا ہے کہ قرآنی آیات کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا، صرف قرآن کے پڑھانے سے آدمی پر عجیب وغریب حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کے متعلق بڑے تجربہ کی بات فرمائی ہے کہ:

''مردماں چنانچہ درقرآن متلذذ می شوند درحدیث نہ، ومارا ہم چنانچہ درقرآن معنے ہائے عجیب وغریب دست می دہد وآمدی باشد درحدیث نہ، درحدیث موافق کتب بیان می کنم''(۱)۔

''لوگ جتنا قرآن سے لذت گیر ہوتے ہیں اتنی لذت ان کو حدیث میں نہیں ملتی اور خود ہمارا حال بھی یہی ہے کہ جتنے عجیب وغریب مطالب قرآن میں ہاتھ آتے ہیں اوراس

(۱) ص ۷

میں آمد معلوم ہوتی ہے، حدیث میں یہ بات حاصل نہیں ہوتی، حدیث کے درس میں تو وہی بیان کرتا ہوں جو کتابوں میں ہے"۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قرآن میں جب تدبر کیا جاتا ہے تو بغیر کتابی امداد کے خود بخود مطالب کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں، بخلاف حدیث یا کسی دوسرے فن کے کہ اس کے درس میں عموماً شرح وحواشی کی ہی ریزہ چینی ہوتی ہے۔

شاہ صاحب کے باقیات صالحات

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے متعلق جو کچھ میں لکھنا چاہتا تھا خدا کا شکر ہے کہ وہ لکھا جا چکا، اب آپ کے "باقیات صالحات" اولاد امجاد کے مختصر تذکرہ پر اس سلسلہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

سب ہی کو معلوم ہوگا کہ شاہ صاحب قدس سرہ کو حق تعالی نے علاوہ اس اولاد کے جو صغرسنی ہی میں وفات پاکر آپ کے لئے "اجروذخر" بن چکی تھی، چار فرزند عطا فرمائے تھے جو فرزندی کے علاوہ آپ کے صحیح جانشین بھی تھے، یعنی شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی۔

وفات سے پہلے چاروں صاحبزادوں کی خلافت

شاہ صاحب نے اس دنیا سے جاتے وقت باضابطہ طور پر بھی ان چاروں حضرات کو اپنا جانشین (خلیفہ) بنایا تھا، شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات ہی میں ہے کہ وفات سے تھوڑی دیر پہلے:

"حضرت شاہ ولی اللہ محدث دستار برسر ہر چہار فرزندان نہادہ بودند"

"آپ نے چاروں فرزندوں کے سروں پر دستار مبارک رکھ دی تھی یا باندھ دی تھی"۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ حضرت نے اپنے چاروں صاحبزادوں کو اپنا خلیفہ وجانشین قرار دیا، یہاں سوچنے بلکہ عبرت کی ایک چیز ہے کہ اسی دلی میں ایک دیندار بادشاہ نے اپنے چند بیٹوں کو اسی طرح دنیا میں اپنا جانشین قرار دیا تھا، جیسا کہ مؤرخ فرید آبادی رقمطراز ہیں کہ:

"اورنگ زیب نے اپنی زندگی میں بڑے بیٹے محمد معظم کو شمالی ہند اور کابل کی حکومت

سونپ دی تھی، وسط ہند، گجرات باپ کے چہیتے بیٹے محمد اعظم کے زیر انتظام تھے اور جنوبی ہندوستان شہزادہ کام بخش کے حوالہ کردیا گیا تھا"۔

فرید آبادی اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

"اسی نظام کے مطابق وہ سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کرنا چاہتا تھا"۔

لیکن دنیا کے ان تین بادشاہوں نے ہندوستان اور کابل جیسے وسیع وعریض علاقوں میں اپنے لئے گنجائش نہ پائی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا ہو، لیکن اسی دلی میں دین کا ایک سردار اپنے تین نہیں بلکہ چار بیٹوں کے سر پر خلافت کی دستار باندھتا ہے۔

شاہ صاحب کے چاروں صاحبزادوں کے باہمی تعلقات

پھر دین کے ان چار شہزادوں نے زندگی کس طرح گزاری اس کا اندازہ ان تعلقات سے ہوسکتا ہے جو ان چاروں بھائیوں میں آخر عمر تک باقی رہے! امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ:

"شاہ عبدالقادر کا کھانا اکبری مسجد روزانہ شاہ عبدالعزیز ہی کے گھر سے جاتا تھا، وہی اپنے اس متوکل بھائی کے کپڑے بنا دیا کرتے تھے، شاہ عبدالعزیز باوجود بڑے ہونے کے شاہ عبدالقادر کی ولایت کے کس حد تک قائل تھے، اس کے متعلق وہی مشہور بات کہ عید کا چاند تیس کا ہوگا یا انتیس کا، اس کا پتہ چلانے کے لئے ہمیشہ حضرت شاہ عبدالعزیز رمضان کی پہلی تاریخ کو آدمی بھیج کر دریافت کراتے کہ: میاں عبدالقادر نے آج کے سپارے پڑھے ہیں؟ اگر آدمی یہ آکر کہتا کہ آج دو پڑھے ہیں تو شاہ صاحب فرماتے کہ عید کا چاند تو انتیس ہی کا ہوگا، یہ بات دوسری ہے کہ ابر وغیرہ کی وجہ سے دکھائی نہ دے اور حجت شرعی نہ ہونے کی وجہ سے ہم رویت کا حکم نہ لگا سکیں"(۱)۔

علی ہذا شاہ رفیع الدینؒ سے شاہ عبدالعزیز کو جو دلی تعلق تھا اس کا اندازہ بھی اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ جب شاہ رفیع الدینؒ کو لوگ دفن کرکے فارغ ہوئے، اس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک خاص کیفیت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ:

"مرا چار رشتہ بود، یکے برادر حقیقی ودم قبلہ گاہی (حضرت شاہ ولی اللہ) مرا بہ تقریبے

(۱) امیر الروایات ص ۱۰۵

دادند کہ فرزند تست ، سیومی شیر دایہ من نوشیدہ ، چہارم شاگردً''

''رفیع الدین سے میرا چار طرح کا رشتہ تھا ایک تو حقیقی بھائی تھے دوسرے یہ کہ قبلہ گاہی (والد ماجد) نے ایک تقریب سے انہیں میرے سپرد کر کے کہا کہ یہ تمہارا لڑکا ہے، تیسرے ہم نے اور انہوں نے ایک ہی دائی کا دودھ پیا تھا، چوتھے وہ میرے شاگرد تھے''۔

کسی نے اس سلسلہ میں عرض کیا کہ شاہ رفیع الدین سے اس خاندان کی بڑی علمی عزت تھی، شاہ عبدالعزیز نے اس وقت جو جملہ فرمایا وہ سچی اور خالص محبت کی کتنی اچھی تعبیر ہے فرمایا:

''اگر جاہل ہم می بودند مرا ہم چناں درد بودے''

''اگر وہ جاہل بھی ہوتے تو مجھے ان کا اسی قدر درد ہوتا''۔

جامع ملفوظات نے مولانا رفیع الدین کے جنازے کی کیفیت اور شاہ عبدالعزیزؒ کا باوجود نابینا ہونے کے ان کی چارپائی اٹھانے کی کوشش اور انتہائی ضبط کی کوشش کے باوجود بار بار بلبلا اٹھنا اور فرمانا کہ ''چہ گویم من طاقتے ندارم'' (۱) ایک ایسے دردناک پیرایہ میں ان حالات کو بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بھائیوں میں مودت واخلاص کے کیسے مراسم تھے۔

چاروں صاحبزادوں کی وفات میں عکسی ترتیب

یہ عجیب بات ہے کہ ان چار بھائیوں کی وفات عجیب ترتیب سے ہوئی شاہ عبدالعزیزؒ ہی سے قول جامع ملفوظات نے یہ نقل کیا ہے کہ:

''ترتیب منعکسہ در رحلت برادران واقع شد، یعنی اول مولوی عبدالغنی کہ خورد تریں ہمہ ہا بودند، بعد ازاں مولوی عبدالقادر، از وشان بعد مولوی رفیع الدین کلاں سال، از وشاں ہستم ، باری ماست''۔

''الٹی ترتیب بھائیوں کی وفات میں واقع ہوئی اول مولوی عبدالغنی کہ سب سے چھوٹے تھے اس کے بعد مولوی عبدالقادر اور ان کے بعد مولوی رفیع الدین، سب سے بڑا میں ہوں، اب میری باری ہے''۔

(۱) کیا کہوں، (بھائی کی وفات کے صدمہ کی وجہ سے) کچھ کہنے کی طاقت ہی نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں حضرت شاہ ولی اللہ کے ان چاروں صاحبزادوں نے بڑے باپ کے بیٹے ہونے کی شان کو بوجہ کمال آخر عمر تک باقی رکھا، شاہ عبدالغنی چھوٹے صاحب نے تو کم عمر پائی لیکن ان کی تلافی قدرت نے ان کے ''نجل رشید'' حضرت شہیدؒ سے فرمادی، ناظرین ''الفرقان'' جن کے حالات سے شہید نمبر کے ذریعے سے واقف ہو چکے ہیں اور یوں بھی علم دین کے دائرہ کا ایسا کون ہے جو ان سے اور ان کے محیر العقول ومدہش کارناموں سے تھوڑا بہت واقف نہیں ہے، شاہ عبدالقادرؒ نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ اگرچہ عزلت میں گزار دیا لیکن صرف امیر شاہ صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ایک صاحبزادی تھیں، کل جائداد زندگی ہی میں انہی کی صاحبزادی اور دوسرے بھائیوں پر تقسیم فرما کر اکبرآبادی مسجد کی ایک سہ دری میں اپنی زندگی بسر کردی، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ دونوں مقابل ہوئے جن میں شاہ عبدالعزیز کی کوئی نرینہ اولاد نہ ہوئی، صرف تین صاحبزادیاں تھیں اور شاہ رفیع الدین کے چار لڑکے مولوی موسی، مولوی عیسی، مولوی مخصوص اللہ مولوی حسن جان ہوئے، ان میں سے مولوی عیسی صاحب کی شادی شاہ عبدالعزیز کی ایک صاحبزادی سے ہوئی اور بقیہ صاحبزادیوں میں سے ایک مولوی افضل صاحب اور دوسری مشہور رفیق شہید مولانا عبدالحی الخطیب المجاہد سے ہوئی تھی، مولوی افضل ہی کے دو صاحبزادے یعنی شاہ محمد اسحاقؒ وشاہ محمد یعقوبؒ ولی اللہی خاندان کے آخری یادگار دلی میں رہ گئے تھے جب مسلمانوں کی دلی ہونے کی خصوصیت کو قطعی طور پر کھو چکی تو دونوں بھائی ۱۲۵۰ھ میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ حجاز ہجرت کر گئے اور اسی سرزمین پاک میں ہندوستان کے یہ علمی خزانے مدفون ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے مدرسہ کا حال اور غدر میں اس کی بربادی

شاہ ولی اللہؒ کے مدرسہ کا کچھ حال پہلے گزر چکا ہے، آخر میں چاہتا ہوں کہ دلی ہی کے ایک چشم دید گواہ کے بیان کو جو اس خاندان اور اس مدرسہ کے متعلق ہے، درج کر کے اس

مقالہ کو ختم کردوں گا کہ إن فی ذلك لعبرة.

قفا نبك من ذکری حبیب ومنزل

دلی کے اس عجیب وغریب علمی ودینی خاندان اور اس خاندان کے دارالعلوم کا آخری انجام وہی ہوا جو ہر اس چیز کا ہے جس کا تعلق اس عبوری دور کی ابتدائی زندگی سے ہے، دہلی کے آثار اور مقامات کے ذاتی تجربہ کار مولوی بشیر احمد مرحوم اپنی کتاب ''دارالحکومت دہلی'' ہیں میں لکھتے ہیں:

''جب شاہ (شاہ ولی اللہ) کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق صاحب نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمہ لی، ۱۲۵۶ھ میں آپ نے ہجرت کی تو مولانا مخصوص اللہ صاحب اور مولانا موسیٰ صاحب خلف مولانا رفیع الدین صاحب اس کی نگرانی فرمانے لگے، ان حضرات نے بھی ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا تو صرف مولانا محمد موسیٰ کے ایک صاحبزادے میاں عبدالسلام صاحب بہت صغیر السن رہے اور ایک صاحبزادی رہ گئیں، خاندان بھر میں کوئی ایسا نہ تھا جو عبدالسلام کو لکھاتا پڑھاتا، الغرض یہ سلسلہ جو کئی پشت سے اس خاندان میں جاری تھا بند ہوگیا، غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے، گرادئے گئے، کڑی تختے تک لوگ اٹھالے گئے، ''خانہ خالی را دیومی گیرد''، ایک شریف گردی تھی کہ الٰہی توبہ! جس کی لاٹھی اس کی بھینس، جس کا جس پر قابو چلا قابض ہوگیا، اب متفرق لوگوں کے مکان اس جگہ بن گئے ہیں، مگر محلّہ شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے، اس خاندان میں سوائے ایک آدھ خاتون عصمت کے اور کوئی نام لیوا اور پانی دینے والا نہ رہا''۔

مولوی بشیر مرحوم نے اس سے بھی زیادہ دردناک واقعہ ایک دوسری جگہ یہ درج کیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اپنی زندگی میں اپنے نواسوں مولانا محمد اسحٰق اور مولانا یعقوب کو جو مکان بنوا کر دیئے تھے اور شاہ اسحٰق صاحبؒ نے ان میں کچھ دن درس دیا تھا،

''اب اس مدرسہ میں چھوٹے چھوٹے مکانات بن گئے ہیں، چوہان کسان وغیرہ لوگ رہتے ہیں، یہیں ایک چھوٹی سی مسجد آپ ہی کے نام سے مشہور ہے جس میں آپ نماز پڑھتے تھے''۔

ولی اللّٰہی دارالعلوم پر مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ

اب چونکہ یہ کل جائیداد رائے بہادر لالہ شیو پرشاد صاحب کی ہے، اس لئے مولوی بشیر مرحوم نے اسکے بعد جو فقرہ لکھا ہے قلم اس کے لکھنے سے کانپتا ہے، لکھتے ہیں کہ:

''اس لئے اس گلی پر مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگادیا گیا ہے'' (۱)۔

مسلمانان ہند کے لئے عموماً اور مسلمانان دہلی کے لئے خصوصاً اگرچہ یہ ایک شرمناک حادثہ ہے کہ ''مدرسہ مولانا محمد اسحٰق'' پر ''مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس'' کا تختہ لگادیا گیا ہے، لیکن خدا کی وہ بات کہ اللہ کی راہ میں مرنے والے مرتے نہیں ''بل أحياء ولكن لا تشعرون'' اب بھی پوری ہورہی ہے، شمال سے جنوب تک آج ہندوستان میں حدیث اور دار الحدیث کا جو چرچا پھیلا ہوا ہے کوئی شبہ نہیں کہ ان ہی چند عشق بازوں کی عشق بازی کا نتیجہ ہے، ولنعم ما قیل ؎

از صدائے سخن عشق ندیدم خوش تر　　یادگارے کہ دریں گنبد دوار بماند

شاہ عبدالقادر کی سکونت گاہ اکبر آبادی مسجد

حضرت شاہ مولانا عبدالقادر کی سکونت گاہ کے سلسلہ میں اکبرآبادی مسجد کا بھی ذکر آیا تھا، جی چاہتا ہے کہ اس کا حال بھی کچھ اس کتاب سے اخذ کرکے آخر میں درج کردوں، انہی مولوی بشیر مرحوم کا بیان ہے کہ:

''یہ مسجد فیض بنیاد اعزاز النساء بیگم محل شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۶۰ھ مطابق ۲۴ جلوس میں بنائی ہے، ان بیگم کا خطاب اکبرآبادی محل تھا اسی سبب سے یہ مسجد بھی اکبرآبادی مشہور ہوگئی، اس مسجد کے تین گنبد اور سات در ہیں مسجد کی عمارت ۶۳ گز طول میں اور سترہ گز عرض میں نری سنگ سرخ کی، اور اس کا پیش طاق سنگ مرمر کا پرچین کار ہے، اور اس کے آگے ایک چبوترہ ۶۳ گز طول ستاون گز عرض اور تین گز اونچا اس پر سنگ سرخ کا کٹہرا لگا ہوا ہے، اور اس کے آگے ایک حوض ۱۲×۱۲ گز کا چشمہ آفتاب وماہتاب پر شرف لے جاتا ہے اور نہر کا پانی

(۱) ج ۲ ص ۱۶۷

اس میں آتا ہے..........اس کے گرد حجرے بنے ہوئے ہیں،۱۵۴×۱۰۴ گز، اور ہر حجرے کے آگے ایک ایوان ہے اور اس کے سامنے سرتا سر چار گز عرض کا چبوترہ اور اس مسجد کے دو مینار بلندم، منجملہ ان کے شمالی مینار بجلی کے صدمے سے ٹوٹ گئی ہے''۔

معلوم نہیں مولوی بشیر مرحوم نے یہ عبارت کس کتاب سے نقل کی ہے غالباً ''آثار الصنادید'' سید احمد خاں سے ماخوذ ہے، اس لئے کہ خود مولوی بشیر مرحوم کے زمانہ میں اس مسجد کا جو حال ہے اس کے متعلق وہی رقمطراز ہیں:

''فیض بازار ہی میں یہ مسجد تھی جو غدر کے بعد ڈھایا ڈھوئی کی نذر ہوئی''۔

اور اب اس جلے ہوئے ''دل'' کو کس خاک میں ڈھونڈنا چاہیے فرماتے ہیں:

''محل وقوع اس کا موجودہ ایڈورڈ پارک ہے''۔

آگے لکھتے ہیں:

''جس وقت اس کی زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں کے زمین میں مدفون تھیں ویسے ہی ڈھک دی گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خانہ خدا اور یہ بے نظیر عمارت نظروں سے پوشیدہ ہوگئی''۔

فإنا لله وإنا إليه راجعون.

شاید کہنے والے نے اسی کے متعلق کہا تھا ؎

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو اب خاک جستجو کیا ہے

اس کی تکمیل رمضان المبارک ۱۳۵۹ ہجری کو ہوئی۔

العبد الکئیب الأمهن الفانی السیدمناظر احسن الکیلانی، غفرالله له ولمن رباه

☆☆☆

کتابیات مصنف

۱	مآثر الأمراء	فارسی
۲	تاریخ (وقائع خافی خان	فارسی
۳	اخلاقیات (اتھکس)	اُردو
۴	نجوم السماء	عربی
۵	تاریخ برہانپور	اُردو
۶	محمد بن عبدالوہاب	اُردو
۷	انفاس العارفین	فارسی
۸	سیر المتاخرین	فارسی
۹	حیات طیبہ	اُردو
۱۰	فیوض الحرمین	عربی
۱۱	خزانۂ عامرہ	فارسی
۱۲	تفہیمات الٰہیہ	فارسی وعربی
۱۳	وصیت نامہ	فارسی
۱۴	حیات ولی	اُردو
۱۵	ملفوظات	فارسی
۱۶	واقعات دارالحکومت	اُردو
۱۷	الانصاف في بيان سبب الاختلاف	عربی
۱۸	مفتاح كنوز السنة	عربی
۱۹	اليانع الجنى في أسانيد الشيخ عبدالغنى	عربی
۲۰	امیرالروایات	اُردو